ریاستی اداروں کے مابین ہم آہنگی کا فروغ ... دورِ حاضر کا تقاضا ۱۱

اپریل ۲۰۱۸ء

اُردو ڈائجسٹ

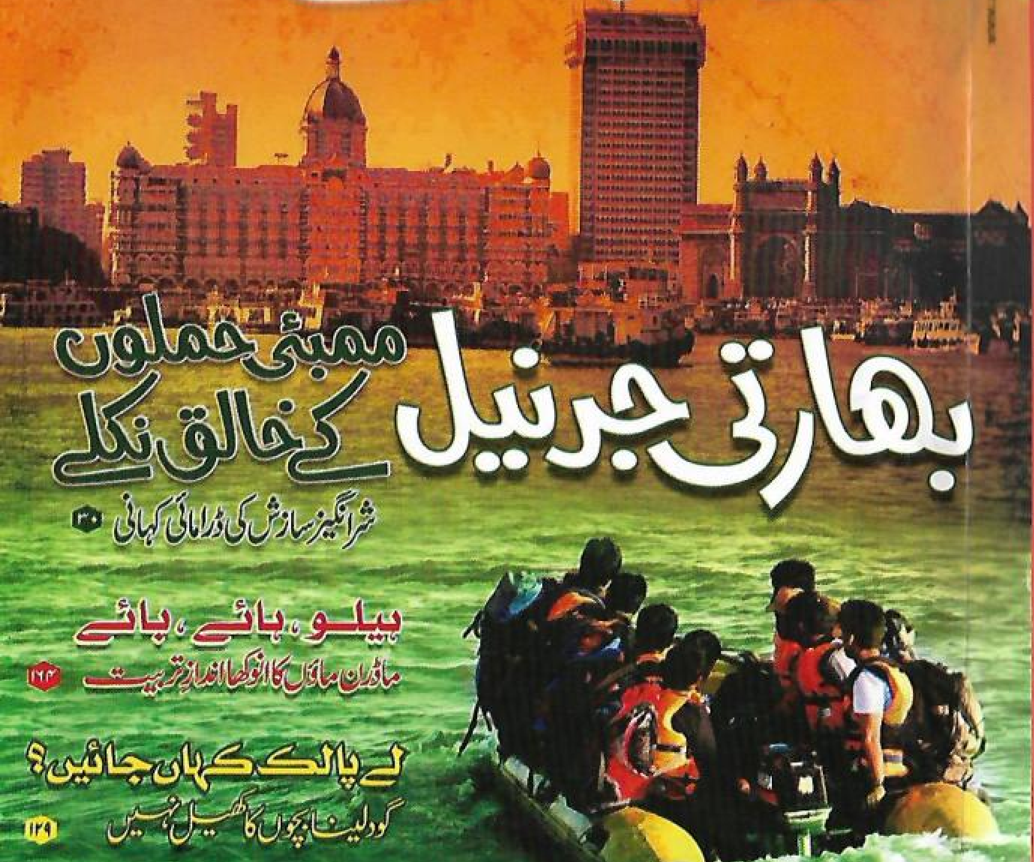

بھارتی جرنیل ممبئی حملوں کے خالق نکلے

شرانگیز سازش کی ڈرامائی کہانی ۳۰

ہیلو، ہائے، بائے

ماڈرن ماؤں کا انوکھا اندازِ تربیت ۱۶۴

لے پالک کہاں جائیں؟

گود لینا بچوں کا کھیل نہیں ۱۲۹

معرکہ بڈھ بیر کا ہیرو

شجاعت و دلیری کی جب نئی تاریخ رقم ہوئی ۱۵۳

اطالوی ہمارے بھائی ہیں

اٹلی کا دلچسپ و منفرد سفرنامہ ۹۰

ممتاز بینکر اور عالمی سیاح مقصود چغتائی

کی منفرد باعتماد... اور عملی معلومات پر مبنی نئی کتابیں شائع ہوگئی ہیں۔
بینک کے مروجہ قوانین اور سہولتوں سے فائدہ اٹھائیں
امپورٹ ایکسپورٹ اور قرضہ جات کی سہولیات
قیمتی زرمبادلہ سے لاکھوں کیسے کمائیں؟

بینکنگ گائیڈ اصل قیمت 1000 رعایتی قیمت 670 رعایت 330

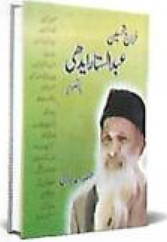

سابق وزیراعظم میاں محمد نواز شریف، میاں شہباز شریف، عمران خان، سراج الحق،
کرکٹر جاوید میانداد کی دیگر اہم شخصیات کے تاثرات پہ بنی حیرت انگیز اور فکر انگیز

خراج تحسین عبدالستار ایدھی باتصویر

اصل قیمت 2000 رعایتی قیمت 1340 رعایت 660

اس کتاب کا منافع عبدالستار ایدھی ٹرسٹ کو جائے گا

	ماہنامہ صدائے پاکستان کے خصوصی نمبر	اصل قیمت/ہدیہ	رعایتی قیمت/ہدیہ	رعایت
1	گرمیوں کی چھٹیوں میں کہاں جائیں؟ (شمالی علاقہ جات)	200	134	66
2	قرضہ لیں اور کاروبار شروع کریں (بینک کے مروجہ قوانین)	200	134	66
3	ایکسپورٹ کریں اور آمدنی بڑھائیں (قیمتی زرمبادلہ کمائیں)	200	134	66
4	امریکی ویزا کیسے حاصل کریں؟ (ڈونلڈ ٹرمپ پالیسیاں)	200	134	66
	دلچسپ اور معلوماتی نئی کتب انتہائی کم قیمت پر حاصل کریں			
5	چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا (حصول ویزا، امیگریشن قوانین) از مقصود چغتائی	500	335	165
6	غیور قبائل پر مبنی نوکنڈی۔ بلوچستان کا اہم حصہ از عبدالباسط حسن زئی	200	134	66
7	سکاؤٹ بچوں کی بائیک اور اصول ہائیکنگ از مقصود چغتائی	200	134	66
8	سکاؤٹاں دا اوکھا پینڈا (پنجابی) از مقصود چغتائی	200	134	66
9	The Scouts Hike & Scouts Principles ایضاً	200	134	66
10	بوسنیا آوارہ گرد کی نظر سے از محمد زوہیب صدیقی	400	268	132
11	تفسیر قرآن حکیم پارہ ۱۳، ۱۴، ۱۵ از ممتاز سکالر ڈاکٹر غلام مرتضےٰ	900	600	300
			کل رعایت	1815

محدود اسٹاک ہے۔ ابھی رابطہ کریں اور گھر بیٹھے منگوائیں

ملنے کا پتا: ولید پبلشرز 394 بلاک G/4 ایم اے جوہر ٹاؤن، لاہور
فون نمبر: 0092-321-4806800 / 0333-4254394

اللہ کا قرآن

پاکی ہے اسے جو راتوں رات اپنے بندے کو لے گیا مسجد حرام سے مسجد اقصا تک جس کے گرداگرد ہم نے برکت رکھی کہ ہم اسے اپنی عظیم نشانیاں دکھائیں بیشک وہ سنتا دیکھتا ہے۔ (بنی اسرآءیل:۱)

پھر وہ قریب ہوا، اور قریب ہوا۔ یہاں تک کہ صرف دو کمانوں کے برابر بلکہ اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا۔ پس وحی کی اللہ نے اپنے (محبوبؐ) بندے کی طرف جو وحی کی۔ نہ جھٹلایا دل نے جو دیکھا (چشم مصطفی نے)۔ کیا تم جھگڑتے ہو ان سے اس پر جو انھوں نے دیکھا اور انھوں نے تو اسے دوبارہ بھی دیکھا۔ سدرۃ المنتہی کے پاس۔ (النجم:۸ تا ۱۴)

رسول اللہ ﷺ کا فرمان

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے رب کو دو مرتبہ دیکھا ایک مرتبہ سر کی آنکھوں سے اور دوسری مرتبہ دل کی آنکھوں سے۔
(المعجم الکبیر، المعجم الاوسط، المواھب اللدنیہ، نشر الطیب)

حضرت جابر بن عبداللہؓ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ سے سنا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب قریش نے میری (معراج کی) تکذیب کی اس وقت میں حجر اسود کے پاس تھا۔ پس اللہ تعالی نے بیت المقدس میری نظروں میں عیاں کر دیا اور میں اسے دیکھ دیکھ کر اس کی تمام نشانیاں قریش کو بتانے لگا۔
(صحیح البخاری، جامع الترمذی، صحیح المسلم، مسند احمد بن حنبل)

اُردو ڈائجسٹ

اپریل 2018ء
رجب المرجب 1439ھ
جلد نمبر 58 شمارہ نمبر 04

urdudigest.pk www.urdudigest.pk

صدرِ مجلس: ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
مدیرِ اعلیٰ: الطاف حسن قریشی
ایگزیکٹو ایڈیٹر: طیب اعجاز قریشی
ڈپٹی ایڈیٹر: سیّد عاصم محمود
سب ایڈیٹر: عافیہ مقبول جہانگیر
مجلسِ تحریر: ڈاکٹر آصف محمود جاہ، سلمیٰ اعوان
مہتممِ طباعت: فاروق اعجاز قریشی
انچارج کمپیوٹیکیشن: افنان کامران قریشی
ڈیزائنر و کمپوزر: کاشف شہزاد، فیصل ایوب

مارکیٹنگ

ڈائریکٹر: ذکی اعجاز قریشی 0300-8460093

اشتہارات

advertisement@urdudigest.pk
مینیجر ایڈورٹائزمنٹ: 0320-4437564
لاہور: ندیم حامد 0300-4242620

سالانہ خریداری 560 روپے کی بچت کے ساتھ

خریداری کے لیے رابطہ subscription@urdudigest.pk
فون: +92-42-35290707
پاکستان 1560 کے بجائے 1000 روپے میں
بیرون ملک 100 امریکی ڈالر
اردو ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کیجیے
اندرون و بیرون ملک کے خریدار اپنی رقم بذریعہ بینک ڈرافٹ
درج ذیل اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں

URDU DIGEST Current A/C No.
PK34 BPUN 6010 0527 0140 0011
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore.)
Branch Code No. 110

ادارتی آفس

اپنی تحریریں اس پتے پر بھیجیں

325, G-III جوہر ٹاؤن، لاہور
فون نمبر: +92-42-35290738 ◆ فیکس: +92-42-35290731
ای میل: editor@urdudigest.pk

قیمت: 100 روپے

طابع و ناشر الطاف حسن قریشی نے اردو ڈائجسٹ پرنٹرز 24- سرکلر روڈ سے چھپوا کر حسن آباد لاہور سے شائع کیا

ایگزیکٹو ایڈیٹر نوٹ

جہانِ شب ہے دھواں صبحِ انقلاب بنو
جلا دو تختِ بتاں، دستِ احتساب بنو

ہمارے سیکورٹی اداروں کی شبانہ روز سعی و جستجو سے وطن عزیز میں دہشت گردی کے واقعات خاطر خواہ کم ہو چکے۔ امن و امان بحال کرنے کے لیے ان کی سائنسی انداز میں کی گئی کوششیں قابل ستائش ہیں۔ آج درہ خیبر سے لے کر کراچی تک کوئی ملکی یا غیر ملکی کسی بھی ہوٹل میں ٹھہرے، تو اس کا شناختی کارڈ یا پاسپورٹ اسکین ہوتا ہے پھر کمپیوٹر میں سیکورٹی اداروں کے ڈیٹا بینک سے منسلک ایک خصوصی سافٹ ویئر ان شناختی دستاویزات کے کوائف کا جائزہ لیتا ہے۔ اگر معمولی سی مشکوک بات بھی ظاہر ہو، تو فورس فوراً اس شخص کے سر پر پہنچ جاتی ہے۔ چھان بین کے اس جدید نظام کی بدولت کئی دہشت گرد اور جرائم پیشہ افراد گرفتار ہو چکے۔

آپریشن ردالفساد کے ذریعے بھی ہر شہر میں گلی محلوں کی سطح پر شہریوں کی جانچ پڑتال جاری ہے۔ سیکورٹی ادارے ہر شہری کے کوائف نوٹ کر رہے ہیں۔ اس منظم کارروائی سے بھی دہشت گردوں اور مجرموں کے گروہ پکڑے جا چکے۔ غرض ہماری سیکورٹی فورسز مستحکم و خوشحال پاکستان کی بنیاد رکھ رہی ہیں۔ یہ خوش آئند تبدیلی ہے اور سنہرے مستقبل کا پیغام دیتی امید کی علامت بھی۔

یہ بات مگر باعث تشویش ہے کہ پاکستان میں قانون کی حکمرانی مضبوط نہیں ہو پائی۔ اہم وجہ یہ کہ آج تک کسی طاقتور اور بااثر مجرم کو سزا نہیں مل سکی۔ جب بھی کوئی طاقتور ہستی احتساب کے شکنجے میں کسے، تو وہ دیانتداری سے اپنا دفاع کرنے کے بجائے رونا روتی کہ فلاں فلاں بھی تو قانون کی گرفت سے آزاد گھومتے پھرتے ہیں۔ الزام تراشی کا یہ گھٹیا عمل افراد تک محدود نہیں رہا، احتساب کے چنگل سے بچنے کی خاطر ہر سرکاری ادارہ دوسرے اداروں کو فرائض یاد دلانے کی فکر میں گھلتا، اصلاحات نافذ کرنے پر زور دیتا اور دوسروں پر کیچڑ اُچھالتا دکھائی دیتا۔ اس روش سے نہ صرف عمل احتساب میں رکاوٹیں پیدا ہوتیں بلکہ آئین بھی پامال ہونے لگا۔

ایک اور المیہ یہ کہ مروجہ نظام میں ملک و قوم کی خدمت کا جذبہ رکھنے والے باصلاحیت اور دیانتدار افراد پنپ نہ پاتے، مثلاً کوئی صنعت کار یا سرمایہ کار پورے ٹیکس دے اور ملکی قوانین کی پاسداری کرے، تو کرپٹ سسٹم اس کا مخالف بن جاتا۔ وہ ہر ایماندار اور قانون پسند شہری کو اپنے لیے خطرہ سمجھتا۔

فرسودہ نظام کے باعث ہی ملکی ترقی و خوشحالی کے ضامن ایسے کئی منصوبے برسوں زیر تکمیل رہتے جو دیگر ممالک میں محض چند ماہ میں مکمل ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے پاکستانی سرمایہ کار مجبوراً بیرونی ممالک جا کر منصوبے بنانے لگے۔ غیر ملکی سرمایہ کار بھی بددل ہو کر دوسرے ملکوں کا رخ کرنے لگے جہاں انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔ انھیں پرکشش ترغیبات و مراعات دی جاتیں۔ پوری سرکاری مشینری ان کے منصوبے مکمل کرنے پر جت جاتی کہ یوں مواقع روزگار جنم لیتے ہیں۔

ارضِ پاک میں عموماً وہی صنعت کار اور سرمایہ کار پھلتے پھولتے اور باعث تکریم ٹھہرتے جو ملکی قوانین پر عمل نہ کریں، بجلی، گیس و ٹیکس چوری کر کے کاروبار کو فروغ دیں، پیسا کمانے کے لیے انسانی جان کی بھی پروا نہ کریں، رشوت کے پہیے لگا کر اپنی فائلیں منظور کروائیں اور پیسا باہر لے جائیں۔

جو سرکاری افسر اپنے فرائض دیانتداری سے انجام دے اور میرٹ پر فیصلے کرے، اُسے "کھڈے لائن" لگا دیا جاتا۔ اس کی واحد ذمہ داری وزیراعظم یا وزیر اعلیٰ کو خوش کرنا اور بلاچوں و چرا احکامات بجالانا ہوتا۔ بلدیہ سے لے کر صوبائی و قومی اسمبلیوں اور سینیٹ کے ہزارہا ارکان اپنی اصل ذمے داریاں نبھانے کے بجائے چند سیاسی غیر سنجیدہ اور نااہل افراد کے غیر تعمیری اور منفی ایجنڈے کی تکمیل میں محو رہتے۔

ایک رپورٹ کی رو سے اعلیٰ ماتحت عدالتوں میں "اٹھارہ لاکھ" سے زائد مقدمات زیر التواء ہیں۔ اس افسوس ناک صورت حال سے عیاں ہے کہ ہمارا عدالتی نظام بھی مظلوم کو فوری انصاف نہیں دے پایا۔ اس کو بھی "اوور ہالنگ" کی ضرورت تھی۔

یہ تھے وہ دگرگوں حالات جب چیف جسٹس متحرک ہوئے تاکہ ملکی نظام سے چمٹی خرابیاں دور ہو سکیں۔ عمدہ انتظام (گڈ گورننس) کی بحالی، سیاست و حکومت میں پھیلی کرپشن کے خاتمے اور طاقتور کرپٹ شخصیات کو کٹہرے میں لانے کے لیے انھوں نے دلیرانہ فیصلے کیے تو کرپٹ نظام کی محافظ قوتیں ان کی مخالفت کرنے لگیں مگر مظلوم عوام نے سپریم کورٹ کی مساعی جمیلہ کو سراہا اور اُسے اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگے۔

اس نازک صورت حال میں عملِ احتساب کو تقویت پہنچانے کی خاطر سیکورٹی ادارے عدالت عالیہ کے پشتی بان بن گئے۔ باجوہ ڈاکٹرائن نے بھی عمل احتساب اور عدلیہ مخالف قوتوں کو سخت الفاظ میں پیغام دیا کہ ان کے دن گنے جا چکے۔

اواخر مارچ میں قوم کو یہ خوش کن خبر ملی کہ وزیراعظم اور چیف جسٹس کی طویل ملاقات ہوئی۔ وزیراعظم نے یقین دلایا کہ عدلیہ کو تمام تر وسائل مہیا کیے جائیں تاکہ فوری انصاف عوام کی دہلیز تک پہنچ سکے۔ چیف جسٹس نے بھی اعادہ کیا کہ احتساب کا عمل پوری قوت سے جاری رہے گا۔

ہماری تجویز ہے کہ احتساب کا عمل بھرپور اور کامل طور پر مکمل کرنے کے لیے تمام حکومتی ادارے مل جل کر کام کریں اور ایک دوسرے سے قریبی رابطہ رکھیں۔ یوں جس طرح سیکورٹی فورسز نے دہشت گردی کو جڑ سے اکھاڑ ڈالا، وہ بھی اپنے اندر پھیلی کرپشن، اقربا پروری، سرخ فیتہ از قسم کی خرابیاں ملیامیٹ کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارا حامی و ناصر ہو۔

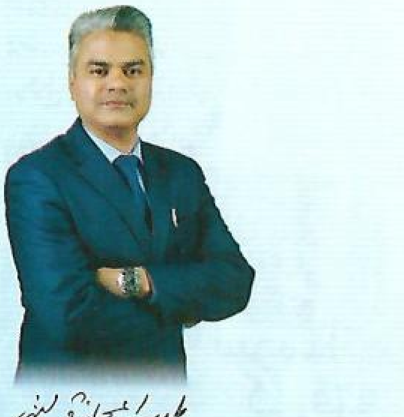

طیب اعجاز قریشی

پڑھیے، پڑھائیے، سیکھیے اور لطف اُٹھائیے

فہرست

کچھ اپنی زبان میں

شفاف انتخابات کا سہانا خواب...... پُرامن انتقالِ اقتدار یقینی بنانا ہوگا	الطاف حسن قریشی	۰۹

قومی سیمینار

ریاستی اداروں کے مابین ہم آہنگی کا فروغ...... پائنا کے زیرِ اہتمام ایک فکرانگیز سیمینار	الطاف حسن قریشی	۱۱

دین دنیا

رازدارِ رسولؐ...... فاتح ہمدان کہلانے والے عظیم صحابی کی ایمان افروز داستان	اُسامہ عبدالقادر	۲۹
ایماندار تاجر......کھوئی راہ روشن کردینے والے سبق آموز اسلامی واقعات	پروفیسر خالد پرویز	۷۴

انکشافات

ممبئی حملے بھارت نے کروائے......اُردو میں اپنی نوعیت کی پہلی تحقیق	عاصم محمود	۳۰

بین الاقوامی معلومات

شاہ سے گدا تک......کوئی عہدہ نہ ہونے کے باوجود وہ لیبیا کا دوسرا بااثر ترین انسان تھا	عافیہ مقبول جہانگیر	۶۳

فکاہیہ/مزاح

پکائی تھی کھیر......ایک نوجوان کے خوابوں کا محل جب دھڑام سے گر پڑا	آمنہ اقبال	۶۵
حجامت قبل از گرفتاری......کچھ سزائیں ایسی بھی ہیں جو ملتی ہیں خطا سے پہلے	ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی	۸۸
اللہ کے بعد اس سے ڈریئے......جو لوگ اسے تعظیم نہ دیں، ان کا انجام اچھا نہیں ہوتا	سلمان بٹ	۱۳۹

خصوصی تبصرہ

جو صورت نظر آئی......خاکوں کی ایک دلنشیں اور بامقصد کتاب	عاصم محمود	۶۲

معاشرتی کردار/خاکہ

میرا دوست پلمبر......زندگی بھر مشکلات سے نبرد آزما رہنے والے مزدور کا قصہ	صادق بشیر	۷۱
اُردو ادب کا چھلاوہ......ممتاز مزاح نگار کی دلچسپ و سبق آموز یادیں	شاہد احمد دہلوی	۱۰۴

...گفتہ

...یب جالب بنام انور مقصود......عالمِ بالا سے پاکستانی قوم کے نام چشم کشا خط	انور مقصود	۷۹

...ب و صحت

...ے میرے جوڑ......قدرتی غذاؤں کے ذریعے موذی بیماری سے نجات ممکن	بیگم عامر ملک	۸۱
...ن گھٹانے کی قدرتی دوا......انسان کو تندرست رکھنے والا ہرفن مولا مسالا	حکیم سید مجاہد محمود برکاتی	۱۳۶

اُردو ادب

...تالیسویں منزل......امریکا کی بلند و بالا عمارت میں جب دو پاکستانی پھنس گئے	رضیہ بٹ	۸۲

...یر و سیاحت

...طالوی ہمارے بھائی ہیں......ہم وطنوں اور اٹلی کے باسیوں میں حیرت انگیز مماثلت کا تذکرہ	ذکیہ علی بیگ	۹۰
...دیس میں دیسی کھانے......ایک ممتاز اداکارہ نے جب کینیڈا میں دیسی کھانے کھائے	ڈاکٹر ہما میر	۱۴۱
...بابوسر......وادیٔ کاغان کا بلندترین مقام جہاں آپ بار بار جانا چاہیں گے	رانا محمد شاہد	۲۰۳

...یوانیات

...یوانی دنیا کی ماہرِ تعمیرات......اس ننھی مخلوق کی بنائی بستیاں اتفاق کی عمدہ مثال ہیں	محمد خلیل چودھری	۱۰۲

...فسانے/کہانیاں

...وٹے سکے......نئی نسل کو ایک قیمتی درس دیتی پرانے لوگوں کی دلنشیں کتھا	شاکر لطیف	۱۱۳
...ورت کا گھر کون سا؟......ایک سے دوسرے گھر سفر در سفر رہنے والی لڑکی کا ماجرا	رافعہ اعظم	۱۶۷
...ینے کی چٹنی......اولاد کے لیے خود کو سرتاپا بدل لینے والی ماں کا نعم البدل کوئی نہیں	دانیہ صدیقی	۲۲۵
...گھ......اولاد کا فرض ہے کہ وہ والدین کے لیے ٹھنڈی چھاؤں بنیں	ڈاکٹر خلیل مبین	۲۰۹

میری نماز کا وقت ہو گیا......اس سے پہلے کہ کوئی آپ کی نماز ادا کرے | حبیبہ انجم | ۱۴۸

اقبالیات

علامہ اقبالؒ واقعات کے آئینے میں......شاعرِ مشرق کی شخصیت عیاں کرتی تحریر | ڈاکٹر جاوید اقبال | ۱۴۵

شکاریات

زخمی شیر کے تعاقب میں......موت دبے پاؤں آ رہی تھی اور بندوق میں گولی ایک ہی باقی تھی | صبا عمران | ۱۴۹

غیر ملکی ادب

لبِ گور......مستقبل سنوارنے کا حسین سپنا بوڑھے کسان کی جان لے بیٹھا | عروج فاطمہ | ۱۶۱

چوتھی اولاد......تنہائی اور بے رُخی کا شکار ایک بوڑھی خاتون کی دلدوز داستان | ڈاکٹر سیدہ سلمیٰ حسین | ۱۸۴

انوکھا جھانسا......قانون کی نگاہوں میں دھول جھونکنے والے کائیاں کا ماجرا | انجم فاروق ساحلی | ۱۸۷

باغ کا راز......ایک خوش مزاج خاتون کا قصہ جو اچانک غصیلی بن گئی تھی | ابوالفرح ہمایوں | ۱۹۵

لسانیات

رنگ برنگ کہاوتیں......دلچسپ واقعات جنھوں نے کہاوتوں کو جنم دیا | پروفیسر سید مجیب ظفر انوار | ۱۷۴

غیر ملکی شخصیت

''اچھے دن کا اختتام''......وہ گیت جس نے ایک مقروض خاتون کو کروڑ پتی بنا دیا | ڈیل کارنیگی | ۱۷۷

آپ بیتی

میرے بچپن کے دن......معصومیت اور خوشیوں بھرے دنوں کی پُرلطف یادیں | تحسین گل | ۱۸۲

معاشرت

بلیک فرائی ڈے......معاشرے کے بدلتے رجحانات کی عکاسی کرتی تحریر | ہاجرہ رضا | ۲۰۵

مستقل سلسلے

شاعری......۱۷۰ تبصرہ کتب......۲۱۳ چمنِ خیال......۲۱۷

شفاف انتخابات کا سہانا خواب

موجود قومی اسمبلی کی آئینی مدت ۳۱ مئی ۲۰۱۸ء کو ختم ہو رہی ہے اور اس کے بعد نگراں حکومت کا دور شروع ہو گا۔ یہ امر خوشی کا باعث ہے کہ جمہوریت کا تسلسل قائم ہے اور پُرامن انتقالِ اقتدار کا مرحلہ قریب آن پہنچا ہے۔ اہم اداروں کی طرف سے یقین دہانی کروائی جا رہی ہے کہ بروقت اور شفاف انتخابات کے لیے فُل پروف انتظامات کیے جائیں گے اور جمہوری عمل میں کوئی رخنہ برداشت نہیں کیا جائے گا۔ دستور کے مطابق آزادانہ، دیانت دارانہ اور منصفانہ انتخابات منعقد کروانے کی ذمے داری پاکستان الیکشن کمیشن پر عائد ہوتی ہے جو اب انتظامی اور مالی اعتبار سے پوری طرح آزاد ہے اور وہ خود اپنے قواعد و ضوابط وضع کر سکتا ہے۔ ماضی میں فوج اور عدلیہ جمہوری عمل کو پٹڑی سے اُتارنے کا باعث بنتی رہی ہیں، مگر اس بار اُن کے سربراہوں کی طرف سے جو اعلانات آ رہے ہیں، وہ بڑے حوصلہ افزا اور ایقان افروز ہیں۔ فاضل چیف جسٹس جناب میاں ثاقب نثار کا یہ ارشاد اُمیدوں کے چراغ روشن کر گیا ہے کہ ضرورت پڑنے پر بیورو کریٹس کے تبادلے بھی کر دیے جائیں گے کہ وہ انتخابات پر اثر انداز نہ ہو سکیں۔ اِسی طرح ہمارے سپہ سالار جنرل قمر جاوید باجوہ کی یہ یقین دہانی مژدہ بہار سے کسی طرح کم نہیں کہ انتخابات پوری طرح شفاف ہوں گے۔

ان بیانات سے عوام نے شفاف انتخابات کا سہانا خواب دیکھنا شروع کر دیا ہے، مگر ان کے ذہنوں میں بعض واقعات اور اقدامات سے وسوسے بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ مردم شماری بڑی تاخیر سے سپریم کورٹ کے حکم پر کروائی گئی اور ایک آئینی ترمیم کے ذریعے عبوری نتائج کی بنیاد پر حلقہ بندیوں کے لیے جواز پیدا کیا گیا۔ ان عبوری نتائج کے مطابق پنجاب کی نشستیں کم ہو گئیں جبکہ بلوچستان، خیبر پختونخواہ اور اسلام آباد کی نشستیں زیادہ ہو گئیں۔ ہمارے قابلِ قدر الیکشن کمیشن نے مردم شماری کے نتائج کے مطابق ردو بدل کرنے کے بجائے پورا نقشہ ہی تبدیل کر ڈالا۔ پہلے ملکی حلقہ بندی پشاور سے شروع ہوتی تھی جبکہ مجوزہ حلقہ بندیوں کا آغاز چترال اور اختتام لسبیلہ پر ہوا۔ اس کے نتیجے میں حلقہ بندیوں کی پوری بساط الٹ پلٹ ہو گئی۔ اخباری اطلاعات کی رُو سے خیبر پختونخواہ کے وزیر اعلیٰ جناب پرویز خٹک کا حلقہ سب سے چھوٹا اور بنوں کا حلقہ سب سے بڑا بن گیا ہے۔ تمام سیاسی جماعتیں شکوہ سنج ہیں کہ نئی حلقہ بندیاں انصاف کے تقاضے پورے نہیں کرتیں اور اس سے گمبھیر مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ اصل تشویش کی بات یہ ہے کہ پارلیمانی کمیٹی اور الیکشن کمیشن ایک دوسرے کے مدِمقابل آن کھڑے ہوئے ہیں اور ایک بے یقینی کی سی کیفیت پیدا ہو رہی ہے۔ یہ مرحلہ اگر خوش اسلوبی اور دور بینی سے طے نہ کیا گیا، تو انتخابات کی شفافیت پر حرف آئے گا جو بہت بڑے تنازع کو جنم دے سکتا ہے۔

گہری تشویش کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ سیاسی جماعتوں کے مابین بداعتمادی اس انتہا کو پہنچ گئی ہے کہ وہ ایک دوسرے کو زمیں بوس کر دینے کے لیے جو حربے اور زبان استعمال کر رہی ہیں ان کی موجودگی میں نگراں حکومتوں پر اتفاقِ رائے بظاہر مشکل دکھائی دیتا ہے۔ اگر حکومت اور اپوزیشن نگراں حکومتوں پر اتفاق کرنے میں ناکام رہتی ہیں، تو دونوں طرف سے تین تین نام الیکشن کمیشن کو بھجوانا ایک آئینی ذمے داری ہوگی۔ بداعتمادی کی اس زہرناک فضا میں سیاسی قائدین الیکشن کمیشن کا فیصلہ ماننے سے بھی انکار کر سکتے ہیں اور ایک تنازع کھڑا ہو سکتا ہے جسے حل کرنے کے لیے سپریم کورٹ کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ ایک ایسے ماحول میں جب عدالتِ عظمیٰ کے فیصلے بھی شدید اختلاف کی زد میں آ رہے ہیں، تو نگراں حکومت کے بارے میں جو فیصلہ سنایا جائے گا، اس پر بحث و تکرار شروع ہو سکتی ہے جبکہ انتخابی عمل دو ماہ کے اندر اندر مکمل کرنا ہوگا۔ سیاسی جماعتیں اگر بروقت انتخابات میں سنجیدہ ہیں، تو انہیں دانش مندی سے حقائق کا سامنا کرنا اور بنیادی معاملات میں اتفاقِ رائے پیدا کرنا ہوگا۔ اس عظیم کام کے لیے غیر معمولی تدبر اور تحمل درکار ہوگا جو اناؤں کی قربانی کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کے لیے حکمران جماعت کو آل پارٹیز کانفرنس کا اہتمام کرنا اور غیر معمولی بردباری کا ثبوت دینا ہوگا۔

بلوچستان اسمبلی میں پچھلے دنوں جو واقعات پیش آئے وہ سینیٹ کے انتخابات پر بھی اثر انداز ہوئے، انھوں نے عام انتخابات کے بارے میں طرح طرح کی بدگمانیوں کو ہوا دی ہے۔ آناً فاناً ایک وزیر اعلیٰ تبدیل کر دیا گیا اور سیاسی طور پر ایک غیر معروف شخص سینیٹ کا چیئرمین منتخب کرا لیا گیا جسے قائم مقام صدرِ مملکت کے فرائض بھی بجا لانا ہوتے ہیں۔ ان واقعات نے اس تاثر کو گہرا کیا کہ غیر سیاسی طاقتیں پس پردہ متحرک ہیں جو اپنی پسند کے مطابق واقعات کی تشکیل چاہتی ہیں۔ احتساب کے نام پر انتخابات سے چند ماہ پہلے سیاسی شخصیتوں کی جو اکھاڑ پچھاڑ کی جا رہی ہے، اس نے شفاف انتخابات پر بڑے بڑے سوال کھڑے کر دیے ہیں۔ سیاسی تجزیہ نگار برملا کہہ رہے ہیں کہ جو سیاسی جماعت عوام کے اندر مقبول ہے، اسے شکست سے دوچار کرنے کے انتظامات کیے جا رہے ہیں۔ ایک طرف ووٹ کے تقدس کی تحریک زور پکڑتی جا رہی ہے اور دوسری طرف سیاست دانوں کی کردار کشی زوروں پر ہے۔ ان حالات میں شفاف اور بروقت انتخابات کا انعقاد جو کبھی ایک سہانا خواب لگتا تھا، اب ایک ڈراؤنے خواب کی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ ہماری قومی قیادت پر لازم آتا ہے کہ وہ خطرے کی سنگینی محسوس کرتے ہوئے بالغ نظری اور خوداعتمادی سے کام لے اور پُرامن انتقالِ اقتدار کو یقینی بنانے کے لیے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لائے۔ ہم تاریخ کے ایک نازک دوراہے پر کھڑے ہیں۔ صحیح قدم اٹھا کر جمہوری اداروں کو ایک ناقابلِ تسخیر طاقت میں تبدیل کر سکتے اور انا کی تنگ نائے میں محصور ہو کر پاکستان کو نہایت کڑی آزمائش سے دوچار کر سکتے ہیں۔

الطاف حسن قریشی

ریاستی اداروں کے مابین ہم آہنگی کا فروغ

پائنا کے زیرِ اہتمام ایک فکر انگیز سیمینار

الطاف حسن قریشی کے قلم سے

پس منظر

۱۳ مئی ۲۰۱۳ء کے انتخابات ہماری تاریخ میں اس لحاظ سے ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں کہ پہلی بار ایک سیاسی جماعت نے دوسری سیاسی جماعت کو پُرامن طریقے سے اقتدار منتقل کیا، لیکن ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ پاکستان تحریکِ انصاف کے چیئرمین عمران خان نے انتخابات میں منظم دھاندلی کا الزام لگایا، چار ماہ سے زائد دارالحکومت اسلام آباد کا گھیراؤ کیے رکھا جس کے سبب حکومتی مشینری مفلوج رہی۔ اس دوران تحریکِ انصاف کے صدر مخدوم جاوید ہاشمی نے اپنی قیادت سے علیحدگی اختیار کرتے ہوئے یہ الزام لگایا کہ وہ حکومت کے خاتمے کے لیے غیر سیاسی عناصر سے ساز باز کر رہی ہے۔ خوش قسمتی سے تمام سیاسی جماعتیں پارلیمنٹ کی پشت پر کھڑی رہیں۔ جوڈیشل کمیشن کی طرف سے بھی یہ فیصلہ آیا کہ تحقیقات میں کسی منظم دھاندلی کا ثبوت نہیں ملا۔ اس پر عمران خان کا ڈراما فلاپ ہو گیا، مگر سیاسی چپقلش جاری ہے جسے سوشل میڈیا آج بھی ہوا دے رہا ہے۔

۲۰۱۶ء میں عالمی سطح پر پاناما آف شور کمپنیوں کا غلغلہ بلند ہوا جس میں سینکڑوں پاکستانیوں کے نام سامنے آئے۔ غلطی سے فہرست میں نواز شریف کا نام بھی شامل تھا جس پر رپورٹ کے مرتبین نے معافی مانگی، لیکن عمران خان اور اُن کے سیاسی ہم نواؤں نے عدالتِ عظمیٰ میں وزیراعظم کو نااہل قرار دینے کے لیے رِٹ دائر کر دی۔ فاضل رجسٹرار نے اسے 'فضول' قرار دے کر واپس کر دیا۔ اس پر خان صاحب نے ۲ نومبر ۲۰۱۶ء سے اسلام آباد لاک ڈاؤن کرنے کا اعلان کر دیا۔ پاکستان کو خوفناک بحران سے بچانے کے لیے فاضل چیف جسٹس انور ظہیر جمالی نے رِٹ کی سماعت کے لیے یکم نومبر ۲۰۱۶ء کی تاریخ مقرر کر دی۔ ابتدائی سماعت میں انہوں نے عندیہ دیا کہ معاملہ لندن کے فلیٹس تک محدود رہے گا۔ ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد معاملات پھیلتے گئے اور معروف طریقے سے ہٹ کر جے آئی ٹی کی تشکیل ہوئی جس میں فوج کی خفیہ ایجنسیوں کے نمائندے بھی شامل کر لیے گئے تھے۔ اس پر قانونی اور سیاسی حلقوں کی طرف سے شکوک وشبہات کا اظہار ہونے لگا اور جب عدالتی فیصلہ پاناما کے بجائے اقامہ کی بنیاد پر سنایا گیا، تو پاکستان کے اندر شدید ردِعمل دیکھنے میں آیا۔ عالمی جرائد نے بھی اس فیصلے کو متنازع قرار دیا۔ نواز شریف نااہل قرار دیے جانے پر منصب سے علیحدہ تو ہو گئے، مگر عوام کے اندر ووٹ کے تقدس کی مہم پر نکل کھڑے ہوئے اور ان کا بیانیہ مقبول ہوتا گیا۔ عدالتِ عظمیٰ نے ایک اور فیصلے کے ذریعے انھیں پارٹی کی صدارت کے لیے بھی نااہل قرار دے دیا اور سیاست دانوں کے لیے نامناسب 'القاب'

بھی استعمال کیے۔ اس کے علاوہ فاضل چیف جسٹس میاں ثاقب نثار اہم عہدوں پر تقرریوں کی بازپرس بھی کرنے لگے اور بعض اصحاب فارغ بھی کر دیے گئے۔ انھوں نے ہسپتالوں کا معائنہ بھی شروع کر دیا، میڈیکل کالجوں کی ہوش ربا فیسوں کے معاملات بھی اٹھائے اور صاف پانی کا بنیادی مسئلہ بھی اٹھایا۔ اس پر معتدل مزاج وزیراعظم شاہد خاقان عباسی نے قومی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ انتظامیہ مفلوج کی جا رہی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ آئندہ پارلیمنٹ کو قانون سازی سے پہلے کسی دوسرے ادارے سے اجازت لینا ہو گی۔ سپریم کورٹ کے ایک فیصلے کے تحت عین اس وقت جب سینیٹ کے انتخابات ہونے والے تھے، نواز شریف کے نامزد کردہ امیدوار کالعدم قرار دے دیے گئے جس سے یہ تاثر قائم ہوا کہ مسلم لیگ نون کو سینیٹ کے انتخابات سے باہر رکھنے کا پروگرام طے پا چکا ہے۔ اس سے قبل بلوچستان میں اچانک مسلم لیگ نون کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ان واقعات سے اداروں کے مابین شدید محاذ آرائی کا تاثر گہرا ہوا۔

سیمینار کی رُوداد

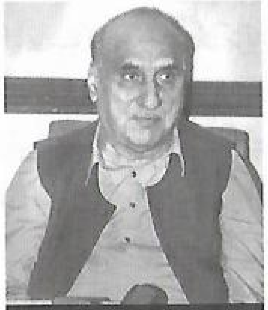

سجاد میر

اس بڑھتی ہوئی بحرانی کیفیت میں پائنا کے زیرِ اہتمام پنجاب یونیورسٹی میں سیمینار کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت معروف ماہرِ قانون اور سیاسی دانش ور جناب ایس ایم ظفر نے فرمائی۔ یونیورسٹی کے اساتذہ، بلند قامت تجزیہ نگاروں، سول سوسائٹی کے دانش مند نمائندوں اور سیاسی جماعتوں سے وابستہ شخصیتوں نے آزادانہ اظہارِ خیال کیا۔ ہمارے نامور اہلِ دانش جناب سجاد میر نے نظامت کے فرائض ادا کیے۔ پائنا کے مرکزی سیکرٹری جناب کامران الطاف نے قرآنی آیات کی تلاوت کی۔

الطاف حسن قریشی، سیکرٹری جنرل پائنا

قریشی صاحب نے صورتِ حال کی سنگینی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہماری تاریخ میں جب کبھی ریاستی اداروں میں محاذ آرائی نے زور پکڑا، پوری قوم کو ہولناک نتائج برداشت کرنا پڑے۔ اس پس منظر میں ہم پر ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ ہر قیمت پر تصادم کا ماحول جلد سے جلد ختم کیا جائے۔ انتہائی تکلیف

ده بات یہ ہے کہ ایک دوسرے کے خلاف جو زبان استعمال کی جا رہی ہے، اِس میں غصے، تضحیک اور اشتعال انگیزی کے پہلو غالب آتے جا رہے ہیں۔ اس ضمن میں مناسب ہوگا کہ سیاسی جماعتیں فوج اور عدلیہ کے ذریعے اقتدار میں آنے کی خواہش رکھنے اور اپنے تنازعات عدالتوں میں لے جانے سے مکمل طور پر اجتناب کریں۔

الطاف حسن قریشی

انھوں نے تجویز دی کہ پندرہ بیس قدآور شخصیتوں پر مشتمل ایک کونسل آف ایلڈرز (بزرگوں کی کونسل) تشکیل دی جائے جو اداروں کے اہم افراد سے ملاقات کر کے سیاسی درجۂ حرارت کم کرنے کے ساتھ ساتھ گرینڈ نیشنل ڈائیلاگ کے لیے راہ ہموار کرے۔ ایک میثاقِ مفاہمت پر دستخط کیے جائیں کہ ہر قیمت پر دستور اور قانون کی پاسداری کی جائے گی اور عدالتی فیصلوں میں تمام قانونی ضابطوں کا پورا پورا خیال رکھنے کے ساتھ ساتھ دورانِ سماعت عزتِ نفس کو ٹھیس پہنچانے والے ریمارکس سے مکمل اجتناب کیا جائے گا۔ عدالتِ عظمیٰ تنازعات حل کرنے کا ایک نہایت مقتدر ادارہ ہے جس کا احترام ہم سب پر واجب ہے۔ فوج بھی ہمارا نہایت قابلِ فخر ادارہ ہے اور پارلیمان عوامی اُمنگوں کی ترجمان ہونے کی حیثیت سے ایک بالادست قوت ہے۔ سیاست دانوں کو بھی اپنے رویوں میں تبدیلی لانا ہوگی اور اپنی جماعتوں میں جمہوری ثقافت کو فروغ دینا ہوگا۔

قریشی صاحب نے کہا کہ میں اس نشست میں بوجھل دل سے آیا ہوں کہ ہمارے ادارے اور ہماری سیاسی جماعتیں آپس میں دست و گریباں رہنے سے ریاست کو ضعف پہنچا رہے ہیں۔ دوسری طرف پاکستان کی دشمن طاقتیں ہمارے گرد گھیرا تنگ کرتی جا رہی ہیں۔ عدلیہ، فوج اور سیاسی حکمرانوں کی تاریخ ہمارے سامنے ہے، اس لیے ہمیں اسے کریدنے کے بجائے ایسے اقدامات کی نشان دہی کرنی چاہیے جو غیر یقینی صورتِ حال کے خاتمے اور اداروں کے مابین ہم آہنگی کی نشوونما میں مددگار ثابت ہوں۔ نفرت کی آگ میں قومیں بھسم ہو جاتی ہیں جبکہ باہمی احترام اور مکالمے سے اختلافات کے پہاڑ بھی مسخر کیے جا سکتے ہیں۔ پائنا کے اوّلین مقاصد میں ایک مہذب، روادار اور ہم آہنگ معاشرے کی تعمیر شامل ہے۔ میں پوری توقع رکھتا ہوں کہ آپ کی تجاویز اور سفارشات اداروں میں بڑھتی ہوئی

آویزش کی تحلیل اور اعتماد کے رشتے مضبوط کرنے میں اہم کردار ادا کریں گی۔ پاکستان کی ریاست مصائب میں گھری ہوئی ہے جو اس بات کی متقاضی ہے کہ تمام ادارے اپنے اپنے دائرے میں رہتے ہوئے اپنی بہترین صلاحیتوں کے ساتھ فرائضِ منصبی ادا کریں۔ اس مقصد کے لیے قدآور شخصیتوں پر مشتمل کونسل کا قیام ایک مفید قدم ثابت ہوگا۔

پروفیسر ڈاکٹر رشید احمد خان

پنجاب یونیورسٹی، شعبۂ سیاسیات کے سابق چیئرمین پروفیسر ڈاکٹر رشید احمد خان کا تاثر یہ تھا کہ بظاہر حالات پریشان کُن ہیں، مگر میں ان سے ہرگز مایوس نہیں، کیونکہ ہم ارتقا کے مراحل سے گزر رہے ہیں جو ہمیں بہتری کی طرف لے جا رہے ہیں۔ ۱۹۵۴ء میں بھی چیف جسٹس محمد منیر کے فیصلے سے ایک ہولناک آئینی اور قانونی بحران پیدا ہوا تھا اور سینکڑوں قانون منسوخ ہو جانے سے افراتفری پھیل گئی تھی، لیکن ہم اس ناگفتہ بہ صورتِ حال سے باہر نکل آنے میں کامیاب رہے تھے۔ اس میں بھی وفاقی عدالت نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ حکومت نے وفاقی عدالت میں ریفرنس بھیجا کہ اس بحران سے نکلنے کا راستہ کیا ہے۔ اس نے فیصلہ دیا کہ ایک نئی دستور ساز اسمبلی تشکیل دی جائے جو منسوخ شدہ قوانین کو بحال کرنے کی مجاز ہوگی اور دستور بھی منظور کرے گی، چنانچہ گورنر جنرل کی منشا کے خلاف ایک دستور ساز اسمبلی صوبائی اسمبلیوں نے منتخب کی اور بحران تحلیل ہوتا گیا۔ آج بھی عدالتِ عظمیٰ کو تدبر، تحمل اور فراخ دلی سے کام لینا ہوگا اور ہمیں پوری توقع ہے کہ وقتی آزمائشوں پر قابو پا لیا جائے گا۔ جناب نواز شریف یہ تحریک چلا رہے ہیں کہ قوم کو اس امر کا حتمی فیصلہ کرنا ہوگا کہ حکمرانی کا حق عوام کو حاصل ہے یا چند جرنیلوں اور جج صاحبان کو۔ یہ کلیدی بیانیہ قراردادِ مقاصد میں طے ہو چکا ہے کہ ریاست کے اختیارات (State Authority) استعمال کرنے کے مجاز صرف عوام کے منتخب نمائندے ہیں۔ نواز شریف کی سوچ کا دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ ہمارے پڑوسیوں کے ساتھ تعلقات بہتر ہونے چاہییں تاکہ ہمارا خطہ معاشی طور پر ترقی کرے اور عوام کا معیارِ زندگی بلند ہو۔ وہ مذاکرات کے ذریعے تنازعات حل کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کے نظریات پر قوم کو سنجیدگی سے غور

کرنا اور روشن مستقبل کے لیے ایک لائحہ عمل ترتیب دینا ہوگا۔ ہمارے اداروں میں جس قدر ہم آہنگی ہوگی، ہم اسی قدر اعتماد کے ساتھ ترقی کی شاہراہ پر آگے بڑھتے جائیں گے۔ مجھے اُمید ہے کہ تمام اسٹیک ہولڈرز جلدی اس حقیقت کا ادراک اور شعور حاصل کرلیں گے۔

جناب احسان وائیں

اے این پی کے مرکزی راہنما اور قانون دان جناب احسان وائیں نے پروفیسر صاحب کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ ۱۹۵۴ء میں جو حادثہ پیش آیا تھا، اس کی قوم کو بڑی قیمت ادا کرنا پڑی تھی۔ اسی حادثے کے بعد مارشل لا نازل ہوئے اور ملک دولخت ہوگیا۔ اس اندوہناک تجربے کی روشنی میں ہماری عدلیہ کو غیرمعمولی طور پر محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ بیشتر قانون دانوں کی نظر میں باقاعدہ ٹرائل کے بغیر وزیراعظم کو نااہل قرار دینا، عوام کے مقدس ووٹ کی توہین کے مترادف ہے۔ اسی طرح دستور کے دفاع اور تحفظ کا حلف اُٹھانا اور دستور توڑنے والوں کو آئینی جواز فراہم کرنا، ایک ایسی غلط روایت ہے جس نے جمہوریت کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ ہمارے ہاں چند جج صاحبان مسائل پیدا کرتے آئے ہیں۔ ریاست کی مضبوطی کے لیے یہ روش تبدیل کرنا ہوگی اور قراردادِ مقاصد میں جو اصول طے پا گیا ہے کہ سیاست کی اتھارٹی استعمال کرنے کا حق صرف عوام کے منتخب نمائندوں کو حاصل ہے، اس پر حتمی طور پر کاربند رہنا ہوگا۔ سیاسی جماعتیں عوام کے اندر سیاسی شعور پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ انھیں منظم کرتی ہیں۔ ایک سیاسی جماعت ہی نے پاکستان کی تشکیل میں فیصلہ کُن کردار ادا کیا تھا اور بیشتر پارٹیوں نے جمہوریت کے لیے بیش بہا قربانیاں دی ہیں۔ انھیں ہر وقت ملامت کرتے رہنا جمہوری عمل کو سبوتاژ کرنا ہے۔ ہم سب اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ عدالتِ عظمیٰ تنازعات طے کرانے کا سب سے مؤقر ادارہ ہے، اس لیے ہم اس کا بے حد احترام کرتے ہیں، مگر اس نے ازخودنوٹس کا دائرہ بہت وسیع کرلیا ہے جس میں اپیل کا حق ہی نہیں۔ یہ امر انسانی بنیادی حقوق کے منافی ہے۔ پارلیمنٹ ایک بالادست ادارہ ہے جو عوام کی حاکمیت کے اصول پر قائم ہے۔ وہ وزیراعظم کا انتخاب کرتا ہے جس کا احترام تمام اداروں پر لازم ہے۔

پروفیسر شبیر احمد خاں

پنجاب یونیورسٹی شعبۂ سیاسیات کے استاد پروفیسر شبیر احمد خاں نے انکشاف کیا کہ ۲۵ فروری ۲۰۱۶ء کی صبح نیویارک ٹائمز میں خبر شائع ہوئی کہ جسٹس کلیرنس تھامس نے دس سال میں پہلی بار زبان کھولی ہے۔ دراصل جج صاحبان خود نہیں بولتے، ان کے فیصلے بولتے ہیں جبکہ ہمارے ہاں عدالتوں میں تقریریں ہوتی ہیں اور طرح طرح کے ریمارکس دیے جاتے ہیں جن سے بدگمانیاں پھیلتی ہیں۔ پارلیمان ہی بالادست ادارہ ہے جس کا احترام سب پر لازم ہے۔ وہ اس نکتے پر زور دے رہے تھے کہ بلاشبہ اداروں کو بڑی اہمیت حاصل ہے، مگر ان کی تشکیل، استحکام اور اعلیٰ کارکردگی میں اصل کردار افراد ادا کرتے ہیں۔ ان کی اہمیت کو تسلیم کیے بغیر اداروں میں روح نہیں پھونکی جاسکتی۔ پاکستان کو اس وقت داخلی اور خارجی چیلنجوں کا سامنا ہے۔ امریکہ اور اس کے حواری ہمارے لیے مسائل پیدا کررہے ہیں۔ پیرس میں ہمارے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ ایک انتہائی تکلیف دہ صورتِ حال کی غمازی کرتا ہے۔ ان حالات میں ہمارے ریاستی اداروں پر لازم آتا ہے کہ وہ آئینی حدود میں رہتے ہوئے ایک دوسرے سے تعاون کریں اور دشمن کی سازش کو پنپنے کا کوئی موقع نہ دیں۔ ہماری عدالتوں کو بھی بڑے بڑے مسائل درپیش ہیں۔ زیرِالتوا مقدمات کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی ہے۔ عدالتِ عظمیٰ کو اس اہم چیلنج پر غیرمعمولی توجہ دینا ہوگی۔ اسی طرح ہماری فوج دہشت گردی پر قابو پانے کے لیے بے مثال قربانیاں دے رہی ہے۔ عوام ان کی پشت پر کھڑے ہیں۔ ان اداروں کو بھی اپنی آئینی حدود میں رہنا اور ایک دوسرے کا احترام کرنا چاہیے۔

جناب رؤف طاہر

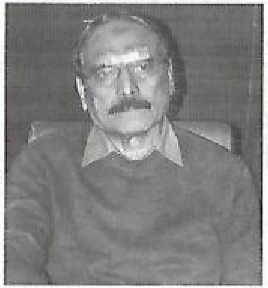

سیاسی تجزیہ نگار رؤف طاہر نے جناب ایاز میر کے کالم کا حوالہ دیا کہ عدلیہ کے پیچھے فوج کھڑی ہے۔ ہمارے چیف جسٹس جو ڈیڑھ لاکھ وکلا کے سپہ سالار ہیں اور وہ میرے بھی سپہ سالار ہیں، ہم اُن سے پوری توقع رکھتے ہیں کہ وہ فیصلوں میں تاخیر کے خلاف جہاد کریں گے

اور قانون اور آئین کے جملہ تقاضوں کا خیال رکھیں گے۔ اسی طرح ملکی سکیورٹی کی حدود بھی پوری واضح ہونی چاہییں۔ آج سے چالیس برس پہلے ہمیں قومی سکیورٹی کے اداروں نے بتایا تھا کہ افغانستان سے روس کی بے دخلی ملکی سلامتی کے لیے حد درجہ ناگزیر ہے۔ اب کہا جا رہا ہے کہ ہم نے چالیس برس پہلے جو بویا تھا، اسی کی فصل کاٹ رہے ہیں۔ اس طرح کی تقریروں سے میں کنفیوز ہو رہا ہوں۔ بیانات دینے سے پہلے ہمارے سیاسی اور عسکری قائدین کو تاریخ سے اپنا رشتہ مضبوط کرنا ہوگا۔ ہمارا سیاسی، قانونی اور آئینی نظام اداروں کے ستونوں پر قائم ہے اور انھیں مضبوط، ہم آہنگ اور ہم قدم ہونا چاہیے۔ نواز شریف صاحب کو ٹرائل کے بغیر نااہل قرار دینے سے بہت سارے سوالات اور تنازعات اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں جن کو دور اندیشی اور اعلیٰ ظرفی سے حل کیا جا سکتا ہے۔ نواز شریف کا بیانیہ عوام کے اندر مقبول ہو رہا ہے اور ایک نئی صورتِ حال جنم لے رہی ہے۔ اسے تاریخ کے تناظر میں سمجھنا اور عوام کے جذبات کا احترام کرنے سے ریاست مضبوط ہوگی۔

جناب وجاہت مسعود

معروف دانش ور جناب وجاہت مسعود کو سب سے بڑی شکایت تھی کہ انھیں اپنے آزاد وطن میں فیصلہ سازی میں اپنا کردار اَدا کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اُن کا احساس تھا کہ مئی ۲۰۱۳ء میں عوام نے جو فیصلہ دیا، بعض طاقتوں نے اسے قبول نہیں کیا اور محاذ آرائی کے یہ سارے مظاہر اسی کے شاخسانے ہیں۔ میں نواز شریف کا ووٹر نہیں اور نہ ہو سکتا ہوں، لیکن اس اصول پر یقین رکھتا ہوں کہ عوام جسے اپنا وزیر اعظم بنائیں، اس کا ہر ادارہ احترام کرے اور جمہوریت کا تسلسل قائم رکھے۔ جمہوریت ایک ایسا سیاسی بندوبست ہے جس میں اختلافِ رائے کی بڑی اہمیت ہے کہ اس سے مکالمے کا عمل جاری رہتا ہے۔ آزادیِ اظہار بہت بڑی نعمت ہے جس کی ضمانت ہمارے دستور میں دی گئی ہے۔ ہم یہاں بیٹھ کر جو گفتگو کر رہے ہیں اور ایک دوسرے کی بات بڑے تحمل سے سن رہے ہیں، اس سے ذہن جلا پاتا ہے اور جمہوری ثقافت کو فروغ ملتا ہے۔ میں صاف طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ میں اپنی عدلیہ کے کردار سے مطمئن نہیں۔ اسے ہر مرحلے میں غیر جانب داری سے فیصلے کرنا اور اس بات کا خیال

رکھنا ہوگا کہ اس کی عزت اس کے غیر جانب دارانہ فیصلوں ہی سے قائم رہ سکتی ہے۔ عوام کے ووٹ کے احترام ہی سے جمہوری معاشرہ ارتقائی منازل طے کرتا ہے۔

ڈاکٹر حسین احمد پراچہ

معروف کالم نگار ڈاکٹر حسین احمد پراچہ کا چچا تُلا بیان تھا کہ تاریخ میں پہلی بار حکمرانوں کا احتساب ہو رہا ہے جس کا سول سوسائٹی کو ساتھ دینا چاہیے۔ بعض لوگ واویلا کر رہے ہیں کہ ان کے ساتھ عدالتوں میں توہین آمیز سلوک ہو رہا ہے، انھیں کچھ معلوم نہیں کہ شہریوں کے ساتھ دفتروں، کچہریوں اور عدالتوں میں کس قدر ذلت آمیز رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ عدالتوں کے خلاف نفرت پھیلانا ملکی مفاد کے خلاف ہے۔ سابق وزیر اعظم کی صاحب زادی فرماتی ہیں کہ People, not courts, pass verdict یعنی عدالتوں کے بجائے عوام فیصلے کرتے ہیں۔ ہم اس سے نئی نسل کو کیا پیغام دینا چاہتے ہیں؟ ہر آئین کا ایک بنیادی ڈھانچہ ہوتا ہے۔ ہمارے آئین کا بنیادی ڈھانچہ یہ ہے کہ قرآن و سنت کے خلاف قانون سازی کی جا سکتی ہے نہ بنیادی انسانی حقوق سے انحراف کی گنجائش ہے۔ ہمیں قانون کی بالادستی کا ساتھ دینا اور معاشرے میں توازن قائم رکھنا ہوگا۔ ہماری اسلامی تاریخ میں احتساب کی نہایت روشن مثالیں موجود ہیں جن کے مطابق حکمرانوں کو مواخذے کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔ ہمارے میڈیا کو بھی احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ بعض ٹی وی چینلز ایک ہیجان انگیز ماحول پیدا کرنے اور اداروں کے درمیان محاذ آرائی کو ہوا دیتے رہتے ہیں۔ ہم عدالتی فیصلوں کے سقم پر کوئی بات کر سکتے ہیں، مگر جج صاحبان کو ہدفِ تنقید نہیں بنا سکتے۔ ہمیں برداشت، رواداری اور بردباری کا کلچر اختیار کرنا ہوگا۔

محترمہ بشریٰ رحمٰن

ہماری قابلِ قدر ادیب محترمہ بشریٰ رحمٰن جو پنجاب اسمبلی اور قومی اسمبلی میں نمائندگی کا تجربہ رکھتی ہیں، انھوں نے مشورہ دیا کہ غیر جانب دار اہلِ قلم اور اہلِ دانش یکجا بیٹھ کر ایک ایسا لائحہ عمل ترتیب دیں جس

سے عوام کی بہتری کے راستے کشادہ ہوں۔ انھوں نے کہا کہ تمام ادارے اپنے احترام اور وقار سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ اب عدالتوں پر بھی اعتبار کم ہو گیا ہے جبکہ عوام اپنے لیڈروں پر اعتماد نہیں کر رہے، کیونکہ وہ فرعون بن گئے ہیں۔ انھوں نے عوام کو دیا ہی کیا ہے؟ ان کا استحصال کیا ہے اور اپنے مفادات کو ترجیح دی ہے۔ دستور کو قومی زندگی میں نصاب کی حیثیت حاصل ہے اور ہم اسی سے راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ مجھے اس بات پر بہت دکھ محسوس ہوا جب پارلیمنٹ سے اٹھارہویں ترمیم منظور ہوئی جس سے وفاق کو بہت ضعف پہنچا ہے۔ ہمیں ماضی میں رہنے کے بجائے قریشی صاحب کی اس بات کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ محاذ آرائی ختم کرنے کے لیے تجاویز دی جائیں۔ میری تجویز ہے کہ اہلِ قلم اور اہلِ دانش میں سے غیر جانب دار شخصیتوں کا انتخاب کر کے انھیں ایک قابلِ عمل لائحہ عمل ترتیب دینے کا مشن سونپا جائے۔ مجھے امید ہے کہ مشاورت کے ذریعے ایک روڈ میپ تیار ہو جائے گا جو ریاستی اداروں کے مابین ہم آہنگی کو پروان چڑھائے گا اور میڈیا کے ذریعے بے یقینی کی فضا تحلیل کی جا سکے گی۔

ڈاکٹر امجد عباس مگسی

پنجاب یونیورسٹی کے ڈاکٹر امجد عباس مگسی اس نقطۂ نظر کے علم بردار تھے کہ پارلیمنٹ ایک بالادست ادارہ ہے اور اس میں تمام تنازعات کا حل کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے، مگر سیاست دان اسے ایک بالادست قوت بنانے میں ناکام رہے ہیں۔ انھیں ایک دوسرے پر وار کرنے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے بجائے ہر سطح پر اپنے آپ کو منظم کرتے ہوئے کارکنوں کو فیصلوں میں شامل کرنا ہو گا۔ سیاسی تنازعات پارلیمنٹ میں طے کیے جا سکتے ہیں، اس لیے انھیں عدالتوں میں لے جانے سے پوری طرح اجتناب کیا جائے۔ تمام ادارے آئینی حدود میں اپنے فرائض منصبی بجا لاتے رہیں، تو تصادم پیدا نہیں ہو گا۔ دکھ یہ ہے کہ اختلاف کی زبان میں شائستگی کے بجائے گراوٹ اور دشنام طرازی در آئی ہے جو قوم کے مزاج پر اثر انداز ہونے کے علاوہ کشیدگی کو تقویت پہنچانے کا باعث بن رہی ہے۔ گرینڈ نیشنل ڈائیلاگ کا اہتمام وقت کی سب سے بڑی ضرورت محسوس ہوتا ہے۔

جناب محمد مہدی

مسلم لیگ نون کے میڈیا کوآرڈینیٹر جناب محمد مہدی نے میثاقِ جمہوریت کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ہماری سیاسی جماعتوں کو کسی غیر آئینی اور غیر سیاسی اقدام کی حمایت نہیں کرنی چاہیے۔ بہتر ہو گا کہ سینئر صحافیوں پر مشتمل ایک ٹیم ترتیب دی جائے جو اداروں کے سربراہوں سے مشاورت کے بعد باہمی احترام کو فروغ دینے کی تدابیر کو عملی جامہ پہنانے میں مددگار ثابت ہو۔ ایک بات جو ذہنوں میں شکوک و شبہات پیدا کرتی ہے وہ یہ کہ سیاسی مقدمات ایک خاص قسم کے جج صاحبان سنتے ہیں۔ بے نظیر بھٹو کے مقدمات کی سماعت ماضی میں خاص مزاج کے حامل جج صاحبان کیا کرتے تھے۔ پوری قوم پر عدلیہ کا احترام واجب ہے کہ وہ تنازعات حل کرنے کا سب سے معتبر ادارہ ہے۔ عدلیہ کو بھی قانونی تقاضوں اور اعلیٰ روایات کا پابند رہنا چاہیے۔ ہماری ریاست کو بڑے بڑے چیلنجوں کا سامنا ہے جو قومی اداروں میں باہمی احترام اور ہم آہنگی کا تقاضا کرتے ہیں۔ پیرس میں ہماری کارکردگی بڑی مایوس کن رہی۔ ایک طرف بھارت ننگی دھمکیاں دے رہا ہے اور دوسری طرف امریکہ افغانستان میں اپنی ناکامی کا انتقام پاکستان سے لینا چاہتا ہے۔ ان حالات میں ریاستی اداروں کو داخلی استحکام اور علاقائی امن کے قیام کی فکر ہونی چاہیے۔ سیاسی، عسکری اور عدالتی قیادتوں پر لازم آتا ہے کہ وہ عوام کے اندر یک جہتی کو فروغ دیں اور تنازعات کو ہوا دینے سے مکمل طور پر اجتناب کریں۔ ہمارے میڈیا پر بھاری ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ تشنج کی کیفیت پیدا کرنے کے بجائے قومی شعور اور بقائے باہمی کے جذبوں کی آبیاری میں حیات افروز کردار ادا کرے۔

جناب عارف میاں

صحافت سے وابستہ جناب عارف میاں نے اپنی گفتگو کا آغاز ۱۹۵۴ء کے حادثے سے کیا جب گورنر جنرل غلام محمد نے دستور ساز اسمبلی تحلیل کی تھی۔ سندھ چیف کورٹ کے چیف جسٹس کی سربراہی میں فل بنچ نے اس اقدام کو غیر آئینی قرار دیتے ہوئے دستور ساز اسمبلی بحال کر دی تھی۔ ہمیں ان جج صاحبان کی عظمت کو سلام پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے نام تمام عدالتوں اور بار کونسلوں میں آویزاں کرنے

چاہئیں۔ انھوں نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ فیڈرل کورٹ کے چیف جسٹس محمد منیر کی سربراہی میں بنچ نے جو فیصلہ دیا اور اس میں گورنر جنرل کے اقدام کو آئینی جواز فراہم کیا گیا۔ اس فیصلے کے خلاف سیاسی جماعتوں اور وکلا برادری نے کوئی مزاحمتی مہم نہیں چلائی۔ اگر اس وقت عوامی طاقت کا مظاہرہ ہوتا، تو عدالتوں کو ماورائے آئین اقدامات کو قانونی جواز فراہم کرنے کا ہرگز حوصلہ نہ ہوتا۔ دراصل عوامی شعور اور عوامی طاقت اداروں کو راہِ راست پر رکھتے ہیں۔ انھوں نے کہا مجھے یقین ہے کہ ہمارے ادارے تاریخ سے سبق سیکھتے ہوئے محاذ آرائی کی روش ترک کر دیں گے اور اپنی آئینی حدود میں رہنے کو ترجیح دیں گے۔

جسٹس (ر) جناب فقیر محمد کھوکھر

سابق جسٹس جناب فقیر محمد کھوکھر نے وضاحت سے بتایا کہ آئین میں صوبوں اور اداروں کے مابین تنازعات حل کرنے کے ادارے موجود ہیں۔ مثال کے طور پر قومی مشترکہ مفادات کونسل میں صوبے مرکز سے اپنے تنازعات طے کر سکتے ہیں۔ اسی طرح قومی اقتصادی کونسل میں تعاون سے ہدف حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ کابینہ سیکورٹی کمیٹی بھی ایک ایسا ادارہ ہے جس میں سیاسی اور عسکری قائدین کے مابین پیدا ہونے والے شکوک و شبہات پر بامقصد گفتگو ہو سکتی ہے۔ سینیٹ چیئرمین میاں رضا ربانی نے فوج اور عدلیہ کے ساتھ ڈائیلاگ کا سلسلہ شروع کیا تھا جسے ایک اچھی روایت کا درجہ دیا جانا چاہیے۔ میثاقِ جمہوریت میں سیاسی قائدین نے ایک شق رکھی تھی کہ پی سی او پر حلف اُٹھانے والا جج چیف جسٹس مقرر نہیں کیا جائے گا، مگر اس پر عمل نہیں ہوا اور جسٹس افتخار محمد چودھری، جنہوں نے دو بار پی سی او پر حلف اُٹھایا تھا، چیف جسٹس کے منصب پر فائز رہے۔ دراصل اداروں کے مابین کشمکش کا آغاز ۱۹۵۴ء میں ہوا تھا جب گورنر جنرل ملک غلام محمد نے دستور ساز اسمبلی توڑ دی تھی اور جسٹس محمد منیر نے ٹیکنیکل گراؤنڈ پر گورنر جنرل کے

اقدام کو آئینی جواز فراہم کیا تھا۔ اس زمانے میں جو کابینہ تشکیل دی گئی، اس میں کمانڈر اِن چیف جنرل ایوب خاں وزیرِ دفاع بنا دیے گئے۔ انھیں سیاست دانوں کے حالات قریب سے دیکھنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کے مواقع حاصل ہوئے۔ اس وقت سے اداروں کے مابین عدم توازن اور اعتماد کا فقدان دیکھنے میں آ رہا ہے۔ بیشتر ماہرینِ قانون کی نظر میں عدالتِ عظمیٰ کے بعض جج صاحبان اپنی آئینی حدود سے تجاوز کر رہے ہیں۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پارلیمان اور عدلیہ ایک دوسرے کے مدِ مقابل آن کھڑے ہوئے ہیں۔ یہ ایک تشویش ناک صورتِ حال ہے جس پر دانش مندانہ کوششوں کو بروئے کار لانے کی اشد ضرورت ہے۔

جناب جاوید نواز

سول سوسائٹی کے نمائندے جناب جاوید نواز نے نیشنل ڈائیلاگ پر زور دیا۔ حیرت یہ کہ عدلیہ نے فیصلے دینے کے ساتھ ساتھ تحقیقات کا بار بھی خود اُٹھا لیا ہے۔ سیاسی جماعتوں کی تعداد کم کرنے کے لیے ترکی کے تجربے سے فائدہ اُٹھانا چاہیے کہ پانچ فی صد سے کم ووٹ لینے والی جماعتیں نمائندگی سے محروم ہو جاتی ہیں، سینیٹ کے انتخابات براہِ راست ہونے چاہئیں اور محاذ آرائی پر قابو پانے کے لیے سیاسی جماعتوں کے ساتھ ساتھ تمام اداروں کو اخلاقی اور آئینی حدود میں رہنا ہو گا۔ انھوں نے مزید مشورہ دیا کہ ہر نوع کے صوابدیدی اختیارات ختم کر دیے جائیں اور قانون کے سامنے تمام شہری برابر ہوں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ الطاف حسن قریشی صاحب کی تجویز کو عملی شکل دینے کے لیے جلد کونسل آف ایلڈرز تشکیل دی جائے کہ حالات میں بہتری لانے کا وقت کم رہ گیا ہے جبکہ محاذ آرائی میں شدت آتی جا رہی ہے۔ حالات کا اوّلین تقاضا یہ ہے کہ اختلاف کا اظہار آئینی حدود میں کیا جائے اور کسی میں عقلِ کُل بن جانے کا خبط پیدا نہ ہونے دیا جائے۔ حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر بلند قامت اور غیر جانب دار شخصیتوں کی تلاش کا کٹھن کام فوری طور پر شروع کر دینا چاہیے۔

جناب ایس ایم ظفر

صدرِ مجلس جناب ایس ایم ظفر نے پوری بحث سمیٹتے ہوئے کہا کہ تمام مقررین محاذ آرائی اور تصادم ختم

کرنے کی ضرورت پر متفق ہیں۔ ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ حادثات ایک روز میں وقوع پزیر نہیں ہوتے۔ ۱۹۵۴ء کا حادثہ اس لیے پیش آیا کہ ہمارے سیاست دان سات برسوں تک دستور نافذ نہیں کر سکے تھے۔ ۱۹۷۳ء کا دستور نہایت جید سیاست دانوں نے منظور کیا اور میں بھی اس کا ڈرافٹ تیار کرنے میں شامل تھا۔ آئین کی تشریح کا اختیار عدالتِ عظمیٰ کو اِس لیے دیا گیا ہے کہ اس کے پاس بندوق ہے نہ دولت کی فراوانی۔ جناب نواز شریف کے خلاف جو فیصلہ آیا وہ کمزور دلیل پر دیا گیا ہے۔ میرے خیال میں سب سے قابلِ اعتماد کسوٹی اچھی حکمرانی ہے۔ عوام کو صاف پانی، اچھی خوراک اور آسودہ زندگی میسر نہ ہو، تو پھر کسی نہ کسی طرف سے مداخلت کا امکان رہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ حالات پہلے سے بہتر ہوں گے کہ عوام کے شعور میں پختگی آ رہی ہے اور سوشل میڈیا نے آزادیٔ اظہار کو نئی سمت عطا کی ہے۔

اُن کی رائے میں عدلیہ نے زیادہ تر فیصلے جمہوریت کے حق میں دیے۔ اس نے فوجی حکمرانوں کو انتخابات کرانے پر مجبور کیا جن کے ذریعے عوام کو اپنے فیصلے کرنے کا موقع ملا۔ آج وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ عام انتخابات پوری طرح شفاف ہوں اور اپنے وقت پر ہو جائیں۔ عدلیہ اور فوج نے یقین دلایا ہے کہ وہ شفاف انتخابات کو یقینی بنانے میں اپنا کردار ادا کریں گے۔ میں عدلیہ کو مشورہ دینا چاہوں گا کہ وہ اپنے فیصلوں میں اشعار کے بجائے قانونی زبان استعمال کرے اور سیاست دانوں کے خلاف غیر معیاری الفاظ کے استعمال سے اجتناب برتا جائے۔ پارلیمان اور عدلیہ کے درمیان محاذ آرائی کوئی اچھا شگون نہیں۔ یہ امر قابلِ ستائش ہے کہ عسکری قیادت نے بار بار یہ عندیہ دیا ہے کہ وہ جمہوریت کو مستحکم دیکھنا چاہتی ہے۔ اس تناظر میں عوام کے منتخب نمائندوں پر واجب آتا ہے کہ وہ پارلیمان کو ایک طاقت ور ادارہ بنائیں، اس کی کارروائی میں پوری توجہ اور بڑی باقاعدگی سے حصہ لیں اور مکالمے کے ذریعے قومی اور علاقائی مسائل کا حل تلاش کریں۔ قومی قیادت کے سنجیدہ رویوں اور دانش مندانہ اقدامات سے اداروں کے مابین تصادم کا خطرہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو سکتا ہے۔ ہمیں اپنے رویوں سے رواداری اور برداشت کی ثقافت کو پروان چڑھانا اور باہمی احترام کو اپنا شعار بنانا ہوگا۔ ●●●

"آپ کی زکوٰۃ نے بدل دیا مقدر"

کاروان علم فاؤنڈیشن کے مالی تعاون سے کم وسیلہ، یتیم اور معذور مگر باصلاحیت طلباء و طالبات اعلیٰ پیشہ وارانہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں اپنے خاندان کا سہارا بن رہے ہیں اور قومی ترقی کے دھارے میں شامل ہو رہے ہیں

5,786 طلباء و طالبات کو -/139,683,855 روپے کے وظائف جاری کیے جا چکے ہیں

986
یتیم طلباء و طالبات کو پیشہ وارانہ اعلیٰ تعلیم کے لئے مالی اعانت فراہم کی گئی۔

355
نابینا، پولیو زدہ اور حادثے کی وجہ سے معذور طلباء کو مالی اعانت فراہم کی گئی

سکالرشپ حاصل کرنے والے طلباء و طالبات کی تعداد اور شعبہ جات

ایم بی بی ایس	1377	ایم اے	140	بی کام آنرز	161	ایل ایل بی	15	ایف ایس سی	529
بی ڈی ایس	52	ایم کام	41	بی ایس آنرز	777	بی اے آنرز	48	ایف اے	95
فزیوتھراپی	49	ایم بی اے	58	بی بی اے	64	بی اے	74	آئی کام	56
ڈی وی ایم	123	ایم پی اے	05	اے سی سی اے	19	سی ایس ایس	01	ڈی کام	05
ڈی فارمیسی	108	ایم فل	20	سی اے	04	بی ٹیک	24	آئی سی ایس	17
ایم ایس سی	144	بی ایس سی انجینئرنگ	1443	بی ایس ایڈ/ بی ایڈ	42	ڈپلوما ایسوسی ایٹ انجینئرنگ	164	میٹرک	131

زیر کفالت اور زیر غور طلباء کی مالی اعانت کے لئے 3 کروڑ روپے درکار ہیں

زکوٰۃ و عطیات دیجئے علم و ہنر سے آراستہ روشن اور باوقار پاکستان کے لئے!

کاروان علم فاؤنڈیشن

Meezan Bank
The Premier Islamic Bank
میزان بنک سمن آباد، لاہور پاکستان اکاؤنٹ نمبر 0240 0100882859

BOP
THE BANK OF PUNJAB
بنک آف پنجاب سمن آباد، لاہور پاکستان اکاؤنٹ نمبر 0110 002 000424 0003
بنک آف پنجاب شاہراہ فیصل کراچی پاکستان اکاؤنٹ نمبر 0247 002 000827 0003

گھر سے عطیات کی وصولی کے لئے رابطہ
لاہور: مہدی رضا
0305-4133173
اسلام آباد: کلیم اللہ چوہدری
0321-5587250

معلومات و راہنمائی کے لئے رابطہ کیجئے

67- کشمیر بلاک حفیظ تائب روڈ نزد رحیم سٹور علامہ اقبال ٹاؤن لاہور۔
فون: 0321-8461122, 0345-8461122, 0333-8461122

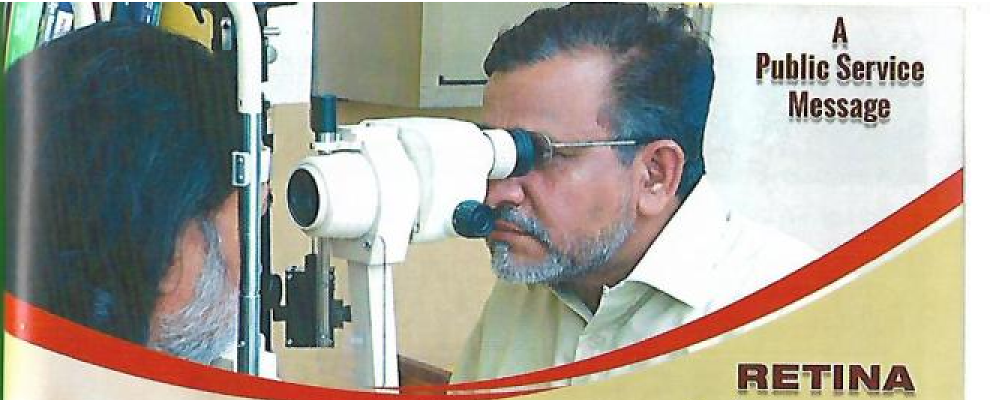

RETINA

یا پردہ بصارت : خرابیاں، علاج

آنکھ میں پردہ بصارت کی وہی حیثیت ہے جو کیمرہ میں فلم اور کمپیوٹر میں ریم کارڈ RAM card کی ہوتی ہے؛ اس کے بغیر نظر آنا ناممکن ہے۔ یہ آنکھ کی اندرونی سطح پر ایک لیمینیشن کی طرح جڑا ہوتا ہے۔ لیمینیشن کی طرح کی اس پتلی سی شفاف جھلی کو پردہ بصارت کہتے ہیں۔

آنکھیں توجہ چاہتی ہیں!

پردہ بصارت کی خرابی کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟

1۔ پردہ بصارت کی دو پرتیں ہوتی ہیں جن کے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جانے سے ان کے درمیان پانی بھر جاتا ہے۔ یہ پردہ بصارت میں سوراخ ہو جانے یا پھٹ جانے کے باعث ہوتا ہے۔ 2۔ پردہ بصارت میں موجود خون کی نالیاں خراب ہونے سے خون کے اجزاء رس رس کر سوجن پیدا کر دیتے ہیں جس سے بینائی کم ہو جاتی ہے۔ 3۔ پردے کا مرکزی حصہ یعنی میکولا Macula کے متاثر ہونے سے بالخصوص قریب کی نظر متاثر ہوتی ہے، چیزیں ٹیڑھی نظر آنے لگتی ہیں، علاوہ ازیں زیادہ خرابی کی صورت میں چیزوں کی پہچان مشکل ہو جاتی ہے۔ 4۔ خون کی نالیوں کے خراب ہونے سے پردے کو خوراک نہیں ملتی خاص طور پر اس کی آکسیجن کی ضرورت پوری نہیں ہو پاتی جس سے پردے کے اوپر اور وٹیریس کے اندر جھلیاں بننی شروع ہو جاتی ہیں، جو نظر کو متاثر کرتی ہیں۔ ان جھلیوں سے وقتاً فوقتاً خون کی کوئی نالی پھٹ جاتی ہے جس سے بعض اوقات پردے کے اوپر خون کی تہہ جم جاتی ہے اور بسا اوقات وٹیریس کا پورا خانہ خون سے بھر جاتا ہے۔ یہ جھلیاں آہستہ آہستہ پردے کے بعض حصوں کو اپنی جگہ سے اکھاڑ دیتی ہیں بعض اوقات پردے کا کوئی حصہ پھٹ بھی جاتا ہے جس سے پردہ اکھڑ جاتا ہے۔

پردہ بصارت کی خرابیوں کا علاج کرنے کیلئے مختلف طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ اہم کا ذکر ذیل میں کیا گیا ہے:

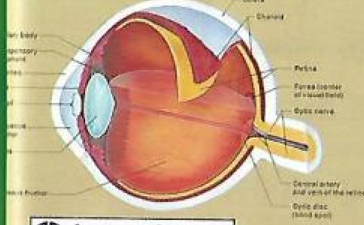

1۔ مختلف قسم کی دوائیں جو قطروں کی شکل میں بھی استعمال کی جاتی ہیں اور کھلائی بھی جاتی ہیں۔

2۔ بعض ادویہ انجیکشن کی شکل میں دی جاتی ہیں۔ یہ ٹیکے آنکھ کے سطحی پردوں کے نیچے بھی لگائے جاتے ہیں اور بعض ٹیکے آنکھ کے اندر تک بھی دوائی پہنچاتے ہیں۔ 3۔ لیزر شعاعیں بھی پردے کے علاج کا ایک اہم اور مفید ذریعہ ہیں۔

بعض ایسے اپریشن بھی کئے جاتے ہیں جن کی مدد سے پردہ کو ویلڈ کر دیا جاتا ہے اور پھر باہر سے ایک پٹہ نما چیز Silicon band آنکھ کے گرد لپیٹ دی جاتی ہے جس سے پردہ دوبارہ نہیں اکھڑتا۔

ایک اور بہت ہی اہم طریقہ علاج ویٹریکٹومی آپریشن Vitrectomy Operation ہے جس میں آنکھ کے اندر سے صفائی کر کے مختلف جھلیاں اور خون وغیرہ نکال دیا جاتا ہے اور جہاں ضروری ہو وہاں سے لیزر لگا دی جاتی ہے۔

AMERICAN ACADEMY OF OPHTHALMOLOGY
The Eye M.D. Association
MEMBER

ڈاکٹر آصف کھوکھر
ایم بی بی ایس (پنجاب)، ایم سی پی ایس (آئی)، ایم اے (علوم اسلامیہ)
Vitreoretinal, phaco, laser,
آئی سرجن لاہور میڈیکیئر انسٹیٹیوٹ آف آفتھیلمالوجی، لاہور
فیروز پور روڈ بالمقابل قذافی سٹیڈیم
ایام معائنہ: منگل، جمعرات، ہفتہ 2 بجے دوپہر سے 5 بجے شام
www.drasifkhokhar.com
: 0333-4102208 Email: drasifkhokhar@hotmail.com

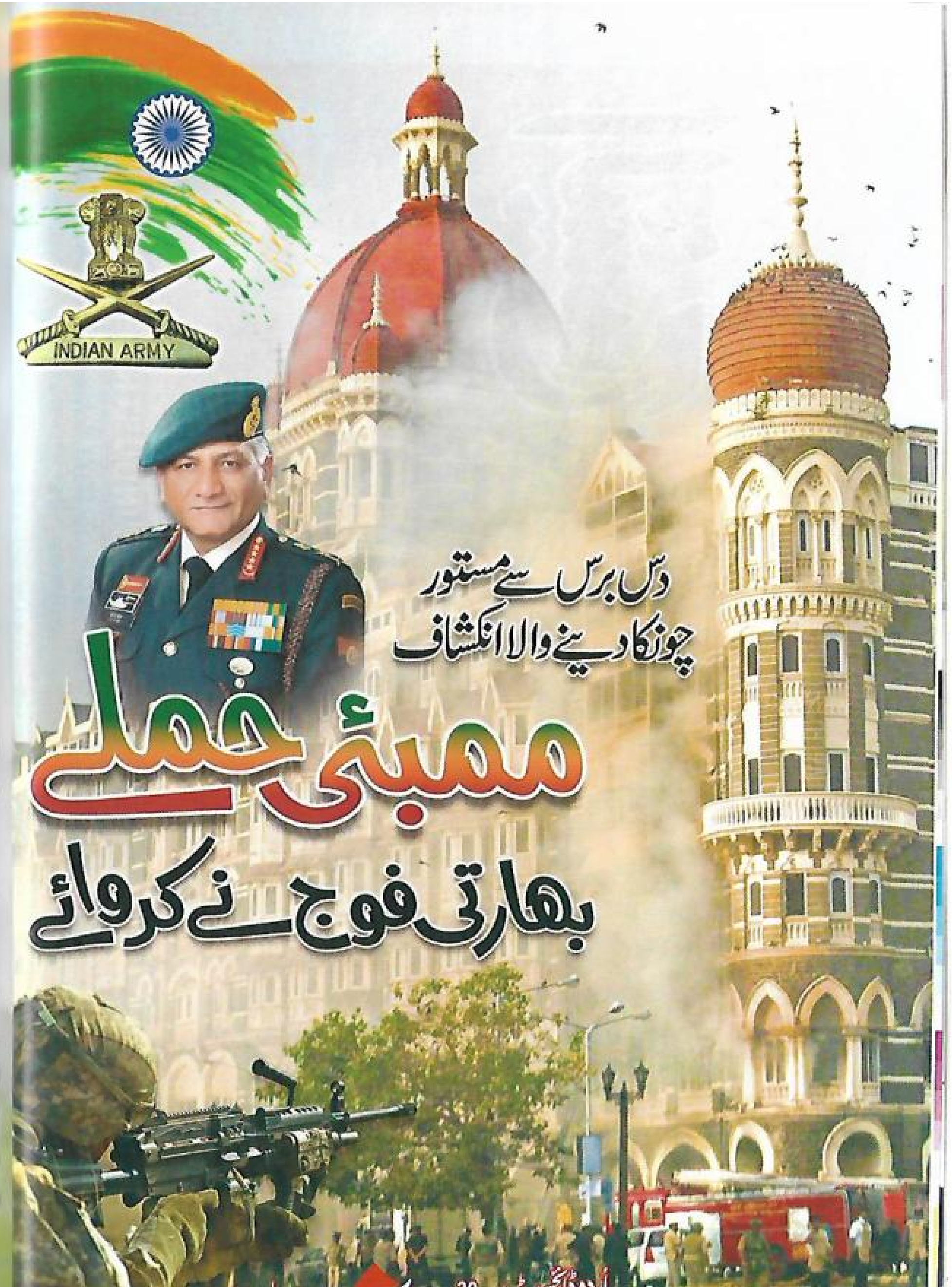

دس برس سے مستور
چونکا دینے والا انکشاف

ممبئی حملے
بھارتی فوج نے کروائے

سیّد عاصم محمود

۲۶ نومبر ۲۰۰۸ء کی بات ہے، انیتا ادھایا شام کو ممبئی کے ساحل پر شام کو حسب معمول چہل قدمی کر رہی تھی۔ وہ آبادی بھارت کے اس سب سے بڑے شہر میں کولابہ نامی علاقے کی باسی تھی۔ اس کا معمول تھا کہ گھر کے کام کاج سے فراغت کے بعد وہ بغرض تفریح اس ساحل پر چلی آتی جو آبادی سے کچھ دور ہونے کی وجہ سے عموماً ویران ہی ہوتا۔ وہ چہل قدمی کر کے تھکن دور کر لیتی۔

اس شام انیتا نے اچانک دیکھا کہ ایک کشتی ساحل پر

روا‌ں سال ماہ نومبر میں ان حملوں کو انجام پائے دس برس بیت جائیں گے۔ بھارتی حکمرانوں کا دعویٰ ہے کہ یہ حملے پاکستانی دہشت گردوں نے انجام دیے تھے۔ چنانچہ پچھلے دس سال سے بھارتی حکومت کی سرتوڑ کوشش ہے کہ ممبئی حملوں کا سہارا لے کر اقوام متحدہ پاکستان کو ''دہشت گرد ملک'' قرار دے ڈالے تاکہ وہ عالمی سطح پر تنہا ہو سکے۔

اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی سچائی آشکار کرتی تحقیق

اس گمراہ کن پلان کی حیرت انگیز اور محیّر العقول داستان جو پاکستان، پاک فوج اور لشکر طیبہ کو عالمی سطح پر بدنام کرنے کے لیے بھارتی جرنیلوں، را اور آئی بی نے مل کر بنایا اور دنیا والوں کی نظروں میں دھول جھونکنے میں کامیاب رہے

آن لگی۔ اس پر چھ آدمی سوار تھے۔ ان کے ساتھ بیگ تھے اور پشتارے (بیک پیک بھی)۔ انیتا نے تجسّس کے مارے ان سے مراٹھی زبان میں پوچھا ''تم کون ہو؟''

ایک اجنبی نے مراٹھی ہی میں جواب دیا ''تم اپنے کام سے کام رکھو۔'' وہ لوگ پھر مراٹھی ہی میں باتیں کرتے آبادی کی جانب بڑھ گئے۔

یہ واقعہ انتہائی چالاکی و عیاری سے بنائے گئے اس منصوبے کا ابتدائی حصہ ہے جو بعد میں ''ممبئی حملوں'' کے نام سے مشہور ہوا۔ اس عیارانہ پلان کی اہمیت کا اندازہ یوں لگائیے کہ ان حملوں کو ''بھارت کا نائن الیون'' کہا جاتا ہے۔ جس طرح امریکا کے نائن الیون نے دنیا بھر میں سنسنی پھیلا دی تھی، اسی طرح ممبئی حملے بھی انتہائی ہیجانی ثابت ہوئے اور انھوں نے تین دن تک پوری دنیا میں ہیجان پھیلائے رکھا۔

دہشت گرد ملک کی حیثیت قرار دے کر بھارتی حکمران پاکستان کی معیشت کو بھرپور نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ حال ہی میں بھارت اور امریکا نے متواتر کوششوں کے بعد پاکستان کو فنانشل ایکشن ٹاسک فورس کی ''گرے لسٹ'' میں شامل کروا کر ہی دم لیا۔ دونوں قوتوں کو اس لیے بھی کامیابی نصیب ہوئی کیونکہ بقول ان کے، حکومت پاکستان ممبئی حملے انجام دینے والی تنظیم لشکر طیبہ المعروف بہ جماعت الدعوہ کے خلاف کارروائی کرنے سے گریز کرتی ہے۔

امریکا اور بھارت کے زبردست دباؤ کی وجہ سے چین، ترکی اور سعودی عرب بھی پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے۔ بعد ازاں حکومت پاکستان نے جماعت الدعوہ کے تحت چلنے والے تعلیمی ادارے، اسپتال اور دیگر سماجی مراکز اپنے قبضے میں لے لیے۔ یوں وہ دنیا والوں پر ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ پاکستان

نکاح کرنا میری سنت ہے (فرمانِ رسول ﷺ)

زنا ایک قرض ہے، اگر تم نے لیا تو ادا گھر والوں کو کرنا پڑے گا۔ (قول جناب امام حسنؓ)

اسلامی نظام زندگی۔۔۔ مکمل ضابطہ حیات اور خوشحالی کا ضامن ہے

حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی　　خدا کرے جوانی رہے تری بے داغ

نکاح آسان تحریک پاکستان

نکاح آسان تحریک پاکستان

۱۵ سالہ مثالی خدمات

قابل اعتماد، پائیدار اور معیاری اسلامی رشتوں کا مرکز　　اب والدین اچھے رشتوں کے لیے پریشان نہ ہوں!

شعبہ جات:

۱۔ ہم سفر (Marriage Bureau): ہر برادری، زبان، مسلک اور ہر قسم کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہزاروں رشتوں پر مشتمل ملکی اور غیر ملکی اسلامی رشتہ سینٹر (شیخ القرآن والحدیث، مفتی، عالم دین، حافظ قرآن، جج، پروفیسر، لیکچرار، آرمی آفیسر، سرجن، ڈاکٹر، BDS، انجینئر، وکیل، صحافی، بزنس مین، زمیندار، صنعتکار، CA، ACCA، MBA، MSc.، M.A، M.Com، M.Phil، PhD، ڈپلوما ہولڈر اور مختلف شعبہ زندگی کے رشتے موجود ہیں)

۲۔ کتب (Library): شادی و بیاہ، رشتہ و رسومات، دینی و فقہی مسائل، معلومات عامہ، معاشرتی و نفسیاتی، سماجی و معاشی، عائلی قوانین اور دیگر عصر حاضر کے پیچیدہ موضوعات پر مشتمل ایک لاکھ کتب پر مبنی وسیع و عریض لائبریری اور اسلامک بک سینٹر کا قیام

۳۔ تحقیق و نفسیات (Research & Psychology): 30 اہم ترین سنہری اصول جو کامیاب شادی کی بنیاد ہیں، جن کی روشنی میں رشتے کروائے جاتے ہیں۔

۴۔ تصانیف و تالیف (Publishing): طبی، قانونی، خاندانی، معاشرتی، نفسیاتی، روحانی، سیاسی مسائل اور نت نئے موضوعات پر پیغامات، مضامین، کتابچے اور کتب کا اجراء، مثلاً: صحیح استخارہ، تین طلاقیں، حلالہ، وٹہ سٹہ، تھیلسیمیا ٹیسٹ، لیٹ میرج، چار شادیاں، کزن میرج، جہیز، ٹیسٹ ٹیوب بے بی وغیرہ

صحیح استخارہ پر مشتمل کتابچہ اور 30 سنہری اصول مفت حاصل کرنے نیز خود مختار، لیٹ میرج، سیکنڈ میرج، بیوہ، رنڈوا، مطلقہ، خلع یافتہ، غرباء، مساکین، معذور، گونگے بہرے، نابینا، بے سہارا، مجبور، ضرورت مند، مستحق احباب بھی رابطہ کریں۔ پاکستان اور بیرون ممالک سے نمائندگان (مرد و خواتین) کی ضرورت ہے

مشاورتی بورڈ

زیر سرپرستی	بانی چیئرمین	نکاح خواں	قانونی مشیران
پروفیسر ابو الحسنین عبدالحمید محمد قریشی	عبداللہ ابو بکر صدیق حسنی	مولانا طارق جمیل	نصراللہ خان اولکھ ایڈووکیٹ
ڈاکٹر فرید احمد پراچہ	بیگم فرزانہ پروین	ڈاکٹر معراج الہدیٰ صدیقی	محمد رفیق نظامی ایڈووکیٹ
بریگیڈیئر (ر) ڈاکٹر زاہد اختر راؤ	راؤ محمد سلیم خان	مفتی حافظ محمد ایوب صابر	عطاء اللہ عاطف خانزادہ ایڈووکیٹ
الحاج محمد اعجاز چودھری	مولوی محمد اشفاق بلال	مفتی محمد انس مدنی	حافظ فیصل ذیشان شیخ ایڈووکیٹ
ڈاکٹر اقبال خلیل	محمد شاہد شیخ	مفتی زبیر الحسن سبحانی	

مشورہ، معلومات اور رجسٹریشن

0333-2661312
0321-2661312
(24 گھنٹے سروس)

nikahatpakistan2002@gmail.com
icpp313pakistan@gmail.com
nikahatpakistan2002

Title: Abdullah Abubaker Siddique
A/C # : 0103397721401
Branch Code: 0321 Raiwind Lahore

خط و کتابت: پاکستان ہاؤس، بیرون تبلیغی مرکز، ریلوے روڈ، رائیونڈ، لاہور

نیٹ ورک: پاکستان ہاؤس، بحریہ آرچرڈ، گیٹ نمبر 2، رائیونڈ روڈ، لاہور

پاکستان ہاؤس، خیبر ہوٹل نزد ایمپریس مارکیٹ، جہانگیر پارک، صدر کراچی

پاکستان ہاؤس، البجت ہوٹل، چنیوٹ بازار، گھنٹہ گھر فیصل آباد

اسلام آباد، فیصل آباد، ملتان، گوجرانوالہ، حیدر آباد، سکھر، کوئٹہ، پشاور، مردان، جہلم، گلگت، چترال، سوات، مظفر آباد، میر پور، وادیِ نیلم، گجرات، رحیم یار خان

ہیں لشکر طیبہ اور اس کے قائدین مثلاً حافظ محمد سعید فعال نہیں۔ حافظ صاحب تو ممبئی حملوں کے بعد قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیل رہے ہیں۔ انھیں مغربی و بھارتی میڈیا عالمی سطح پر ”دہشت گرد“ اور ”مجرم“ بنا کر پیش کرتا ہے۔

فالز فلیگ اٹیک

پچھلے دنوں جرمنی کے محقق و صحافی، الیسن ڈیوڈسن کی انگریزی کتاب ”دی بیٹریل آف انڈیا: ری وزٹنگ دی ۲۶/۱۱ ایویڈینس“ (The Betryal of India: Revisiting the 26/11 Evidence) کا بھی چرچا رہا جس نے ممبئی حملوں کی یادیں تازہ کر دیں۔ اس کتاب کا بنیادی موضوع یہ ہے کہ ممبئی حملے بھارتی حکمران طبقے نے خود کروائے تھے۔ گویا وہ ”گمراہ کن حملے“ تھے جسے انگریزی اصطلاح میں ”فالز فلیگ حملہ“ (False Flag Attack) کہا جاتا ہے۔

جرمن محقق نے یہ نتیجہ اس سچائی سے بھی اخذ کیا کہ ممبئی حملوں کے فوراً بعد بھارتی میڈیا پاکستان کو مجرم قرار دینے لگا۔ یہ گمراہ کن منصوبے کی خاص نشانی ہے۔

گمراہ کن یا فالز فلیگ حملے کی تشریح یہ ہے: ایسا حملہ جسے ایک ملک کے سیکورٹی ادارے انجام دے کر اس کا ذمے دار کسی دشمن مملکت کو قرار دے دیں۔ ایسے حملے مخصوص مقاصد حاصل کرنے کی خاطر کیے جاتے ہیں۔ ایسا پہلا جعلی حملہ ۱۷۸۸ء میں سویڈش فوج نے کیا تھا۔

اس وقت سویڈن کی فوج روس پر حملہ کرنا چاہتی تھی مگر سیاسی حکومت اس اقدام کے مخالف تھی۔ تب سویڈش جرنیلوں نے ایک گمراہ کن حملہ کروا ڈالا۔۔۔ وہ یوں کہ سویڈن و روس کی سرحد پر واقع سویڈش چوکی جرنیلوں کے کارندوں نے تباہ کر دی۔ یہ کارندے روسی فوج کی وردی میں ملبوس تھے۔ اس واقعے کے بعد پورے سویڈن میں عام لوگ روس کے خلاف غم و غصے کا اظہار کرنے لگے۔ ایسی جوشیلی فضا میں آخر کار سویڈش حکومت نے اپنی فوج کو روس پر حملہ کرنے کی اجازت دے دی۔ یوں سویڈش فوج کا گمراہ کن حملہ کامیاب رہا اور اس نے اپنا مقصد حاصل کر لیا۔ بعد ازاں امریکی فوج نے خصوصاً بیسویں صدی میں فالز فلیگ اٹیک کیے اور اپنے مفادات پورے کرنے میں کامیاب رہی۔

بھارتی حکمران طبقے کے لیے بھی ایسے گمراہ کن حملے اجنبی شے نہیں۔ ۱۹۷۱ء میں بھارتی خفیہ ایجنسی، را کے ایجنٹوں نے کشمیری مجاہدین کا بہروپ بھرا، اپنی ہی انڈین ایئر لائن کا ”گنگا“ نامی طیارہ اغوا کیا اور اُسے لاہور لے گئے۔ اس ہائی جیکنگ کے ذریعے اوّل بھارتی حکمران پاکستان کو عالمی سطح پر بدنام کرنا چاہتے تھے۔ دوم اس واقعے کی بدولت انھیں یہ بہانہ مل گیا کہ وہ بھارتی سرزمین سے پاکستانی طیاروں کی آمد و رفت پر پابندی لگا دیں۔ اس پابندی کی وجہ سے ۱۹۷۱ء کی جنگ میں مغربی اور مشرقی پاکستان کے مابین رابطے بڑی مشکل سے برقرار رکھے گئے۔

مقبوضہ کشمیر میں بھی را کے ایجنٹوں نے گمراہ کن حملوں کی مدد ہی سے تحریک آزادی کو بہت صدمہ پہنچایا۔ ۱۹۹۲ء

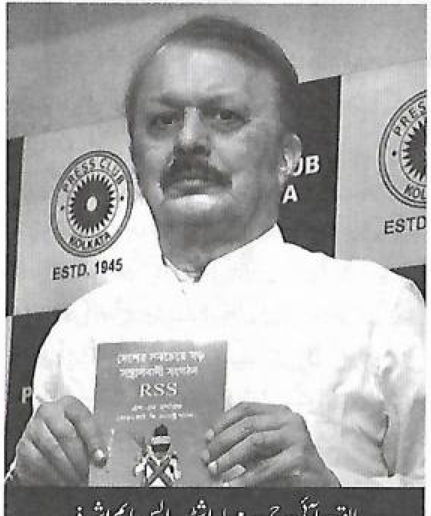

سابق آئی جی مہاراشٹر، ایس ایم اشرف

کے بعد را کے ایجنٹوں نے ہندو پنڈتوں اور سکھوں پر کئی حملے کیے اور انھیں جانی و مالی نقصان پہنچایا۔ را کی ایما پر ہی بھارتی میڈیا نے ان حملوں کا ذمے دار مجاہدین کو ٹھہرایا۔ ان حملوں کی وجہ سے آخر کار تحریک آزادی کشمیر میں شامل مختلف تنظیموں کے مابین پھوٹ پڑ گئی۔ مزید برآں شہریوں پر حملوں کی وجہ سے ہی کشمیری مجاہدین پر ''دہشت گرد'' ہونے کا ٹھپا بھی لگ گیا۔ مقبوضہ کشمیر میں تحریک آزادی کمزور کرنے کو را اپنی زبردست کامیابی قرار دیتی ہے۔

ایلسین ڈیوڈسن سے قبل ایک سابق بھارتی پولیس افسر، سید محمد اشرف بھی اپنی کتاب ''ہیمنت کرکرے کو کس نے قتل کیا؟'' میں یہ لکھ چکے کہ ممبئی حملوں میں بھارتی حکمران طبقہ ملوث تھا۔ وہ بھارتی خفیہ ایجنسی، انٹیلی جنس بیورو یا آئی بی کو ان حملوں کا ذمے دار قرار دیتے ہیں۔ سید محمد اشرف مہاراشٹر ریاست کے آئی جی پولیس رہ چکے جس کا صدر مقام ممبئی ہے۔ لہٰذا ان کے دعوے وزن رکھتے ہیں۔ جرمن محقق، ایلسین ڈیوڈسن اور ایس ایم اشرف نے اپنی کتب میں ممبئی حملوں کو بھارتی حکومت کا ''کارنامہ'' ثابت کرنے کے لیے جو شواہد، دلائل اور نکات دیے ہیں، وہ بھی میرے زیر مطالعہ رہے۔ مزید برآں بھارتی و پاکستانی پرنٹ میڈیا میں چھپے بیسوں مضامین بھی آنکھوں کے سامنے سے گزرے۔

یہ بھی نتیجہ نکالتے ہیں کہ ممبئی حملے بھارتی فوج کے ایک جرنیل ٹولے نے کروائے۔ اس ٹولے کو را اور آئی بی کے علاوہ انتہا پسند ہندو تنظیموں مثلاً آر ایس ایس (راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ) اور شیو سینا کے کارکنوں کی بھی مدد حاصل تھی۔ اس خفیہ آپریشن میں ممبئی پولیس کے بعض اعلیٰ افسر اور شاید چھوٹا راجن گینگ کے کارندے بھی شامل تھے۔

بھارتی فوج، را اور آئی بی جیسی خفیہ ایجنسیوں کی شمولیت کے باعث ہی یہ ممکن ہو سکا کہ ان کے کارندوں نے ساٹھ گھنٹوں تک جنوبی ممبئی میں قیامت مچائے رکھی اور دھڑلے سے اپنے ہی ہم وطنوں کو گولیاں مارتے رہے تاکہ اس خونی منصوبے کی شدت زیادہ سے زیادہ بڑھائی جا سکے۔

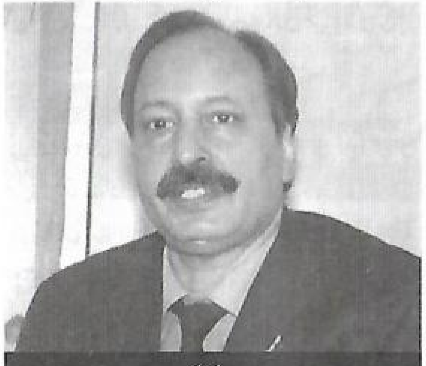

ہیمنت کرکرے

یہ کارندے انتہائی تجربے کار اور لڑائی بھڑائی میں طاق تھے۔ ممکن ہے کہ ان میں بھارتی فوج کے کمانڈو بھی شامل ہوں۔

جنوبی ممبئی میں قتل عام کرنے والے ان بھارتی دہشت گردوں کی تعداد کے متعلق قطعیت سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ تاہم ان کی تعداد دس سے خاصی زیادہ تھی۔ یہ یقینی ہے کہ ۲۶ نومبر کی رات بیس سے تیس دہشت گرد ممبئی میں خون کی ہولی کھیلتے رہے اور اس خوفناک قتال کا ذمہ منصوبے کے عین مطابق پاکستانیوں کے سر منڈھ دیا گیا۔

ممبئی حملوں کے منصوبے کو ممبئی پولیس کے نچلے افسروں سے پوشیدہ رکھا گیا۔ ظاہر ہے، اگر انھیں بھی منصوبے میں شامل کر لیا جاتا، تو نام نہاد حملہ آور پاکستانیوں سے 'مقابلہ' کون کرتا؟ اس گمراہ کن منصوبے کی کامیابی یقینی بنانے کے لیے زیادہ سے زیادہ عام لوگوں اور سپاہیوں کا مارے جانا ضروری تھا۔ چنانچہ اپنے مفادات پورے کرنے کی خاطر جرنیل ٹولے نے ہم وطنوں کا قتل عام بھی منظور کر لیا۔ ان کا فلسفہ یہی ہوگا کہ زیادہ پانے کی خاطر کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔ یا یہ کہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔

بھارتی فوج نے حملے کیوں کروائے؟

سوال یہ ہے کہ ممبئی حملوں کے ذریعے بھارتی جرنیل اور بھارتی خفیہ ایجنسیاں کیا مقاصد حاصل کرنا چاہتی تھیں؟ یہ جاننے کی خاطر آپ کو ۲۰۰۸ء میں پلٹنا ہوگا جب چار پانچ ماہ کے قلیل عرصے میں ایسے دو بڑے واقعات ظہور پزیر ہوئے جنھوں نے بھارتی فوج اور اس کے جرنیلوں کو ہلا کر رکھ دیا۔

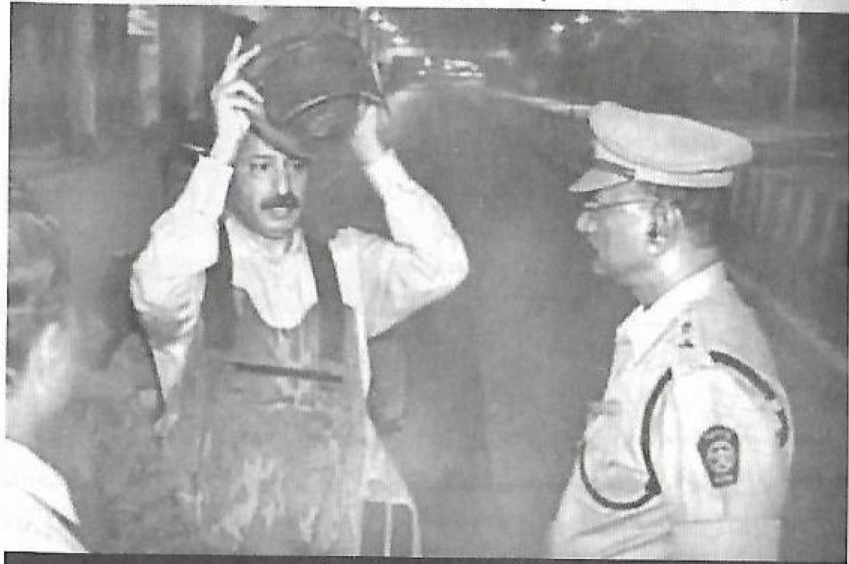

ہیمنت کرکرے بلٹ پروف جیکٹ پہنتے ہوئے

پہلے واقعے کا آغاز ۲۶ مئی کو ہوا۔ اس دن مقبوضہ کشمیر کی حکومت نے ۹۹ / ایکڑ زمین بھارتی حکومت کو دے ڈالی تاکہ وہ امرناتھ یاترا کو آئے ہندو یاتریوں کے لیے سرائیں اور ہوٹل وغیرہ تعمیر کر سکے۔ اس معاہدے کے خلاف جلد ہی وادیٔ کشمیر میں مسلمان زبردست مظاہرے کرنے لگے۔ چنانچہ یکم جولائی کو ریاستی حکومت نے معاہدہ منسوخ کر دیا۔

اب اس منسوخی کے خلاف جموں میں ہندو مظاہرے شروع ہو گئے۔ مظاہرین نے مسلمانوں پر حملے بھی کیے۔ جب ان حملوں کی اطلاع وادیٔ کشمیر تک پہنچی، تو وہاں پھر مسلمان غاصب ہندوؤں کے خلاف مظاہرے کرنے لگے۔ ماہ اگست میں سری نگر میں پانچ لاکھ کشمیری مسلمانوں نے مظاہرہ کیا۔ یہ کشمیر کی تاریخ کا سب سے بڑا احتجاجی مظاہرہ مانا جاتا ہے۔

حکومت نے تشدد و ظلم کا روایتی حربہ اختیار کرتے ہوئے مظاہرے ختم کرنا چاہے، تو بھارتی فوج اور مظاہرین کے مابین جھڑپیں ہونے لگیں۔ بھارتی سیکورٹی اداروں کی فائرنگ سے تقریباً ایک سو کشمیری شہید اور کئی سو زخمی ہوئے۔ ان جھڑپوں کی خبریں بھارتی، پاکستانی اور عالمی میڈیا نے شہ سرخیوں میں دیں۔

۲۰۰۸ء تک مقبوضہ کشمیر میں تحریک آزادی کا جوش و ولولہ خاصی حد تک سرد ہو چکا تھا۔ امریکی واقعہ نائن الیون کے بعد تقریباً سبھی ممالک میں آزادی پسندوں کو ''دہشت

گرد'' قرار دے دیا گیا تھا۔ اس نظریے کا اطلاق کشمیری مجاہدین پر بھی ہوا۔ چنانچہ کشمیری نوجوان جہادی تنظیموں میں شمولیت سے کترانے لگے۔ لیکن امرناتھ یاترا کو دی گئی زمین کے تنازع نے وادیٔ کشمیر میں تحریک آزادی کی بجھتی شمع روشن کر دی۔ ایک بار پھر کشمیری نوجوان پتھروں اور غلیلوں سے ٹینکوں کا مقابلہ کرنے لگے۔

بھارتی جرنیلوں کے نزدیک سب سے زیادہ تشویش ناک بات یہ تھی کہ وادی میں کشمیری نوجوانوں کی جہادی تنظیمیں پھر فعال ہو سکتی تھیں۔ ان میں سرفہرست لشکر طیبہ سے وابستہ تنظیمیں تھیں جن کے مجاہدین انتہائی دلیر اور گوریلا جنگ میں ماہر سمجھے جاتے تھے۔ بھارتی جرنیلوں کو یہ خبریں ملنے لگی تھیں کہ وادی میں یہ تنظیمیں پھر فعال ہو رہی ہیں۔ گویا لشکر طیبہ کا خوف ایک بار پھر ڈراؤنا خواب بن کر انھیں چمٹ گیا۔ انھیں یاد آنے لگا کہ ۱۹۸۸ء تا ۱۹۹۹ء لشکر طیبہ اور اس سے وابستہ کشمیری تنظیموں نے وادی میں بھارتی فوج کو تگنی کا ناچ نچائے رکھا تھا۔ وہاں لاکھوں فوجی تعینات کرنے پڑے جن کا روزانہ خرچ کروڑوں روپے تھا۔ چنانچہ ان کے سامنے یہ اہم مسئلہ آن کھڑا ہوا کہ وادیٔ کشمیر میں لشکر طیبہ اور دیگر جہادی تنظیموں کے پھیلاؤ کو کس طرح روکا جائے؟

مسلمانانِ بھارت کے خلاف بہت بڑی سازش

جب وادیٔ کشمیر میں عوام تحریک آزادی اور جہاد کی جانب مائل ہو رہے تھے تو ۲۹ ستمبر کو ہزاروں میل دور واقع ریاست مہاراشٹر کے شہر، مالیگاؤں میں دوسرے اہم معاملے نے جنم لیا۔ ہوا یہ کہ وہاں آباد مسلمان نماز پڑھ کر مسجد سے نکل رہے تھے کہ دو بم دھماکے ہو گئے۔ ان دھماکوں کی وجہ سے سات مسلمان شہید جبکہ سینکڑوں زخمی ہو گئے۔

اس وقت مہاراشٹر میں دہشت گردی کے واقعات کی چھان بین کرنے کی خاطر ایک خصوصی پولیس فورس ''اینٹی ٹیررسٹ اسکواڈ'' تشکیل دیا جا چکا تھا۔ ایک دیانتدار اور بہادر پولیس افسر، ہیمنت کرکرے اس فورس کا سربراہ تھا۔ اس کا رتبہ آئی جی پولیس کے برابر تھا۔ اس کے دو نائب، وجے سالسکر اور اشوک کامتے بھی اپنے اصول اور قانون پسندی کی وجہ سے پوری پولیس فورس مشہور تھے۔

اب ان تین افسروں کی زیر قیادت اینٹی ٹیرر اسکواڈ کے جاسوس مالیگاؤں بم دھماکوں کی تحقیقات کرنے لگے۔ تحقیق سے انکشاف ہوا کہ ایک بم جس موٹر سائیکل میں رکھا گیا تھا، وہ ایک سدھوی، پرگیا ٹھاکر سنگھ کی ملکیت تھا۔ یہ مشہور انتہا پسند ہندو تنظیم، وشوا ہندو پریشد کی لیڈر تھی۔ چنانچہ وسط اکتوبر ۲۰۰۸ء میں اُسے گرفتار کر لیا گیا۔

پرگیا ٹھاکر سے شروع ہونے والی تفتیش کے بعد دہشت گردی کے اس وسیع و عریض نیٹ ورک کی پرتیں کھلتی چلی گئیں، جو ۲۰۰۲ء سے کام کر رہا تھا۔ پرگیا کے قبضے سے دو لیپ ٹاپ برآمد ہوئے جن سے اہم معلومات ملیں۔ معلوم ہوا کہ بھارت میں تمام انتہا پسند ہندو تنظیموں کے کارکن و لیڈر اس نیٹ ورک سے منسلک تھے۔ یہ تنظیمیں اصطلاح میں ''سنگھ پریوار'' کہلاتی ہیں۔ آر آر ایس، بجرنگ دل، وشوا ہندو پریشد

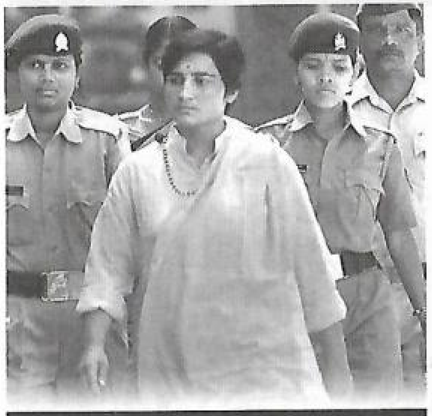

پرگیا ٹھاکر

وغیرہ اس کی بڑی جماعتیں ہیں۔ بی جے پی سنگھ پریوار کا سیاسی روپ ہے جو ۲۰۱۴ء سے بھارت میں حکومت کر رہا ہے۔

ہندو دہشت گردوں کے اس نیٹ ورک کے قیام کا صرف ایک مقصد تھا... یہ کہ مسلمانوں کے مذہبی و عوامی مقامات پر بم دھماکے کیے جائیں اور ان کا ذمے دار اسلامی تنظیموں کو ٹھہرایا جائے۔ چنانچہ نیٹ ورک سے منسلک ہندو دہشت گردوں نے کم از کم چودہ بم دھماکے کیے جن میں پربھانی بم دھماکا (۲۰۰۳ء)، جالنا بم دھماکا (۲۰۰۴ء)، پرنا بم دھماکا (۲۰۰۵ء) ممبئی ٹرین دھماکہ (۲۰۰۶ء)، مالیگاؤں دھماکہ (۲۰۰۶ء)، نندید دھماکہ (۲۰۰۶ء)، حیدر آباد مکہ مسجد دھماکہ (۲۰۰۷ء)، اجمیر شریف درگاہ بم دھماکہ (۲۰۰۷ء)، یوپی کی عدالتوں میں دھماکے (۲۰۰۷ء)، جے پور دھماکہ (۲۰۰۸ء)، دہلی بم دھماکہ (۲۰۰۸ء) اور مالیگاؤں دھماکے (۲۰۰۸ء) شامل ہیں۔

اہم ترین انکشاف یہ ہوا کہ بھارتی فوج کے حاضر فوجی افسر مثلاً لیفٹیننٹ کرنل پروہت اور میجر اپادھائے نہ صرف ہندو دہشت گردوں کو بم اور اسلحہ چلانے کی تربیت فراہم کرتے بلکہ انھیں سرکاری ڈپو سے اسلحہ بھی مہیا کیا جاتا۔ ظاہر ہے، وہ یہ کام بھارتی فوج کے جرنیلوں کی آشیر باد سے کر رہے تھے۔ فوج میں ''چین آف کمانڈ'' کے باعث اعلیٰ افسروں کی اجازت کے بغیر ماتحت معمولی سا کام بھی نہیں کر سکتے۔ اب ہیمنت کرکرے ان فوجی افسروں تک پہنچنے کی بھی تگ و دو کرنے لگے۔

تحقیق و تفتیش سے کرکرے ایک نہایت اہم انکشاف سامنے لانے میں کامیاب رہے۔ انھیں معلوم ہوا کہ لیفٹیننٹ کرنل پروہت نے آرمی ڈپو سے ۶۰ کلو آر ڈی ایکس (دھماکہ خیز اور آتش گیر مادہ) چرایا یا اُسے دیا گیا۔ یہ آر ڈی ایکس پھر فروری ۲۰۰۷ء میں سمجھوتا ایکسپریس میں آگ لگانے میں استعمال ہوا۔ اسی حادثے میں ۶۸ مرد، عورتیں اور بچے مارے گئے تھے جن میں اکثریت پاکستانیوں کی تھی۔

لیفٹیننٹ کرنل پروہت

بھارتی میڈیا نے حادثے کے فوراً بعد یہ اعلانیہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ دہشت گرد حملہ لشکر طیبہ نے کروایا۔ وجہ یہ گھڑی گئی کہ وہ سمجھوتا ایکسپریس بند کروانا چاہتی ہے، لیکن بھارت کے ہی ایک پولیس افسر کی تفتیش سے یہ سچ سامنے آ گیا کہ ریل میں ہندو دہشت گردوں نے آگ لگائی تھی اور جن کی سرپرستی اور مدد فوجی افسر کر رہے تھے۔

منصوبہ بنتا ہے

کرکرے کی چھان بین سے رفتہ رفتہ عیاں ہوا، کہ ہندو دہشت گردی کے اس نیٹ ورک سے کئی جرنیل نامی گرامی سیاستدان اور اعلیٰ سرکاری افسر وابستہ ہیں۔ اسی لیے پورے بھارت میں نہایت منظم طریقے سے مسلمانوں اور اسلام کے خلاف وسیع پیمانے پر سازشیں جاری تھیں۔ ان بم دھماکوں کے الزام میں سینکڑوں مسلم نوجوان اور مرد گرفتار کر لیے گئے جنھیں عقوبت خانوں میں بدترین تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ ساتھ ساتھ یہ پروپیگنڈا بھی ہوا کہ اسلام اور دہشت گردی لازم و ملزوم ہیں۔ یوں باقاعدہ منصوبہ بندی سے بھارت کے ہندو عوام میں مسلمان ہم وطنوں کے خلاف شدید نفرت و عداوت پیدا کی گئی۔ نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ آج بھارت میں معمولی

باتوں پر ہندو جمع ہو کر مسلمانوں کو بدترین تشدد کا نشانہ بنا ڈالتے ہیں۔ . . ایسا خوفناک تشدد جس کی ویڈیو دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

لیکن اکتوبر اور نومبر ۲۰۰۸ء میں ایک اصول پسند ہندو پولیس افسر، ہیمنت کرکرے نے انتہا پسند ہندوؤں کے دہشت گردانہ نیٹ ورک کا پردہ چاک کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جب بھی یہ پردہ ہٹتا، دنیا والوں کو علم ہو جاتا کہ بھارتی فوج کے جرنیل، نامور سیاسی لیڈر اور اعلیٰ سرکاری افسر اپنے مذموم مقاصد کی خاطر بے گناہ مسلمانوں اور دین اسلام کو نشانہ بنائے ہوئے ہیں۔ یوں بھارتی حکمران طبقے کا ایک بااثر اور طاقتور ٹولہ دنیا کے سامنے ننگا ہو جاتا۔ اس ٹولے میں جنرل وی کے سنگھ شامل ہو سکتا ہے جو بھارتی فوج کا چیف آف آرمی اسٹاف رہا ہے۔ آج کل بی جے پی نے اسے وزیر مملکت بنا رکھا ہے۔

جوں جوں ہیمنت کرکرے کی چھان بین آگے بڑھی اس ٹولے میں کھلبلی مچ گئی۔ ظاہر ہے، اگر پوری دنیا کو یہ بات پتا چل جاتی کہ انتہا پسند ہندو مسلمانوں کے خلاف دہشت گردی کا ایسا نیٹ ورک چلا رہے ہیں جس میں بھارتی فوج کے جرنیل، مشہور سیاست دان اور اعلیٰ سرکاری افسر شامل ہیں، تو بھارت کی جگ ہنسائی ہوتی۔ یہی نہیں، مغربی میڈیا نے اسلام اور مسلمانوں کا دہشت گردی سے جو لازم و ملزوم کا ناتا جوڑ رکھا تھا، وہ بھی کمزور پڑ جاتا اور دہشت گردی کے ساتھ ہندومت اور ہندوؤں کا بھی نام لیا جانے لگتا۔

اس کے بعد عالمی سطح پر بھارتی جرنیلوں پر یہ دباؤ بھی پڑ سکتا تھا کہ وہ مقبوضہ کشمیر سے اپنے لاکھوں فوجی واپس بلوا لیں۔ نیز اقوام متحدہ میں یہ مطالبہ سامنے آ جاتا کہ مقبوضہ کشمیر میں رائے شماری کروائی جائے تاکہ کشمیری عوام اپنی قسمت کا فیصلہ خود کر سکیں۔

غرض مقبوضہ کشمیر کی صورت حال کے بعد اب ہیمنت کرکرے کی چھان بین نے بھارتی حکمران طبقے میں شامل اسلام اور پاکستان دشمن طاقتور و بااثر ٹولے کو بڑی مشکل و مصیبت میں ڈال دیا۔ اب ضروری ہو گیا کہ کرکرے کی چھان بین کسی بھی طرح روکی جائے اور اگر وہ قانون کی راہ ترک نہیں کرتا تو اُسے اپنی راہ سے ہٹا دیا جائے۔

بھارتی اخبارات کی بعض رپورٹیں گواہ ہیں کہ اس طاقتور ہندو ٹولے نے شروع میں ہیمنت کرکرے کو پُرکشش ترغیبات دیں تاکہ وہ دہشت گردی کے نیٹ ورک کو بے نقاب نہ کریں۔ جب کرکرے نے مادی ترغیبات ٹھکرا دیں تو حکمران ٹولے کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اب وہ کرکرے اور ان کے ساتھیوں کو راہ سے ہٹانے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔

مسئلہ یہ تھا کہ ہیمنت کرکرے معمولی شخصیت نہیں تھے۔ وہ ایک ایماندار پولیس افسر کی حیثیت سے بھارت بھر میں مشہور تھے۔ پھر ہندو دہشت گردوں کا نیٹ ورک طشت از بام کرنے پر وہ مسلمانان بھارت کے ہیرو بن گئے تھے۔ وہ انھیں اپنا مسیحا سمجھنے لگے۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ ان کی تفتیش نے ثابت کر دیا کہ جن بم دھماکوں کے بعد کئی سو مسلمان نوجوان ''دہشت گرد'' قرار دے کر پکڑے گئے تھے، وہ انتہا پسند ہندوؤں نے انجام دیے تھے۔

اس صورت حال میں جرنیلوں، سیاست دانوں اور سرکاری افسروں پر مشتمل طاقتور ٹولہ ہیمنت کرکرے کو قتل کروا دیتا، تو بھارتی عوام نے انہی پر شک کرنا تھا۔ چونکہ حکومت کانگریس کے قبضے میں تھی لہٰذا سیکولر و لبرل کانگریسی وزرا و سیاست داں بدلتے حالات سے فائدہ اٹھاتے اور زیادہ طاقتور اور اثر رسوخ والے ہو جاتے۔ چنانچہ کرکرے کو قتل کی خاطر ایسے پلان کی ضرورت تھی جس سے سانپ مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

اسی سوچ نے آخرکار ممبئی حملوں کے شاطرانہ اور خوفناک پلان کو جنم دے ڈالا۔ یہ منصوبہ سرعت سے بنایا گیا کیونکہ وقت کم تھا۔ ہیمنت کرکرے نے ناستک عدالت میں پہلا

مقدمہ دائر کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جب یہ بات منظر عام پر آئی، تو انتہا پسند ہندو لیڈر لٹھ لے کر ان کے پیچھے پڑ گئے۔ ایڈوانی، نریندر مودی اور دیگر قوم پرست لیڈروں نے کرکرے کو ''دیش دروھی'' (غدار) قرار دیا۔ شیوسینا کے سربراہ، بال ٹھاکرے نے جماعت کے رسالے میں لکھا:

''غدار کرکرے نے تہیہ کر لیا ہے کہ وہ بھارت کو پوری دنیا میں بدنام کر کے چھوڑے گا۔ ہم اس پر تھوکتے ہیں، تھوکتے ہیں، اب وقت آ گیا ہے کہ ہندومت اور ہندو قوم کی حفاظت کے لیے خودکش اسکواڈ تیار کیے جائیں۔ صرف انھی کے ذریعے ہندو جاتی کا تحفظ ممکن ہے۔''

۶ دسمبر ۲۰۱۰ء کو دی انڈین ایکسپریس میں تب بھارتی سیاسی جماعت، کانگریس کے جنرل سیکرٹری، ڈگوجے سنگھ کا ایک بیان شائع ہوا۔ انھوں نے انکشاف کیا کہ ممبئی حملے شروع ہونے سے دو گھنٹے قبل کرکرے نے انھیں فون کر کے بتایا تھا کہ ان کو قتل کی دھمکیاں مل رہی ہیں اور یہ کہ ان کی زندگی کو شدید خطرات لاحق ہو چکے۔ اسی طرح بھارتی میڈیا میں یہ خبریں بھی آ چکیں کہ نامعلوم افراد نے ممبئی حملوں سے دو دن قبل مختلف اخباری دفاتر میں فون کر کے یہ اطلاع دی تھی کہ عنقریب ہیمنت کرکرے کو نشانۂ عبرت بنا کر قتل کر دیا جائے گا۔

غرض کرکرے نے کسی دباؤ کے آگے سر نہ جھکایا، تو اس کا سر قلم کرنے کا فیصلہ ہو گیا، لیکن ان کے قتل کا یہ پلان اس طریقے سے وضع ہوا کہ ایک تیر سے کئی شکار کر لیے جائیں۔

مگر یہ منصوبہ کافی پھرتی سے راتوں رات بنایا گیا، اسی لیے نہ چاہتے ہوئے بھی پلان میں خاصے جھول رہ گئے اور خاص طور پر ہیمنت کرکرے کا قتل نہایت پُراسرار واقعہ بن گیا۔ اس واقعے نے بھی بظاہر غلطی سے پاک خفیہ منصوبے یا فالز فلیگ اٹیک کو مشکوک بنا دیا۔

پاکستان کو ملوث کرنے کا اعلیٰ منصوبہ

بھارتی فوج کی ملٹری ایجنسی، را اور آئی بی کے کرتا دھرتاؤں نے گمراہ کن منصوبہ یہ بنایا کہ ہیمنت کرکرے کے قتل میں لشکر طیبہ اور پاک فوج کی مشہور زمانہ خفیہ ایجنسی، آئی ایس آئی کو ملوث کر دیا جائے۔ اس طرح خود بخود پاکستان کی بھی عالمی سطح پر بدنامی ہو جاتی۔ دنیا والوں کے سامنے منصوبے کا خاکہ کچھ یوں پیش کیا گیا:

مظفر آباد (آزاد کشمیر) میں ۲۴ سے ۲۶ فدائین کو گوریلا جنگ لڑنے کی تربیت دی گئی۔ یہ تربیت پاک فوج کے سابق و حاضر افسروں اور لشکر طیبہ سے منسلک گوریلوں کی زیر قیادت انجام پائی۔ بعد ازاں ۱۰ فدائین منتخب ہوئے جنھیں زیادہ سخت عسکری تربیت سے گزارا گیا۔

مقررہ وقت پاک بحریہ کے کسی جہاز نے انھیں ممبئی کے قریب سمندر میں بھارتی مچھیروں کی ایک کشتی تک اتار دیا۔ انھوں نے مچھیروں کو قتل کر کے ان کے ٹرالر پر قبضہ کر لیا۔ جب ممبئی کا ساحل قریب آیا، تو وہ ربڑ سے بنی کشتی پر بیٹھ کر وہاں تک پہنچ گئے۔

ساحل پر اتر کر وہ دو دو فدائین کی صورت پانچ ٹکڑیوں میں بٹ گئے۔ انھوں نے پھر دو فائیو سٹار ہوٹلوں، ریلوے

داؤد گیلانی المعروف بہ ڈیوڈ ہیڈلے

اسٹیشن، یہودی سینٹر اور ایک کیفے میں شہریوں اور سپاہیوں کو نشانہ بنایا۔ ان کے حملوں میں ۱۶۶ افراد مارے گئے جبکہ چھ سو سے زائد زخمی ہوئے۔ مقتولین میں ۱۳۷ بھارت، ۶ امریکا، ۴ اسرائیل، ۳ جرمنی اور دو دو کینیڈا و آسٹریلیا سے تعلق رکھتے تھے۔

یہ دہشت گرد ساٹھ گھنٹوں تک قتل غارت کرتے رہے۔ ان میں سے نو آخر کار مارے گئے مگر کرشماتی طور پر ایک دہشت گرد، اجمل قصاب زندہ گرفتار کرلیا گیا۔ اکتوبر ۲۰۰۹ء میں امریکی خفیہ ایجنسی ایف بی آئی نے شگاگو میں ایک پاکستانی نژاد امریکی، سید داؤد گیلانی المعروف ڈیوڈ کولمین ہیڈلے کو گرفتار کیا۔ ڈیوڈ پر الزام لگایا گیا کہ اس نے امریکی یہودی کے بھیس میں ممبئی جا کر پاکستانی دہشت گردوں کے لیے ٹارگٹوں کی تصاویر کھینچی تھیں اور وڈیو فلمیں اُتاریں۔

اجمل قصاب پر مقدمہ چلا اور نومبر ۲۰۱۲ء میں اُسے مجرم بنا کر پھانسی دے دی گئی۔ ڈیوڈ کولمین پر امریکی عدالت میں مقدمہ چلا۔ جنوری ۲۰۱۴ء میں ممبئی حملوں میں حصّہ لینے پر اُسے پینتیس سال کے لیے جیل بھجوا دیا گیا۔

ممبئی حملوں کے بارے میں بھارت کا سرکاری ورژن یا بیان انھی دو ''مجرموں'' کے اعترافات و بیانات پر مبنی ہے۔

جب ممبئی حملے انجام پائے، تو حکومت پاکستان اور جماعت الدعوہ نے ان سے اظہار لاتعلقی کیا۔ بعدازاں عالمی دباؤ کے باعث پیپلز پارٹی کی حکومت نے سات پاکستانی گرفتار کر لیے۔ ان پر ''شک'' تھا کہ انھوں نے ممبئی حملے انجام دینے میں حصّہ لیا ہے۔ ساتوں پاکستانیوں پر عدالتوں میں مقدمے چلے مگر پولیس انھیں مجرم ثابت نہیں کرسکی۔

جرمن محقق نے اپنی کتاب تحریر کرتے ہوئے تحقیق کی بنیاد بجا طور پر ایک قانونی نکتے ''کوئی بونو'' (Cui Bono) پر رکھی۔ لاطینی زبان کی اس اصطلاح کے معنی ہیں: فائدہ کسے ہوا؟ گویا دوران تحقیق الیسن ڈیوڈ اس کھوج میں رہا کہ ممبئی حملے انجام پانے سے فائدہ کسے ملا۔ اسی نکتے نے افشا کیا کہ ممبئی حملے دراصل بھارتی حکمران طبقے سے تعلق رکھنے والے ایک طاقتور گروہ کی ایسی زبردست سازش تھی جس کے ذریعے بیک وقت کئی مقاصد حاصل کر لیے گئے۔ ان مقاصد کا تذکرہ درج ذیل ہے:

☆ عوام والوں کی توجہ مقبوضہ کشمیر سے ہٹ جائے جہاں کشمیری وسیع پیمانے پر بھارت کے خلاف احتجاجی مظاہرے کر رہے تھے اور تحریک آزادی کشمیر کے تن مردہ میں نئی جان پڑ رہی تھی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ممبئی حملے ہوتے ہی نہ صرف مقبوضہ کشمیر کے احتجاجی مظاہرے پس منظر میں چلے گئے بلکہ غاصب و ظالم بھارتی حکومت کو معصوم اور ستم رسیدہ سمجھا جانے لگا جو مسلم دہشت گردوں کے نشانے پر تھی۔

☆ اینٹی ٹیررسٹ اسکواڈ کے تینوں اصول پرست افسر، ہیمنت کرکرے، سالسکر اور اشوک کامتے صفحہ ہستی سے مٹ جائیں تاکہ ہندو دہشت گردوں کا وہ نیٹ ورک طشت از بام نہ ہو سکے جس کی سرپرستی بھارتی فوج کے جرنیل، اعلیٰ سرکاری افسر اور مشہور سیاستدان کر رہے تھے۔

☆ اسلام کو بحیثیت مذہب بدنام کیا جا سکے اور دکھایا جائے کہ مسلمان جنگجو، جھگڑالو اور پس ماندہ ہیں۔ مغربی میڈیا پہلے ہی یہ پروپیگنڈا کر رہا تھا۔

☆ نام نہاد دہشت گردی کا ہوا دکھا کر بھارتی عوام کو خوفزدہ کیا جائے تاکہ مسلمانوں خصوصاً کشمیری عوام کو شکنجے میں کس لینے والے سخت اور ظالمانہ قوانین وضع کیے جا سکیں۔

☆ بھارت مغربی دنیا یعنی امریکا و برطانیہ کے قریب ہو جائے۔ چنانچہ آج بھارت امریکی و اسرائیلی اسلحے کا بہت بڑا خریدار بن چکا۔

☆ بھارتی افواج کے جنگی بجٹ میں اضافہ ہو سکے۔ ۲۰۰۸ء سے ہر سال بھارتی فوج کے بجٹ میں محیر العقول اضافہ ہو رہا ہے۔ یہی نہیں، پولیس اور دیگر سیکورٹی اداروں کو بھی پہلے سے کہیں زیادہ رقم ملتی ہے۔

پاکستانی میڈیا میں چھپے غدار

دوسری طرف ممبئی حملوں سے پاکستان، پاک افواج اور جماعت الدعوہ تینوں کو زبردست نقصان پہنچا۔ بھارت اور پوری دنیا میں پاکستان کو دہشت گردی کروانے والا ملک سمجھا جانے لگا۔ یہ ٹھپا ابھی تک وطن عزیز پر سے اُتر نہیں سکا۔ پاک فوج کو بھی دہشت گردی کروانے والی فورس سمجھا گیا۔ بلکہ جماعت الدعوہ کا تو نام ونشان مٹ چکا اور اس کی ساری سماجی و فلاحی سرگرمیاں ختم کر دی گئیں۔ غرض ان حملوں سے پاکستان کو ایک بھی ایسا فائدہ نہیں ہوا جسے بیان کیا جا سکے۔

فرض کر لیجیے کہ یہ ممبئی حملے لشکر طیبہ نے پاک فوج کے سابق افسروں کی مدد سے انجام دیے۔ سوال یہ ہے کہ انھیں یہ حملے کروانے سے کیا حاصل ہوا؟ کیا یہ پاکستانی بھارتی عوام پر بے دریغ فائرنگ کروا کر بھارت میں خوف و دہشت کا ماحول پیدا کرنا چاہتے تھے؟ مگر اس عمل سے تو بھارتی عوام پاکستان کے شدید مخالف ہو جاتے اور ایسا ہی ہوا۔ مزید برآں اس دہشت گردی سے مقبوضہ کشمیر میں جاری تحریک آزادی کو بھی نقصان پہنچتا کہ وہ بھارتی عوام کی حمایت سے محروم ہو جاتی۔

ایک نظریہ یہ ہے کہ جب بھی پاکستان اور بھارت کے تعلقات میں بہتری آئے تو جہادی تنظیمیں بھارت میں دہشت گردی کا بڑا واقعہ انجام دے ڈالتی ہیں۔ مدعا یہ ہوتا ہے کہ تعلقات دوبارہ خراب ہو جائیں۔ لیکن نومبر ۲۰۰۸ء تک پاک بھارت کشیدہ ہو چکے تھے۔ وجہ یہ ہے کہ امریکا پاکستان سے ناتا توڑ کر بھارت کی سمت جھکنے لگا تھا۔ اسی نئے کھیل کے باعث تینوں ممالک کے تعلقات تناؤ کا شکار تھے۔

اگر لشکر طیبہ کے فدائین ریاست گجرات میں نریندر مودی حکومت کو نشانہ بناتے، تو حملے کرنے کا مقصد سمجھ میں آتا ہے لیکن ممبئی میں ہوٹلوں حتیٰ کہ غریبوں کے ایک اسپتال کو نشانہ بنا کر نام نہاد پاکستانی دہشت گرد کس قسم کے مفاد حاصل کرنا چاہتے تھے؟ یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے۔

ایس ایم اشرف، الیسن ڈیوڈسن اور بھارت کے دیگر غیر جانبدار صحافیوں نے اپنی تحقیقات میں ممبئی حملوں کی بابت بھارتی حکومت کی سرکاری داستان پر کئی اعتراضات اٹھائے ہیں۔ بھارتی میڈیا یہ اعتراضات پوشیدہ رکھنے کی سرتوڑ کوشش کرتا ہے۔ ظاہر ہے، ان کے عام ہونے سے بھارتی طاقتور ٹولے کے گمراہ کن منصوبے کا پردہ چاک ہو جائے گا۔ اسی لیے بھارتی میڈیا نے دونوں محققوں کی کتب کا بلیک آؤٹ کر رکھا ہے۔ کسی بھی مشہور اخبار یا ویب سائٹ میں ان کتب کا تذکرہ موجود نہیں۔

حیرت انگیز اور چشم کشا بات یہ کہ پچھلے دس برس کے دوران پاکستان کے کسی بھی اخبار یا رسالے میں کوئی ایسا تفصیلی مضمون شائع نہیں ہوا جس میں ممبئی حملوں کی بھارتی سرکاری داستان میں ملنے والے جھول اور خلا آشکارا کیے گئے ہوں۔ یہ حقیقت عیاں کرتی ہے کہ پاکستانی میڈیا میں بھی بھارتی حکمرانوں اور خفیہ ایجنسیوں کے ایجنٹ موجود ہیں۔ ان ایجنسیوں کی سعی ہوتی ہے کہ وہ پاکستان کو تو کسی بھی طرح بدنام کرتے پھریں جبکہ بھارت گنگا میں ڈھلی مملکت قرار دیا جائے۔ یہی وہ ایجنٹ ہیں جنھوں نے ۲۰۰۸ء میں یہ ثابت کرنا چاہا تھا کہ اجمل قصاب نامی دہشت گرد پاکستان سے تعلق رکھتا ہے۔ حالانکہ یہ امر تصویر کا صرف ایک رخ تھا۔ دوسرا رخ آگے بیان ہوگا۔

یہی وجہ ہے، پاکستان میں آج بھی ایک بڑا طبقہ یہی سمجھتا ہے کہ ممبئی حملے آئی ایس آئی نے لشکر طیبہ کی وساطت سے کروائے۔ حالانکہ ان حملوں کا ایک بڑا مقصد دنیا بھر میں پاک افواج کو بدنام کرنا تھا۔ اس مضمون میں راقم نامور دانشوروں اور محققوں کے اٹھائے گئے اعتراضات تفصیل سے پیش کر رہا ہے تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو سکے اور کم از کم اہل وطن کو علم ہو کہ دس سال قبل ایک طاقتور بھارتی حکمران ٹولے نے پاکستان کے خلاف نہایت عیاری و مکاری

سے گھناؤنا کھیل کھیلا تھا۔ انھوں نے ثابت کر دیا کہ وہ عیار چانکیہ کے حقیقی پیروکار ہیں۔

مزید آگے بڑھنے سے قبل چند حقائق سامنے لانے ضروری ہیں۔ بیسویں صدی میں مصر اور فلسطین میں علماء کے ایسے طبقے نے جنم لیا جنھوں نے نہتے غیر مسلم شہریوں پر حملے جائز قرار دیے۔ تاہم یہ ایک متنازع معاملہ رہا کیونکہ سنت نبوی ﷺ اور اسلامی جنگی قوانین کی رو سے نہتے غیر مسلم شہریوں پر حملے ناجائز ہیں۔ بہرحال القاعدہ اور اس سے وابستہ بعض تنظیمیں غیر مسلم شہریوں کو نشانہ بنانے لگیں۔ اس عمل سے بہر حال دنیائے مغرب ہی نہیں عالم اسلام میں بھی انھیں تنقید کا نشانہ بننا پڑا۔

افغان جہاد کے دوران لشکر طیبہ اور القاعدہ کے مابین ربط ضبط تھا۔ جب ۱۹۸۸ء کو مقبوضہ کشمیر میں تحریک آزادی کا آغاز ہوا، تو تب دونوں تنظیمیں کشمیری مجاہدین کی ہر ممکن مدد کرنے لگیں، لیکن امریکا میں واقعہ نائن الیون کے بعد القاعدہ اور لشکر طیبہ کی راہیں جدا ہو گئیں۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ حافظ محمد سعید اور ان کے رفقاء اسلامی جنگی قوانین کی رو سے نہتے غیر مسلم شہریوں کو نشانہ بنانے کے حق میں نہیں تھے۔ ان کی توجہ کا مرکز مقبوضہ کشمیر میں کشمیری مسلمانوں پر ظلم و ستم ڈھاتی بھارتی فوج و پولیس تھی۔

اس لیے یہ تصوّر کرنا بھی محال ہے کہ لشکر طیبہ سے وابستہ جنگجوؤں نے ممبئی پہنچ کر ہوٹلوں، ریلوے اسٹیشن، اسپتال اور سڑکوں پر اندھا دھند، وحشیانہ طریقے سے گولیاں چلائیں اور نہتے شہری مار ڈالے۔ یہ کام انتہا پسند ہندو دہشت گرد ہی کر سکتے تھے جنھیں اپنے گمراہ کن پلان کو کامیاب بنانے کی خاطر زیادہ سے زیادہ شہری قتل کرنے تھے۔

اجمل اور اسماعیل، سی سی ٹی وی کیمرے کی تصویر

اصلی سے نقلی اجمل قصاب تک

بھارت کے سرکاری بیان کی رو سے ممبئی حملوں کے مرتکب نو پاکستانی دہشت گردوں کو بھارتی فوج اور پولیس سے مقابلے کرتے ہوئے مارے گئے مگر کرشماتی طور پر ایک دہشت گرد، محمد اجمل امیر قصاب زندہ پکڑ لیا گیا۔ اجمل بھارت کے واقعہ نائن الیون میں مرکزی کردار کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اجمل کا بیان ہی ہے جس کے ذریعے بھارتی حکومت نے ممبئی حملوں کے متعلق اپنا سرکاری خاکہ یا بیان تیار کیا، اگر اجمل ہی مشکوک شخصیت قرار پا جائے تو بھارتی حکومت کی سرکاری داستان کی دھڑن تختہ ہو جاتا ہے۔ ایس ایم اشرف کی کتاب نے کچھ ایسا ہی کیا۔

ایس ایم اشرف نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ مصدقہ ذرائع کے مطابق را کے ایجنٹوں نے ممبئی حملوں سے قبل نیپال سے اجمل قصاب کو گرفتار کیا اور پھر اُسے بھارت لا کر کسی نامعلوم مقام پر قید کر دیا۔ یہ انکشاف ممبئی حملوں کی ساری قلعی کھول دیتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ محمد اجمل نیپال میں کیا کر رہا تھا؟ یہ پاکستانی نوجوان فرید کوٹ نامی ایک قصبے کا رہائشی تھا۔ اس کا باپ نہایت غریب تھا۔ وہ گلیوں میں گھوم پھر کر کھانے پینے کی اشیاء فروخت کرتا تھا۔ غربت کے باعث اکثر اجمل اور باپ کا جھگڑا رہتا۔ جھگڑے کے بعد اجمل گھر سے بھاگ جاتا اور کئی دن بعد ہی واپس آتا۔

ایک دن اجمل گھر سے ایسا بھاگا کہ پھر پلٹ کر نہیں آیا۔ یہ یقینی ہے کہ اس دوران پاکستان میں چھپے را کے ایجنٹ اُسے پُرکشش ملازمت دلوانے کا جھانسا دے کر نیپال لے گئے یا یہ بھی ممکن ہے کہ وہ منہ مانگا معاوضہ دے کر ایک پاکستانی نوجوان کو را کا ایجنٹ بنانے میں کامیاب رہے۔ وہ پھر نیپال کے راستے اُسے بھارت لے گئے تا کہ اسے جاسوسی کی تربیت دے سکیں۔

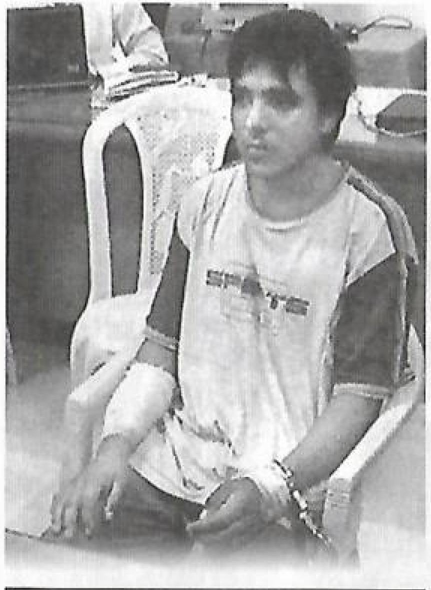

اجمل قصاب دوران مقدمہ

اجمل قصاب را کے قبضے میں تھا کہ ممبئی حملے انجام دینے کا پلان بن گیا۔ منصوبے کے مطابق فیصلہ ہوا کہ اس بدھو اور جاہل پاکستانی نوجوان کو قربانی کا بکرا بنا دیا جائے۔ چنانچہ اس کے قد کاٹھ اور صورت شکل سے ملتے جلتے ہندو نوجوان کو بذریعہ پلاسٹک سرجری اور میک اپ اجمل قصاب کی صورت دی گئی۔ اسی نقلی اجمل قصاب نے ممبئی ریلوے اسٹیشن میں شہریوں پر بے دریغ گولیاں چلائیں۔ یہی نقلی اجمل قصاب اپنے ساتھی، ابو اسماعیل کی معیت میں سی سی ٹی وی کیمروں کی ویڈیو میں بھی آ گیا۔ یہ بھی پلان کا حصّہ تھا تا کہ دونوں پاکستانی دہشت گردوں کی ویڈیو بن جائے اور ایک ٹھوس ثبوت دنیا والوں کو دکھایا جا سکے۔

جب ہیمنت کرکرے اپنے ساتھیوں سمیت مارے گئے تو یہ نقلی اجمل قصاب غائب کر دیا گیا جبکہ اصلی اجمل قصاب

کی پولیس گرفتاری دکھا دی گئی۔ یوں ممبئی حملے اپنے مقاصد خاصی حد تک حاصل کرنے میں کامیاب رہے اور انتہا پسند ہندو ٹولے کو اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی خاطر اجمل قصاب کی شکل میں قربانی کا بکرا بھی مل گیا۔ اجمل کی زبانی پھر پاک فوج اور لشکر طیبہ کو جی بھر کر معطون کیا گیا۔

یہ ضروری تھا کہ اجمل قصاب کو کسی سے تنہائی میں ملنے نہ دیا جائے ورنہ وہ سچائی اُگل سکتا تھا۔ را کے ایجنٹوں نے اجمل پر تشدد کر کے اور ڈرا دھمکا کر اُسے بے ضرر بنا دیا تھا۔ پھر بھی ممبئی حملے انجام دینے والے طاقتور ٹولے کو خطرہ تھا کہ اجمل قصاب کسی بھی وقت سچ بول سکتا ہے۔ اسی لیے اجمل پر مقدمہ نہایت خفیہ انداز میں چلایا گیا۔ بس اجمل کا بیان ہی سب کے سامنے آیا جو دراصل طاقتور ٹولے نے تیار کیا تھا۔ یہ بیان سراسر جھوٹ اور دھوکے پر مبنی ہے۔

اوائل میں ممبئی کے ایک مسلمان وکیل، عباس کاظمی اجمل قصاب کے وکیل بنے تھے۔ وہ بتاتے ہیں ''مجھے کبھی اجمل کے ساتھ تنہائی میں بات کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ جب بھی میں اجمل سے ملاقات کرتا تو تین چار سپاہی

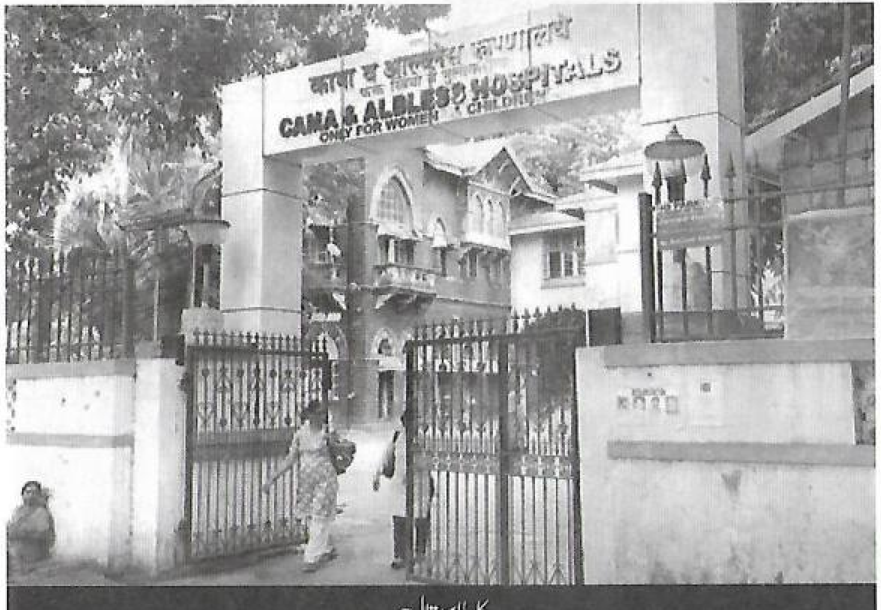

کاما اسپتال

ہمارے ساتھ ہوتے۔ ایک بار اجمل نے مجھے کہا، میں بالکل بے قصور ہوں۔ مجھے پھنسایا گیا ہے مگر یہ جیل بھی ان کی ہے، یہ جج بھی ان کا ہے، سرکاری وکیل بھی ان کا ہے اور میرا وکیل بھی ان کا ہے۔ میں یہاں بالکل تنہا ہوں۔''

جب عباس کاظمی نے عدالت پر زور دیا کہ انھیں اجمل سے تنہائی میں ملنے کی اجازت دی جائے، تو انھیں تبدیل کر دیا گیا۔ اب ایک ہندو کو اجمل کا وکیل بنایا گیا۔ اس کے بعد عدالت نے اپنی کارروائی صرف بیس دن میں نہایت تیزی سے مکمل کرتے ہوئے اجمل کو سزائے موت سنا دی۔

اس امر سے افشا ہے کہ بھارتی جج بھی فوج و خفیہ ایجنسیوں کی ہدایات پر عمل کر رہے تھے۔ یوں انھوں نے قانون و انصاف کا خون کر دیا۔

اجمل پر چلنے والے مقدمے کی کارروائی اب تک خفیہ ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ دوران مقدمہ کس قسم کے انکشاف سامنے آئے۔ بس بھارتی حکومت اجمل قصاب کی زبان سے پاکستان اور دنیا والوں کو جو کچھ بتاتی رہی، اُسے ہی ''سچ'' قرار دیا گیا۔ بھارت نے حتیٰ کہ پاکستان کے تفتیش کاروں کو بھی اجمل قصاب سے ملنے نہیں دیا... یہ سچائی آشکارا کرتی ہے کہ بھارتی فوج کو یقین تھا اگر اجمل قصاب کو دنیا والوں کے سامنے لایا گیا، تو بھارت کے گمراہ کن منصوبے کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔

بھارت نے نو مقتول دہشت گردوں کے نام تو اجمل قصاب کی وساطت سے پیش کر دیے مگر یہ نہیں بتا سکا کہ وہ پاکستان کے کن شہروں یا قصبوں میں بستے تھے۔ ان نو دہشت گردوں کا پوسٹ مارٹم بھی نہیں ہوا اور کوئی یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ کہاں دفن ہیں۔ گویا یہ نو مقتول انتہائی پُراسرار ہستیاں ہیں جن کی حقیقت کے بارے میں صرف بھارتی حکمران طبقے کا ایک گروہ ہی جانتا ہے۔ اسی طرح جب اجمل قصاب کو پھانسی دی گئی، تو اس کی لاش بھی خفیہ طریقے سے نامعلوم مقام پر دفنا دی گئی۔ چونکہ یہ سارا گمراہ کن منصوبہ تھا لہٰذا یہ ممکن ہے کہ اجمل قصاب اب بھی زندہ اور بھارتی فوج کی کسی کال کوٹھڑی میں اپنی زندگی کے بقیہ دن گزار رہا ہو۔

دہشت گردوں کی تعداد بھی محل نظر ہے۔ ۲۷ نومبر ۲۰۰۸ء کو ممبئی کے بعض مقامی اخبارات نے یہ خبریں شائع کی تھیں کہ مختلف مقامات پر کل ۱۶ سے ۲۰ دہشت گرد دیکھے گئے ہیں۔ بھارتی حکومت کے مطابق اجمل نے بھی گرفتاری کے بعد پہلے بیان میں دعویٰ کیا تھا کہ ممبئی پر ۱۶ فدائین نے حملہ کیا ہے لیکن پھر ان کی تعداد گھٹتے گھٹتے دس تک رہ گئی۔

لیفٹیننٹ کرنل (ر) محمد حبیب کی گمشدگی

یاد رہے، نیپال روایتی طور پر بھارت کی کٹھ پتلی مملکت رہی ہے۔ اس ملک میں بھی بھارتی خفیہ اداروں کا سکہ چلتا ہے۔ اجمل قصاب کے اغوا سے ملتا جلتا ڈراما حال ہی میں را کے ایجنٹوں نے بڑی عیاری سے کھیلا۔ ہوا یہ کہ را کے ایجنٹ اپریل ۲۰۱۷ء میں پاک فوج کے ریٹائرڈ افسر، لیفٹیننٹ کرنل محمد حبیب ظاہر کو پُرکشش ملازمت کا جھانسا دے کر نیپال لے گئے۔ وہاں انھیں اغوا کر لیا گیا اور اب تک کسی کو علم نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ خیال ہے کہ مستقبل میں را انھیں اپنے کسی عیارانہ اور مذموم منصوبے میں استعمال کر سکتی ہے۔

انیتا ادھائے جس نے دہشت گردوں کو دیکھا

لیفٹیننٹ کرنل محمد حبیب جانی پہچانی شخصیت تھے۔ اس لیے ان کا اغوا میڈیا کی نظر میں آ گیا مگر اجمل قصاب ایک عام سا پاکستانی نوجوان اور گھر چھوڑ کر بھاگنے والا بھگوڑا تھا۔ اس کے لیے کس نے فکر مند ہونا تھا؟ اس لیے نیپال میں اجمل کا اغوا کسی کے نوٹس میں نہیں آیا۔

بھارتی حکومت کے مطابق پاکستانی دہشت گردوں نے کیفے لیوپولڈ، تاج محل ہوٹل، اوبرائے ٹرائڈینٹ ہوٹل، نریمان ہاؤس، چھترپتی شیواجی مہاراج نامی ریلوے اسٹیشن اور کاما اسپتال کو اپنا نشانہ بنایا۔ یہ سبھی جنوبی ممبئی کے علاقے میں واقع ہیں۔ ان کے علاوہ بعض دوسری جگہوں پر بھی دہشت گردوں اور پولیس کے مابین مقابلے ہوئے۔

جیسا کہ پہلے بتایا گیا، بھارتی سیکورٹی اداروں نے اجمل کی زبانی ممبئی حملوں کی کہانی بیان کی ہے۔ گو ان حملوں کا پلان فوج، را اور آئی بی کے اعلیٰ دماغوں نے ہی بنایا لیکن مجرم کتنا ہی ہوشیار و عیار ہو، جرم کا نشان ضرور چھوڑ جاتا ہے۔ ممبئی حملوں کے دوران بھی ایسا ہی ہوا۔ ان اعلیٰ دماغوں سے بھی منصوبے میں کچھ جھول رہ گئے۔ ایس ایم اشرف، ایلیسن ڈیوڈسن اور دیگر محقق یہی جھول دیکھ کر ممبئی حملوں کو بھارتیوں کا اپنا ''کارنامہ'' قرار دیتے ہیں۔

یہ یاد رہے کہ اجمل قصاب کے بیان کا بیشتر حصہ ان سرگرمیوں پر مشتمل ہے جو اس نے بحیثیت دہشت گرد انجام دیں۔ اسی لیے جن جگہوں پر دیگر دہشت گردوں نے حملہ کیا، وہاں پیش آئے واقعات کی تفصیل بہت کم ملتی ہے۔ حتیٰ کہ ممبئی مقدمے کے دوران گواہوں کے بیانات سے بھی چند ہی حقائق سامنے آئے۔

مثال کے طور پر یہ کہ بھارتی اخبارات کی رو سے اجمل نے گرفتاری کے بعد پہلے بیان میں انکشاف کیا: تاج محل ہوٹل میں حملہ کرنے والے دہشت گرد اُسے میریٹ ہوٹل (اسلام آباد) کی طرح بم دھماکوں سے اُڑانا چاہتے ہیں مگر بعدازاں ان پاکستانی دہشت گردوں کے قبضے سے صرف ۸ کلو آر ڈی ایکس برآمد ہوا۔ (یہ بات اس لیے سامنے آئی کہ مواد کی برآمدگی کے وقت صحافی بھی موجود تھے)، جبکہ میریٹ ہوٹل اسلام آباد کو نشانہ بناتے ہوئے ۶۰۰ کلو آر ڈی ایکس استعمال کیا گیا تھا۔

گمراہ کن منصوبے کے جھول اور خلا

آئیے اب دیکھتے ہیں کہ ممبئی حملوں کے گمراہ کن

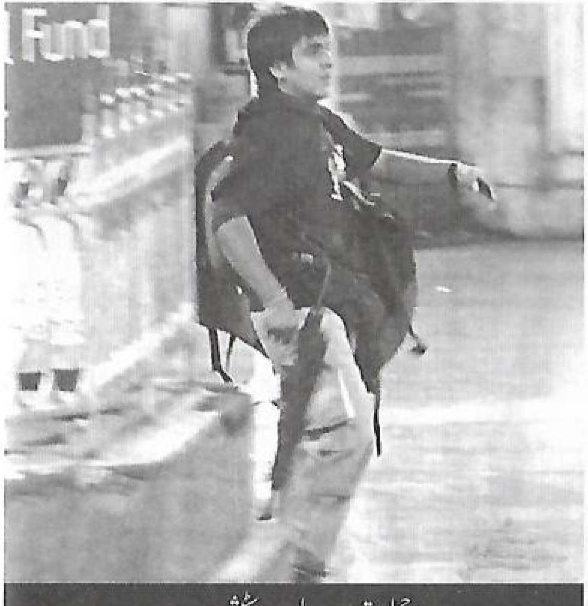

اجمل قصاب ریلوے اسٹیشن میں

منصوبے کو تیار کرتے ہوئے بھارتی منصوبہ سازوں سے کس قسم کی غلطیاں ہوئیں اور کیسے جھول رہ گئے۔ ممبئی حملے انجام دینے والے سبھی بھارتی دہشت گرد ''کامی کازی'' (Komikaze) تھے، یعنی انھوں نے ملک و قوم کی خاطر یہ مشن انجام دیا اور اپنی زندگیاں بھی داؤ پر لگا دیں۔ ممکن ہے کہ حملہ آوروں کو یہ باور بھی کروایا گیا ہو کہ ہیمنت کرکرے اور ان کے ساتھیوں کی وجہ سے ہندو مت خطرے میں ہے۔ غرض حملہ آوروں کی اچھی طرح برین واشنگ کر کے انھیں خود کش حملے کے لیے تیار کیا گیا۔

اس خود ساختہ حملے کو کامیاب بنانے کے لیے یہ ضروری تھا کہ ممبئی پولیس کو بے خبر رکھا جائے۔ اسی لیے عام لوگوں نے بھی پولیس اور ''پاکستانی دہشت گردوں'' کے درمیان مقابلے ہوتے دیکھے مگر آج بھی کوئی نہیں جانتا کہ ان مقابلوں میں کتنے حملہ آور مرے اور ان کی لاشیں کہاں گئیں۔ صرف کرشماتی طور پر اجمل زندہ پکڑا گیا جس کی زبانی پاکستان کو بدنام کرنے کی ساری جھوٹی اور بوگس داستان سامنے لائی گئی۔

(۱)

بھارتی سرکاری بیان کے مطابق اجمل قصاب اور ابو اسماعیل نے ممبئی کے شیواجی ریلوے اسٹیشن پر حملہ کیا۔ یہ ممبئی کے بڑے اور مرکزی ریلوے اسٹیشنوں میں سے ایک ہے۔ وہ پھر اسٹیشن سے نکل کر کاما اسپتال کی جانب گئے۔ وہاں ان کا دوبارہ پولیس پارٹیوں سے مقابلہ ہوا۔ حیران کن طور پر دونوں نہ صرف محفوظ رہے بلکہ انھوں نے تین پولیس افسر مار ڈالے۔ اجمل اور اسماعیل نے پھر ایک کار چھینی اور اس کے ذریعے گیر گام چوپاٹی نامی جگہ پہنچے۔ وہاں ان کا پولیس پارٹی سے ایک بار پھر مقابلہ ہوا اور اس بار اسماعیل مارا گیا جبکہ اجمل کو پولیس زندہ گرفتار کرنے میں کامیاب رہی۔

بھارت کے سیکورٹی و تفتیشی اداروں نے ممبئی حملوں کی تفصیل ۶۹ صفحات پر مشتمل ایک دستاویز میں بیان کی ہے۔ یہ دستاویز ۵ جنوری ۲۰۰۹ء کو حکومت پاکستان کے بھی حوالے کی گئی۔ یہ ممبئی حملوں سے متعلق واحد بھارتی سرکاری دستاویز ہے جسے منظرِ عام پر لایا گیا۔

اس دستاویز کی رو سے دس پاکستانی دہشت گرد ربڑ کی کشتی میں سوار ہو کر ممبئی کے ساحل پر اُترے۔ سوال یہ ہے کہ کشتی یقیناً محیر العقول طور پر نہایت مضبوط ربڑ سے بنی تھی تبھی اس نے نہ صرف دس آدمیوں کا بوجھ سہار لیا بلکہ وزنی اسلحہ بھی کشتی میں لادا گیا تھا۔ شاید یہ خصوصی کشتی تیار کرنے کی خاطر پاکستانیوں نے انتہائی مضبوط ربڑ ایجاد کر لیا ہوگا۔

(۲)

دستاویز میں درج ہے کہ کشتی کے ربڑ کا رنگ چمکدار پیلا تھا۔ یہ نکتہ بھی کان کھڑے کرتا ہے۔ چمکدار زرد رنگ دور ہی سے دیکھا جاتا ہے۔ گویا دہشت گردوں نے سمندری پانی سے ملتے جلتے رنگ کا ربڑ منتخب نہیں کیا بلکہ چمکدار پیلے رنگ کی کشتی میں سوار ہوئے.. تاکہ انھیں دور ہی سے دیکھا جا سکے۔

حیرت انگیز بات یہ کہ سمندری سرحدوں کی حفاظت و چوکیداری پر مامور بھارتی بحریہ سمیت کوئی بھی بھارتی سیکورٹی ایجنسی پاکستان جیسے دشمن ملک کی سمت سے آتی اس چمکدار زرد رنگ والی کشتی کو دریافت نہ کر سکی۔ یہ سیکورٹی ایجنسیاں جدید ترین آلات رکھتی ہیں اور پانیوں پر نظر رکھنے والی کشتیاں، بحری جہاز، ہیلی کاپٹر اور ہوائی جہاز بھی! کیا اس کوتاہی کو بھارتی سیکورٹی اداروں کی ناکامی قرار دے کر نظر انداز کرنا ممکن ہے؟

(۳)

ہم شروع میں بھارتی خاتون انیتا ادھایا (Anita Uddaiya) کا ذکر کر چکے جس نے ساحل پر کشتی سے اُترتے ''دہشت گرد'' دیکھے تھے۔ اس کی رو سے کشتی میں چھ لوگ سوار تھے اور انھوں نے مراٹھی میں گفتگو کی تھی۔ انیتا کے مطابق وہ دیکھنے میں بھی ہندو لگتے تھے کہ انھوں نے ہاتھوں میں گھرے

Doctor's
Unpasteurized, Unfiltered & Living
Natural
APPLE CIDER VINEGAR
With the Mother
100% خالص
روزبڈ شیمپو
DOCTOR'S ROSEBUD CREAM

ایپل سائیڈر ونیگر، بادام، ناریل اور گلاب سے بنا منفرد شیمپو
بال گرنے بند، خشکی سکری ختم، بال لمبے گھنے
اور مضبوط، سر کی جوؤں کا خاتمہ

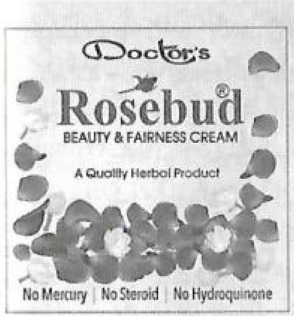

ایکنی، کیل، مہاسے، چھائیاں، جھریاں اور سیاہ حلقے دور کرتی ہے۔ شوگر کے مریضوں کے پاؤں کی درد، جلن، اکڑاؤ۔ مختلف ایگزیما اور پوسٹ ہرپز زوسٹر کا یقینی علاج

ڈاکٹر اصغر علی (ایم بی بی ایس)

”میں نے ڈاکٹر اصغر علی کی تیار کردہ مصنوعات خصوصاً شیمپو کو بہت مفید پایا ہے۔ اب میرا پورا خاندان یہ شیمپو استعمال کرتا ہے۔ میں اپنے حلقۂ احباب میں بھی اس کا تعارف کرواتا اور انھیں استعمال کرنے کا کہتا ہوں۔ یہ شیمپو خواتین کے بالوں کی کئی بیماریوں کا علاج ہے“۔ ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی (اُردو ڈائجسٹ)

ڈاکٹرز ایپل سائیڈر ونیگر

وزن کم کرتا ہے۔ کولیسٹرول کنٹرول کرتا ہے۔ جگر اور پیٹ کے بہت سارے امراض کا حل ہے۔ فالتو چربی ختم کرتا اور اسمارٹ بناتا ہے۔ ڈاکٹرز ایپل سائیڈر ونیگر سو فیصد خالص Unpasturised, unfiltered,living and the Mother ہے۔ جو پاکستان کے بہت سارے شہروں میں استعمال ہو رہا ہے اور لوگ مثبت رائے کا اظہار کر رہے ہیں۔

ڈاکٹرز روزبڈ کریم

ڈاکٹرز روزبڈ کریم میں شامل گلاب، بادام روغن، ناریل کا تیل، ایپل سائیڈر ونیگر اور قیمتی جڑی بوٹیاں خشک اور سرد موسم میں چہرے کی حفاظت کر کے چہرے کو گلاب کی طرح شاداب، تروتازہ، دلکش اور جاذبِ نظر بنا کر رنگ بھی گورا کرتی ہے۔

آئیے ہم آپ کو اسمارٹ، صحت مند اور توانا بنائیں

موٹاپے میں مبتلا افراد بڑی آسانی سے شوگر، بلڈ پریشر اور دل کے امراض کے شکار ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ صحت مند زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو قدرتی طریقۂ علاج سے مثلاً ڈاکٹرز ٹانک، خوراک کنٹرول اور مناسب ورزش سے وزن کم، پیٹ چھوٹا، صحتمند، اسمارٹ، توانا، شوگر، بلڈ پریشر اور دل کے امراض سے بغیر کسی سائیڈ ایفیکٹ کے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ کئی مریضوں کو دوائی کی بھی ضرورت نہیں رہتی اور وہ دوبارہ آئیڈیل صحت مند زندگی گزارتے ہیں۔

اتوار کے علاوہ شام چھ بجے سے رات آٹھ بجے تک اطلاع دے کر تشریف لا سکتے ہیں۔

برائے مشورہ: ڈاکٹر اصغر علی (ایم بی بی ایس)
کلینک: P-62 مرغزار کالونی ملتان روڈ لاہور
0321-8823321, 0336-4167960
doctor health and beauty clinic
Doctor Rosebud Shampoo
برائے رابطہ: حافظ مبشر علی 0321-9785644
www.doctorsons.org
پاکستان بھر سے ڈسٹری بیوٹر درکار ہیں
رابطہ نمبر برائے کراچی، حیدر آباد۔ 0321-207511

(گیروے) رنگ کے بینڈ پہن رکھے تھے۔ یاد رہے، گیروا انتہا پسند ہندو تنظیموں کا پسندیدہ مذہبی رنگ ہے۔

ایس ایم اشرف نے اپنی کتاب میں انکشاف کیا ہے کہ انیتا خود گواہی دینے ممبئی پولیس کے پاس گئی تھی۔ پولیس نے اس کا بیان ریکارڈ کر لیا۔ لیکن جب ملٹری انٹیلی جنس اور را تک یہ بیان پہنچا، تو ہلچل مچ گئی۔ وجہ یہ کہ انیتا نے صاف بتایا تھا کہ پاکستانی دہشت گرد بڑی روانی سے مراٹھی بول رہے تھے۔ کوئی پاکستانی مراٹھی سیکھنے میں پانچ چھ سال لگاتا، تبھی وہ ایسی روانی سے یہ مشکل زبان بولنا سیکھ سکتے تھے۔

فوج اور را کے دباؤ پر پولیس نے انیتا پہ زور دیا کہ وہ اپنا بیان بدل دے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ جب پولیس نے دیکھا کہ وہ اصول پرست عورت اپنا بیان بدلنے پر آمادہ نہیں، تو اُسے دھمکی دی گئی کہ پولیس کو گمراہ کرنے کے الزام میں اس پر مقدمہ دائر کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد انیتا خوفزدہ ہو کر منظر عام سے غائب ہو گئی۔

(۴)

بھارتی پولیس کا کہنا ہے، تمام پاکستانی دہشت گردوں کے پاس سے جعلی بھارتی شناختی کارڈ برآمد ہوئے۔ حیرت انگیز بات یہ کہ بقول بھارتی پولیس کے اجمل قصاب نے بتایا، ان پر تصاویر اور نام اصلی ہیں۔ کیا یہ عجیب بات نہیں؟ گویا بھارتی اداروں کو یہ موقع فراہم کیا گیا کہ وہ حملہ آوروں کی با آسانی شناخت کر سکیں۔

(۵)

ایس ایم اشرف اور ایلین ڈیوڈسن نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ ممبئی ریلوے اسٹیشن کے دو بنیادی حصے ہیں: مین لائن ٹرمنس اور سب اربن ٹرمنس۔ جب اجمل اور اسماعیل ریلوے اسٹیشن میں داخل ہوئے تو رات گئے بھارتی ٹی وی نیٹ ورکس نے اپنے رپورٹروں کی وساطت سے بتایا کہ مین لائن ٹرمنس پر لگے سی سی ٹی وی کیمروں نے دہشت گردوں کی ساری کارروائی ریکارڈ کر لی ہے، لیکن اگلے دن پولیس نے میڈیا کو بتایا کہ مین لائن ٹرمنس میں لگے سبھی ۱۶ سی سی ٹی وی کیمرے کام نہیں کر رہے تھے۔ یہ نہایت عجیب اور پراسرار بات ہے کہ اس رات سبھی ۱۶ کیمرے ناکارہ ہو گئے۔ اسی لیے مین لائن ٹرمنس پر اجمل اور اسماعیل نے کس قسم کی سرگرمیاں انجام دیں، ان کی بابت کچھ علم نہیں۔ شاید وہ ویڈیوز سامنے آنے سے یہ راز افشا ہو سکتا تھا کہ مین لائن ٹرمنس پر بھی دو ہندو دہشت گرد فائرنگ کر رہے تھے۔

عجیب تر بات یہ کہ تب ریلوے پولیس کا سربراہ کے پی رگھوونشی (K P Raghuvanshi) نامی پولیس افسر تھا۔ یہ افسر کھلم کھلا انتہا پسند ہندو تنظیموں سے تعلقات رکھتا اور مسلمانوں کو دہشت گرد سمجھتا تھا۔ یہ اور بھی زیادہ حیران کن بات ہے کہ ہیمنت کرکرے کے بعد اسی رگھوونشی کو مہاراشٹر کے اینٹی ٹیرر اسکواڈ کا سربراہ بنا دیا گیا۔

یہ یقینی ہے کہ کے پی رگھوونشی نے سی سی ٹی وی کیمروں کی ریکارڈنگ ضائع کر دی۔ جب وہ اینٹی ٹیرر اسکواڈ کا سربراہ

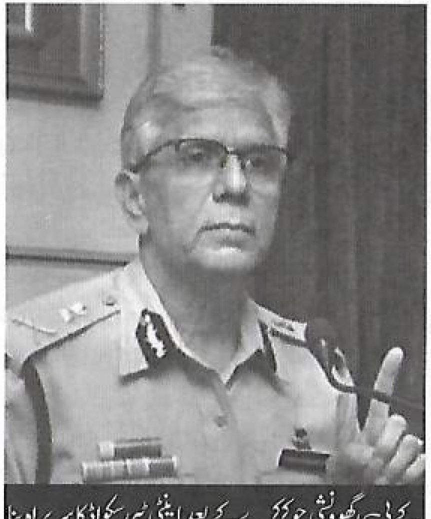

کے پی رگھوونشی جو کرکرے کے بعد اینٹی ٹیرر سکواڈ کا سربراہ بنا

بنا، تو اس نے لیفٹیننٹ کرنل پروہت، میجر اپادھائے، سدھوی پرگیا سنگھ، اسیم آنند اور دیگر اہم انتہا پسند ہندو شخصیات کے خلاف ثبوت بھی ضائع کر دیے۔ یہ ثبوت ہیمنت کرکرے نے مع ٹیم بڑی محنت و عرق ریزی سے جمع کیے تھے۔

ثبوتوں کی عدم موجودگی کا نتیجہ یہ نکلا کہ بم دھماکوں کے سلسلے میں پکڑے گئے ملزموں کے مقدمات میں پولیس کا بیان کمزور پڑ گیا۔ چنانچہ آج لیفٹیننٹ کرنل پروہت ضمانت پر رہا ہو چکا۔ جبکہ مسلمانوں کے دیگر قاتل بھی جیلوں میں نہایت آرام و آسائش سے رہ رہے ہیں۔ اب تو نریندر مودی جیسے مسلم دشمن کی قیادت میں انتہا پسند ہندو اقتدار میں آ چکے۔ لہٰذا ان کی بھرپور کوشش ہے کہ کسی بھی طرح مقدمات کو کمزور ترین بنا کر ہندو قوم کے تمام ''ہیرو'' رہا کر لیے جائیں۔

(۶)

بھارتی سرکاری بیان کے مطابق اجمل اور اسماعیل رات ۹:۲۰ پر ریلوے اسٹیشن میں داخل ہوئے اور فائرنگ کرنے لگے مگر ایک چشم دید گواہ، بھارت پٹیل مختلف کہانی سناتا ہے۔ اس کی یہ کہانی بھارتی اخبارات میں شائع ہو چکی۔ وہ اسٹیشن میں ''ری فریش فوڈ پلازا'' میں بطور شیف (Chef) کام کرتا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ فائرنگ ۹:۵۵ پر شروع ہوئی۔

سوال یہ ہے کہ بھارتی حکومت نے سرکاری دستاویز میں فائرنگ شروع کرنے کا وقت ۳۵ منٹ پیچھے کیوں کر دیا؟ کیا اس طرح کوئی فائدہ اٹھانا مقصود تھا؟

اسٹیشن پر او ایم پالی (O.M.Palli) موٹر مین کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ یعنی وہ آنے جانے والی ریلوں کے اوقات نوٹ کیا کرتا۔ اس نے ایک اخباری بیان میں بتایا کہ اس نے آخری گولی چلنے کی آواز ۱۰:۳۲ پر سنی تھی اور پھر اسٹیشن پر خاموشی چھا گئی۔

(۷)

چشم دید گواہوں کے مطابق اجمل اور اسماعیل نے ۹:۵۵ پر مین لائن ٹرمنس میں فائرنگ کا آغاز کیا، لیکن گواہوں کی رو ہی سے اسی وقت سب اربن ٹرمنس پر بھی فائرنگ ہونے لگی تھی۔ بھارتی دستاویز کے مطابق ریلوے اسٹیشن پر دو دہشت گردوں نے حملہ کیا، مگر گواہوں کے بیان کی روشنی میں عیاں ہے کہ ریلوے اسٹیشن پر دو سے زیادہ شاید چار دہشت گرد موجود تھے۔ یہ زائد دہشت گرد کون تھے؟ کہاں سے آئے اور کدھر چلے گئے؟ بھارتی حکومت نے سرکاری دستاویز میں ان کا کوئی ذکر کیوں نہیں کیا؟ اس کا مطلب ہے کہ سی سی ٹی وی کیمروں کی ریکارڈنگ اس لیے بھی تلف کی گئی تاکہ اسٹیشن پر دو سے زائد دہشت گرد دریافت نہ ہو سکیں۔

(۸)

بھارتی حکومت کے مطابق سب اربن ٹرمنس پر لگے سی سی ٹی وی کیمرے کام کر رہے تھے۔ انہی میں سے ایک کیمرے کی ویڈیو بھارتی حکومت نے دنیا والوں کے سامنے پیش کی۔ اس ویڈیو میں اجمل اور اسماعیل ریلوے اسٹیشن میں گھومتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں، مگر اس ویڈیو میں تاریخ اور وقت موجود نہیں جو اُسے نہایت مشکوک بنا ڈالتے ہیں۔

یہ ویڈیو واحد ٹھوس ثبوت ہے کہ اجمل ریلوے اسٹیشن پر موجود تھا، مگر ویڈیو پر تاریخ اور وقت کی عدم موجودگی ثبوت کو کمزور بنا دیتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ را ممبئی حملوں سے قبل یا بعد میں اجمل کو ریلوے اسٹیشن لے گئی اور اُسے گھماتی پھراتی رہی۔ ویڈیو کی رو سے سب اربن ٹرمنس بالکل خالی ہے اور وہاں ایک بھی ذی حس نظر نہیں آتا۔

بھارتی اخبارات کے مطابق اجمل نے اپنے مسلمان وکیل کو بتایا تھا کہ درج بالا ویڈیو میں وہ موجود نہیں بلکہ اس کا بہروپ بھر کر کوئی اور اسٹیشن پر گھوم رہا ہے۔ اس ویڈیو کی تصاویر کے علاوہ نیٹ پر اجمل کی ایسی تصاویر بھی موجود ہیں

جن میں اس کی سامنے سے شکل دکھائی دیتی ہے۔ اگر ویڈیو والے اجمل اور ان تصویروں والے اجمل کا موازنہ کیا جائے، تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ دونوں کی شکل و صورت مختلف ہے۔ گویا ریلوے اسٹیشن پر نہتے شہریوں کو اندھا دھند گولیاں مارتا دہشت گرد پاکستانی اجمل نہیں بلکہ کوئی ہندو نوجوان تھا، مگر بھارتی سیکورٹی اداروں نے جس اجمل کو عدالت میں اور صحافیوں کے سامنے پیش کیا، وہ نیپال سے اغوا شدہ پاکستانی نوجوان ہی تھا۔

(۹)

بھارتی حکومت کی پیش کردہ ویڈیو میں اجمل اور اسماعیل کلائیوں میں زرد رنگ کے بینڈ پہنے دکھائی دیتے ہیں۔ بتایا جا چکا کہ یہ زرد رنگ انتہا پسند ہندو تنظیموں کی پسندیدہ مذہبی علامت ہے۔ وہ اسی رنگ کے جھنڈے بناتے اور پگڑیاں، لباس وغیرہ مذہبی رسومات میں پہنتے ہیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ اپنی شناخت پوشیدہ اور انتہا پسند ہندوؤں کو بدنام کرنے کی خاطر اجمل اور اسماعیل نے زرد رنگ کے بینڈ پہنے، مگر انھیں اپنا مسلم تشخص چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ممبئی میں مسلمانوں کی بڑی تعداد آباد ہے۔ اسی لیے کرتے پاجامے اور شلوار میں ملبوس مسلمان وہاں اکثر دکھائی دیتے ہیں۔

یہ عین ممکن ہے کہ گمراہ کن منصوبے یا فالز فلیگ حملے میں جن بھارتی خودکش حملہ آوروں نے ریلوے اسٹیشن پر دھاوا بولا وہ کسی متشدد ہندو انتہا پسند تنظیم سے تعلق رکھتے ہوں۔ انھوں نے اپنا جوش و جذبہ بڑھانے کی خاطر اپنی مذہبی علامت، گیروے رنگ کے بینڈ کلائیوں پر چڑھا لیے۔ تب ان کے ''ہینڈلروں'' کو یہ خیال نہیں رہا کہ بعد میں یہ زرد رنگ کے بینڈ مغالطہ اور خرابی پیدا کر سکتے ہیں۔

(۱۰)

بھارتی سرکاری بیان کے بموجب تمام دس دہشت گرد بذریعہ سیٹلائٹ فون اور اور وائس اوور انٹرنیٹ پروٹوکول (VOIP) کے ذریعے کراچی میں قائم کنٹرول روم سے رابطہ رکھے ہوئے تھے۔ بھارتی حکومت کا دعویٰ ہے کہ وہاں حافظ محمد سعید اور لشکر طیبہ کے دیگر لیڈر موجود تھے۔ بھارت نے دہشت گردوں اور کنٹرول روم میں بیٹھے ''ہینڈلروں'' کی بات چیت کا ریکارڈ بھی پاکستان کے حوالے کر رکھا ہے۔

لیکن اب تو عام شخص بھی رقم خرچ کر کے ایسے آلات خرید سکتا ہے جن کی مدد سے کسی بھی آواز کو تبدیل یا تخلیق کرنا اور اُسے من پسند ہیئت دینا ممکن ہے۔ بھارتی فوج کو تو پھر امریکا اور اسرائیل کی خفیہ ایجنسیوں کی مدد حاصل ہے جو جاسوسی کے ایسے ایسے جدید ترین اور حیرت انگیز آلات رکھتی ہیں جن کی بابت عام لوگ جانتے تک نہیں۔

بہرحال بات چیت کے اس ریکارڈ کی رو سے پاکستان میں بیٹھے منصوبہ سازوں نے ممبئی میں گھومتے پھرتے اپنے فدائین کو ہدایت دی کہ مسلمانوں کو گولیوں کا نشانہ نہیں بنانا۔ لیکن حیرت انگیز طور پر اجمل اور اسماعیل نے اس ہدایت کو نظرانداز کر دیا۔

ان کی بے دریغ فائرنگ سے ریلوے اسٹیشن پر ۵۸ افراد ہلاک ہوئے۔ ان میں سے ''۲۲'' مسلمان تھے۔ اکثر مسلمانوں نے اسلامی لباس زیب تن کر رکھے تھے اور دور ہی سے پتا چل جاتا کہ وہ مسلمان ہیں۔ مقتولین میں ولی اللہ نامی مسلمان کے چھ اہل خانہ شامل تھے۔

حقائق سے عیاں ہے کہ اجمل اور اسماعیل نے دانستہ مسلمانوں کو نشانہ بنایا حالانکہ انھیں ایسا نہ کرنے کی ہدایت دی گئی تھی۔ یہ سچائی آشکارا کرتی ہے کہ ریلوے اسٹیشن پر فائرنگ کرنے والے ہندو تھے جنھوں نے دانستہ مسلمانوں پر گولیاں برسائیں تاکہ ان کی اکثریت ماری جائے۔

(۱۱)

بھارت نے پاکستان کو جو دستاویز دی، اس میں درج

ہے کہ ریلوے اسٹیشن سے نکل کر اجمل اور اسماعیل کاما اسپتال کی جانب چلے گئے۔ یہ اسپتال ریلوے اسٹیشن کے قریب ہی واقع ہے۔ وہاں یکے بعد دیگرے دو پولیس پارٹیوں سے ان کا مقابلہ ہوا۔ بھارتی رپورٹ میں یہ بات گول کر دی گئی کہ دو دہشت گردوں نے کاما اسپتال کے اندر جا کر پہلی پولیس پارٹی سے مقابلہ کیا تھا۔ اس مقابلے کے عینی شاہدین موجود ہیں اور جس کی رپورٹ اگلے دن تمام بھارتی اخبارات میں بھی شائع ہوئی۔

اس رپورٹ کے مطابق دو دہشت گرد کاما اسپتال کے اندر داخل ہوئے۔ انھوں نے وہاں کھڑے دو چوکیدار مار ڈالے۔ تیسرا چوکیدار سول کپڑوں میں ملبوس تھا۔ اس نے مراٹھی زبان میں ان کے ساتھ گفتگو کی اور کہا کہ اس کی مریضہ ماں اسپتال میں زیرِ علاج ہے لہٰذا اُسے بخش دیا جائے۔ دہشت گردوں نے اُسے گولیاں نہیں ماریں۔

دہشت گردوں نے پھر عملے کے ایک آدمی سے پانی منگوایا اور پھر اُسے بھی گولیاں مار کر ہلاک کر دیا۔ وہ پھر لفٹ کے ذریعے اسپتال کی سب سے بالائی منزل پر چلے گئے جو خالی تھی۔ انھوں نے لفٹ مین ٹکھسی کو یرغمال بنا لیا۔ بیس پچیس منٹ بعد وہاں چھ تا آٹھ پولیس والوں پر مشتمل ایک پارٹی آ پہنچی۔ عملہ اسپتال میں شامل ایک شخص انھیں سیڑھیوں کے راستے اُوپر لے گیا۔ ایک سپاہی نے اسٹیل کے ٹکڑے سے چھٹی منزل کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ تھوڑی دیر بعد ٹکھسی اندر سے برآمد ہوا اور اس نے پولیس پارٹی کو بتایا کہ اندر دہشت گرد موجود ہیں۔

اس کے بعد دہشت گردوں اور پولیس کے مابین گولیاں چلنے لگیں۔ یہ مقابلہ تیس چالیس منٹ جاری رہا۔ اس لڑائی میں پولیس پارٹی کا افسر، سدھانند دتے زخمی ہو گیا۔ حیران کن طور پر اس لڑائی کے بعد دونوں دہشت گرد سات آٹھ سپاہیوں کی موجودگی میں بھی اسپتال سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ امر راز ہی ہے کہ وہ کیونکر فرار ہوئے؟

اہم بات یہ کہ اگر وہ اجمل اور اسماعیل ہی تھے، تو روانی سے مراٹھی بول سکتے تھے۔ اسپتال میں ان سے گفتگو کرنے والے لوگ اس بات کے چشم دید گواہ ہیں۔

سوال یہ ہے کہ دونوں دہشت گرد اسپتال کی بالائی منزل میں کیا کرنے گئے تھے اور وہاں انھوں نے کیوں پوزیشن سنبھالی؟ کیا اس لیے کہ وہاں سے کاما اسپتال کی پچھلی گلی صاف دکھائی دیتی تھی جہاں عنقریب ممبئی پولیس کے تین فرض شناس پولیس افسر... کرکرے، سالسکر اور اشوک کامتے آنے والے تھے؟

دوسری اہم بات یہ کہ بھارتی دستاویز میں دونوں دہشت گردوں کی سرگرمیوں کا ذکر کیوں نہیں گیا جو کاما اسپتال کے اندر انجام پائیں؟ کیا اسی لیے کہ دونوں دہشت گرد مراٹھی زبان بول رہے تھے۔ جبکہ بھارتی حکومت شدومد سے زور دے رہی تھی کہ یہ حملے پاکستانی دہشت گردوں نے کیے ہیں لہٰذا مراٹھی بولنے والے دہشت گردوں کا تذکرہ ان کے زورِ بیان کو متاثر کر دیتا۔ اسی لیے یہ واقعہ ہی اڑا دیا گیا کہ دو دہشت گرد کاما اسپتال کے اندر داخل ہوئے تھے۔

(۱۲)

عینی شاہدین کے مطابق ۱۰:۳۲ تک ریلوے اسٹیشن سے دہشت گرد جا چکے تھے۔ بھارتی سرکاری رپورٹ کے مطابق وہاں اجمل اور اسماعیل موجود تھے جو کاما اسپتال کی جانب چلے گئے۔ وہاں تک پہنچتے ہوئے بمشکل دس منٹ لگتے ہیں۔ گویا ۱۰:۵۰ تک دونوں دہشت گرد کاما اسپتال پہنچ چکے تھے۔

کاما ایک سرکاری اسپتال ہے۔ وہاں عام طور پر غریب طبقے سے تعلق رکھنے والی خواتین اور بچوں کا علاج ہوتا ہے۔ یہ امر سمجھ سے باہر ہے کہ پاکستانی دہشت گردوں نے

غریبوں کے لیے مخصوص ایک علاج گاہ کو اپنا ٹارگٹ کیوں بنایا؟ یہی نہیں، وہ ایک گھنٹے تک وہاں موجود رہے اور اس دوران ان کا پولیس پارٹی سے مقابلہ بھی ہوا۔

ایک گھنٹے تک اسپتال میں دہشت گردوں کی موجودگی ایک چشم دید گواہ، ماروتی پھڈ (Maruti Phad) کے بیان سے عیاں ہے۔ وہ ممبئی حکومت کے میڈیکل ایجوکیشن سیکرٹری کا سرکاری ڈرائیور تھا۔ وہ کاما اسپتال کی پچھلی گلی کا رہائشی تھا جہاں سرکاری رپورٹ کے مطابق کرکرے وغیرہ کو گولیاں ماریں گئیں۔

۲۸ نومبر ۲۰۰۸ء کے دن ماروتی نے مشہور بھارتی ٹی وی، این ڈی ٹی وی (NDTV) کو انٹرویو دیتے ہوئے بتایا ''رات ۱۱:۳۰ پر مجھے صاحب کی کال موصول ہوئی کہ کار لے کر ان کے گھر چلے آؤ۔ جب میں اپنی گلی سے نکل رہا تھا، تو وہاں فائرنگ شروع ہو گئی۔ ایک گولی میرے ہاتھ پر بھی لگی۔ میں نے تیزی سے کار روکی اور یوں دم سادھے پڑ گیا جیسے مر چکا۔ اس ہوشیاری کی وجہ سے میری جان بچ گئی۔'' ماروتی نے بیان کے آخر میں بتایا ''اس وقت کرکرے کی کار میرے پیچھے تھی۔''

سوال یہ ہے کہ اگر کاما اسپتال میں چھپے اجمل اور اسماعیل تھے تو دونوں میں کایا پلٹ کیسے آئی؟ ریلوے اسٹیشن پر تو وہ چاروں طرف اندھا دھند گولیاں برسا رہے تھے لیکن پھر غریبوں کے ایک اسپتال میں جا چھپے؟ اگر وہ مریضوں کو یرغمال بنانا چاہتے تھے، تو انھوں نے بالائی خالی منزل میں جا کر پوزیشن کیوں سنبھالی؟ کیا وہ دانستہ پولیس پارٹی سے مقابلہ کرنا چاہتے تھے؟ یا پھر کرکرے اور ان کے ساتھی اصل نشانہ تھے؟

(۱۳)

ڈی این اے (DNA) بھارت کا ممتاز میڈیا نیٹ ورک ہے۔ ۲ دسمبر ۲۰۰۸ء کو ڈی این اے نے ایک رپورٹ شائع کی۔ اس رپورٹ کے مطابق ایک اے ایس آئی، درگوڈے (Durgude) سینٹ زیویر (Xavier) کالج کے باہر تعینات تھا۔ یہ کالج کاما اسپتال کی پچھلی گلی کے اس اختتام پر واقع ہے جہاں وہ مہاپالکا روڈ نامی سڑک سے ملتی ہے۔ یہ بتاتے چلیں کہ کاما اسپتال کے پیچھے سے گزرنے والی گلی کا نام بدرالدین طیب جی مرگ ہے۔

رپورٹ کے مطابق اے ایس آئی درگوڈے نے دو نوجوانوں کو دیکھا جو صورت شکل سے طالب علم لگتے تھے۔ اس نے انھیں روکا اور بتایا کہ کاما اسپتال میں دہشت گردوں اور پولیس کے مابین مقابلہ جاری ہے لہٰذا وہ وہاں سے رفوچکر ہو جائیں۔ جب دونوں نوجوان وہیں منڈلاتے رہے، تو اے ایس آئی نے زبردستی انھیں بھگانا چاہا۔ اس پر ایک نوجوان نے لباس میں چھپائی اے کے ۴۷ رائفل نکالی اور درگوڈے کو گولیاں مار دیں۔ وہ وہیں چل بسا۔

سوال یہ ہے کہ اگر کاما اسپتال میں اجمل اور اسماعیل پولیس پارٹی سے مقابلے کر رہے تھے، تو یہ دونوں نوجوان دہشت گرد کون تھے؟ ظاہر ہے، وہ اس خودکش اسکواڈ کا حصہ تھے جس نے ہیمنت کرکرے اور ان کے ساتھیوں کو ہلاک کرنا تھا۔

(۱۴)

بھارت کے سرکاری بیان کی روشنی میں ہیمنت کرکرے اپنی ٹیم کے ساتھ زخمی پولیس افسر، سدھانند دتے کو دیکھنے اپنے دفتر سے کاما اسپتال کی جانب روانہ ہوئے۔

ممبئی حملوں کے بعد کانگریسی حکومت میں شامل اقلیتی امور کے وزیر، اے آر انطولے نے یہ نقطہ اعتراض اٹھایا کہ کاما اسپتال میں دہشت گردوں نے مریضوں کو یرغمال نہیں بنایا تھا۔ پھر اینٹی ٹیرر اسکواڈ کے سربراہ مع اپنی ٹیم کے کاما اسپتال کیوں گئے؟ انھیں تو تاج محل یا اوبرائے ہوٹل جانا چاہیے تھا جہاں دہشت گردوں اور پولیس کے مابین لڑائی جاری تھی۔ جبکہ سدھانند دتے کے زخمی ہونے کے بعد جلد

ہی دہشت گرد فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔

یہ نقطہ اعتراض واضح کرتا ہے کہ کسی شخصیت نے ہیمنت کرکرے کو یہ پیغام دیا کہ وہ مع ٹیم کاما اسپتال پہنچ جائیں۔ یہ کون شخصیت تھی جس کا پیغام کرکرے کو تسلیم کرنا پڑا؟

(۱۵)

بھارتی سرکاری دستاویز کے مطابق اجمل نے اپنے بیان میں بتایا:

’’جب ہم دونوں کاما اسپتال سے باہر آئے، ہم نے ایک پولیس گاڑی دیکھی۔ ہم جلدی سے جھاڑیوں کے پیچھے چھپ گئے جو قریب ہی تھیں۔ اس کے بعد ایک اور گاڑی گزری جو کچھ دور جا کر رک گئی۔ اس گاڑی سے ایک پولیس افسر نکلا اور ہم پر گولیاں چلانے لگا۔ اس کی ایک گولی میرے ہاتھ پر لگی اور میری اے کے ۴۷ رائفل گر پڑی مگر اسماعیل نے اس پر اور کار میں بیٹھے دیگر لوگوں پر فائرنگ کر دی اور انھیں مار ڈالا۔ اسماعیل نے پھر لاشیں باہر نکالیں، مجھے گاڑی کے اندر بٹھایا اور ہم وہاں سے چل پڑے۔ پھر ایک جگہ گاڑی کا ٹائر پنکچر ہوگیا۔ ہم نے گاڑی وہیں چھوڑی اور ایک دوسری کار پکڑ لی۔‘‘

سرکاری بیان کے مطابق یہ دونوں دہشت گرد پھر گرگام چوپاٹی نامی جگہ پہنچے۔ وہاں تیسری پولیس پارٹی سے ان کا مقابلہ ہوا۔ اس مقابلے میں اسماعیل مارا گیا جبکہ اجمل زندہ پکڑا گیا۔ ہیمنت کرکرے کی موت کا یہ پہلا نمونہ یا ورژن ہے جو اجمل قصاب کی زبانی بھارتی سرکاری بیان کا حصّہ بنا۔

(۱۶)

دوسرا بیان ارون جدیو (Arun Jahdav) نامی سپاہی کی طرف سے آیا۔ اس بیان کی رو سے ہیمنت کرکرے کی گاڑی میں سالسکر اور اشوک کامتے کے علاوہ چار سپاہی بھی سوار تھے۔ ان میں سے صرف ایک سپاہی، ارون جدیو ہی زندہ بچ سکا۔ اس ارون جدیو نے مختلف مواقع پر بھارتی میڈیا کو مختلف بیانات دیے اور یوں ممبئی حملوں کو مشکوک بنا ڈالا۔

ارون جدیو نے پہلے بتایا کہ وہ زخمی سدھانند داتے کو دیکھنے جا رہے تھے پھر ایک اور چینل میں بیان دیا کہ ہم ایک سرخ رنگ کی کار تلاش کر رہے تھے، جس میں دہشت گرد سوار تھے۔ اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس نے انھیں بتایا کہ دہشت گرد سرخ کار میں سوار ہیں؟

(۱۷)

ارون جدیو نے پہلے بیان میں کہا کہ گاڑی میں کرکرے دوسری نشست پر سوار تھے۔ پھر دوسرے میں دعویٰ کیا کہ وہ کامتے کے ساتھ نشستوں کی پہلی قطار میں بیٹھے تھے۔ اسی طرح ارون جدیو نے پہلے بتایا، شروع میں سالسکر ڈرائیور کے پیچھے بیٹھے تھے۔ پھر انھوں نے گاڑی رکوائی اور

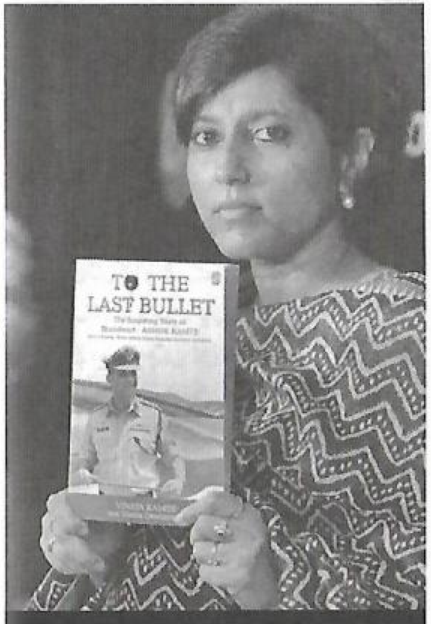

ونیتا کامتے

ڈرائیونگ سیٹ میں بیٹھ گئے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ سالسکر ایک تجربے کار پولیس افسر تھے۔ کیا انھیں یہ زیب دیتا تھا کہ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر دہشت گردوں کو کھلی چھوٹ دے دیتے کہ آؤ اور آسانی سے مجھے گولیاں مار ڈالو؟

(۱۸)

ارون جدیو کے بیان کی رو سے دو دہشت گرد بدرالدین طیب جی مرگ کی جھاڑیوں میں چھپے ہوئے تھے۔ جب گاڑی وہاں پہنچی، تو وہ بائیں (Left) طرف سے اس پر فائرنگ کرنے لگے۔ اگر یہ بات درست ہے تو ارون کے دائیں بازو پر دو گولیاں کیسے لگیں۔ جبکہ اس گلی میں جھاڑیاں بھی صرف دائیں طرف اُگی ہوئی ہیں۔ ان جھاڑیوں کے آگے خاردار جالی لگی ہے۔ اس جالی کو پھلانگ کر ہی جھاڑیوں میں چھپا جا سکتا ہے۔

(۱۹)

مقتول ایڈیشنل پولیس کمشنر اشوک کامتے کی بیگم، ونیتا کامتے (Vinita Kamta) وکیل ہیں۔ جب شوہر قتل ہو چکا، تو انھوں نے بعد ازاں عینی شاہدین سے انٹرویو کیے۔ پھر وہ پولیس افسروں سے بھی ملنے میں کامیاب رہیں۔ اس تحقیق اور بھاگ دوڑ کے بعد انھیں جو معلومات حاصل ہوئیں، اس کا خلاصہ یہ ہے:

اس وقت ایک مسلمان، حسن غفور ممبئی پولیس کے کمشنر تھے۔ جب حملوں کا آغاز ہوا، تو وہ تاج محل ہوٹل چلے گئے تاکہ وہاں جاری پولیس آپریشن کی قیادت کر سکیں۔ انھوں نے جانے سے پہلے پولیس کنٹرول روم جوائنٹ کمشنر پولیس (کرائم برانچ) راکیش ماریا (Rakesh Maria) کے سپرد کر دیا۔

ونیتا کامتے کے سامنے اشوک کامتے اور حسن غفور کی گفتگو ہوئی تھی۔ غفور نے انھیں تاج محل ہوٹل آنے کو کہا تھا۔ لیکن پھر وہ کاما اسپتال کیسے پہنچے؟ راکیش ماریا نے ونیتا کو بتایا کہ وہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتا، لیکن جب ونیتا نے پولیس کال لاگز تک رسائی پائی تو سچ سامنے آ گیا۔ پولیس

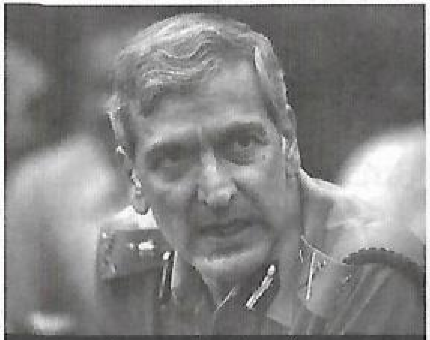
سابق کمشنر پولیس ممبئی، حسن غفور

کال لاگز کے مطابق راکیش نے اشوک کو کاما اسپتال کی طرف جانے کا کہا تھا۔ تب تک ہیمنت کرکرے کاما اسپتال کے پیچھے واقع گلی میں پہنچ چکے تھے۔ اس وقت اسپتال کے اندر پولیس پارٹی اور دہشت گردوں کے مابین ’مقابلہ‘ جاری تھا۔

۱۱:۲۴ پر کرکرے نے پولیس کنٹرول روم فون کر کے کہا کہ کاما اسپتال کے مرکزی دروازے پر ایک پولیس پارٹی بھجوائی جائے۔ یوں کرکرے اسپتال کے گرد گھیرا ڈالنا چاہتے تھے۔ انھوں نے ۱۱:۲۸ پر دوبارہ فون کر کے کہا کہ پولیس پارٹی کاما بھجوائی جائے۔ کاما اسپتال سے دو تا پانچ منٹ کی ڈرائیو پر تین پولیس اسٹیشن واقع ہیں مگر کہیں سے پولیس پارٹی کاما اسپتال نہیں بھجوائی گئی۔

کمک آنے کے بجائے پشتارے لیے دو نوجوان سینٹ زیوئیر کالج کے نکڑ پر نمودار ہوئے جہاں بدرالدین طیب جی لین ختم ہوتی تھی۔ ۱۱:۴۵ پر انھوں نے وہاں کھڑے اے ایس آئی درگوڈے کو گولیاں مار کے ہلاک کر دیا۔ اسی دوران

ماروتی پھد وہاں سے گزرا تو انھوں نے اس کی گاڑی پر بھی فائرنگ کی۔ وہ شاید اُسے کرکرے کی گاڑی سمجھے۔

ماروتی پھد کا فلیٹ اسی لین کے وسط میں واقع ہے۔ اس عمارت کے دیگر فلیٹوں سے بھی کئی لوگ یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ ان لوگوں نے پولیس کنٹرول روم فون کیے مگر کوئی امداد نہ پہنچی۔ عینی شاہدین کے مطابق دونوں دہشت گرد وہاں پندرہ منٹ تک آزادانہ گھومتے پھرتے رہے۔

رات بارہ بجے کرکرے، کامتے اور سالسکر ایک گاڑی میں بیٹھے۔ انھوں نے وہاں کھڑے سپاہیوں کو بتایا کہ وہ گھوم کر کاما اسپتال کے مرکزی دروازے کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ تینوں افسر اسپتال میں پھنسے زخمی پولیس والوں کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ تب تک علاقے کے رہائشی ہی نہیں آزاد میدان پولیس اسٹیشن کے دو کانسٹیبل بھی کنٹرول روم فون کر کے اطلاع دے چکے تھے کہ سینٹ زیویئر کالج کے قریب دو مسلح دہشت گرد موجود ہیں۔ لیکن کنٹرول روم سے تینوں افسروں کو ان کی موجودگی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا۔

۱۲:۰۴ پر کالج کے نزدیک چھپے دہشت گردوں نے تینوں افسروں کی گاڑی پر گولیوں کی بارش کر دی۔ عینی شاہدین کا کہنا ہے کہ گاڑی سے ایک پولیس افسر اتر کر دہشت گردوں پر فائرنگ کرنے لگا۔ ایک دہشت گرد کے ہاتھ میں گولی لگی اور اس سے گن چھوٹ گئی۔ اس دوران وہاں سے ایک پولیس گاڑی گزری جس کی بتی جل بجھ رہی تھی مگر وہ وہاں رکے بغیر آگے نکل گئی۔ اس میں سوار پولیس والوں نے نہ تو زخمی کرکرے، کامتے اور سالسکر کی مدد کی اور نہ ہی دہشت گردوں کو للکارا۔

آخر ۱۲:۴۷ پر تینوں زخمی افسر ایک پولیس گاڑی میں اسپتال پہنچائے گئے مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ مر چکے تھے۔ ۱۲:۵۶ پر حسن غفور نے کنٹرول روم فون کر کے پوچھا کہ کرکرے اور کامتے کہاں ہیں؟ راکیش نے جواب دیا کہ وہ ان کی بابت کچھ نہیں جانتا۔ حالانکہ پولیس کال لاگز شہادت دیتی ہیں کہ دونوں کاما اسپتال کے پچھواڑے موجود تھے۔

بھارتی حکومت نے رام پردھان نامی ایک کمیٹی بنائی تھی تاکہ وہ انٹیلی جنس کی ناکامی کا جائزہ لے سکے۔ ونیتا کامتے اس کمیٹی کے سامنے پیش ہو کر درج بالا حقائق پیش کرنا چاہتی تھیں مگر انھیں اجازت نہیں ملی۔ وہ رو پیٹ کر خاموش ہو گئیں۔

ایک سابق پولیس افسر، وائی پی سنگھ (Y.P.Singh) کا کہنا ہے کہ رام پردھان کمیٹی نے ''وسل بلوئروں'' کو تو مجرم ٹھہرایا جبکہ اصل مجرم معاف کر دیے گئے۔ حسن غفور نے راکیش سمیت ان تمام پولیس افسروں کو معطل کر دیا تھا جنھوں نے کاما اسپتال کی طرف کمک نہیں بھجوائی تھی۔

لیکن رام پردھان کمیٹی نے حسن غفور کو اس بات پر تنقید کا نشانہ بنایا کہ وہ کنٹرول روم چھوڑ کر تاج محل ہوٹل کیوں چلے گئے؟ حالانکہ وہ ایسا کرنے کے مجاز تھے۔ بہرحال اس عمل کو کوتاہی قرار دے کر حسن غفور کو عہدے سے برطرف کر دیا گیا۔ کمیٹی نے راکیش سمیت کسی دوسرے پولیس افسر کو قصوروار نہیں ٹھہرایا۔ گویا کمیٹی نے حسن غفور کو قربانی کا بکرا بنا کر بقیہ پولیس افسر ہر غلطی سے بری الزمہ قرار دے ڈالے۔

ونیتا کامتے کی تحقیق و تفتیش بتاتی ہے کہ جب کاما اسپتال میں دو دہشت گردوں اور پولیس پارٹی کے مابین مقابلہ جاری تھا، تو اسی دوران کرکرے، کامتے اور سالسکر کو کالج کے قریب نشانہ بنایا گیا۔ گویا ان تینوں پر حملہ کرنے والے دہشت گرد کوئی اور تھے۔

تفتیش یہ بھی عیاں کرتی ہے کہ گاڑی میں صرف وہ تین پولیس افسر ہی سوار تھے۔ گویا ارون جدیو کا یہ بیان غلط ہے کہ گاڑی میں اس سمیت چار سپاہی بھی سوار تھے۔ مزید برآں یہ کہ کرکرے اور بدرالدین طیب جی لین میں رہائش پزیر لوگ مسلسل کنٹرول روم فون کر کے کمک مانگتے رہے مگر وہ

نہیں بھیجی گئی۔ ظاہر ہے، جب بھارتی فوج، را اور آئی بی نے کرکرے اور ان کے دونوں ساتھیوں کو ہر قیمت پر قتل کرنے کا پروگرام بنا رکھا تھا، تو کمک کیوں روانہ کی جاتی؟

(۲۰)

ہیمنت کرکرے جب اپنے دفتر سے نکلے تو وہ بلٹ پروف جیکٹ پہن رہے تھے۔ اس بات کے کئی عینی شاہدین موجود ہیں۔ نیز اس موقع پر آئی بی این (IBN) نیٹ ورک کے کیمرہ مین نے ویڈیو بھی بنائی تھی، مگر جب ان کی لاش اسپتال پہنچی، تو وہ جیکٹ غائب تھی۔ شروع میں پولیس نے بتایا کہ اسپتال کے ایک خاکروب نے جیکٹ پھینک دی مگر مقتول کی بیگم، کویتا کرکرے کی تحقیق و تفتیش سے یہ خبر جھوٹی ثابت ہوئی۔

ایس ایم اشرف، ایلین ڈیوڈسن اور دیگر محققوں کا کہنا ہے کہ سینٹ زیویئر کالج کے باہر کھڑے دہشت گردوں کا تعلق ملٹری پولیس یا عام پولیس سے تھا۔ ان کی چلائی گئی ایک گولی کرکرے کی بلٹ پروف جیکٹ میں پھنس گئی جو کسی طور نہ نکل سکی۔ اسی لیے جیکٹ ہی کو غائب کر دیا گیا۔ وہ گولی اگر کرکرے کے کسی ساتھی کو مل جاتی، تو گمراہ کن منصوبے کا راز فاش ہو جاتا۔

(۲۱)

بھارتی حکومت کا بیان یہ ہے کہ کاما اسپتال سے نکل کر اجمل اور اسماعیل نے کرکرے کو قتل کیا اور پھر ان کی گاڑی میں سوار ہو کر میٹرو جنکشن پہنچ گئے۔ یہ چوک کاما اسپتال کے قریب ہی واقع ہے۔ وہاں ان کی گاڑی پنکچر ہو گئی اور وہ دوسری کار پر سوار ہو کر گرگام چوپاٹی کی طرف چلے گئے۔

لیکن ۲۸ ستمبر ۲۰۰۸ء کی صبح بھارتی اخبارات میں چھپی خبریں کچھ اور ہی کہانی بیان کرتی ہیں۔ ان کے مطابق میٹرو جنکشن میں کار سواروں نے چاروں طرف فائرنگ کی تھی اور پھر فرار ہو گئے۔ خبروں سے بھی زیادہ پُر اسرار اور حیرت انگیز وہ ویڈیو ہے جو مشہور بھارتی نیٹ ورک سی این این۔ آئی بی این (CNN-IBN) کے ایک رپورٹر نے میٹرو جنکشن پر اُتاری تھی۔

(۲۲)

آئی بی این کی یہ وڈیو ہیمنت کرکرے کے قتل کا تیسرا نمونہ سامنے لاتی ہے۔ یہ ویڈیو ۲۷ نومبر ۲۰۰۸ء کی رات دکھائی گئی تھی۔ ویڈیو کے آغاز میں رپورٹر بتاتا ہے کہ شروع میں پولیس نے میڈیا کو بتایا کہ کرکرے تاج محل ہوٹل کے نزدیک مارے گئے ہیں۔ پھر پولیس اس خبر سے پیچھے ہٹ گئی۔ اگر یہ خبر غلط تھی، تو اُسے میڈیا تک کیوں پہنچایا گیا؟ کیا یہ خبر اس لیے بدل گئی کیونکہ عینی شاہدین نے کرکرے کو نہیں کسی اور کو مرتے دیکھا تھا؟

اس ویڈیو میں آگے چل کر دکھایا جاتا ہے کہ گیروے رنگ کا لباس پہنے دو نوجوان کرکرے کو ایک گاڑی میں ڈال رہے ہیں۔ رپورٹر تب بتاتا ہے ''شاید کرکرے پولیس والوں کی اندھا دھند فائرنگ کا نشانہ بن گئے ہیں۔ رپورٹر کا یہ بھی کہنا ہے کہ دو کاروں... ٹیوٹا کوئس اور ہونڈا سٹی میں سوار لوگ بے دریغ فائرنگ کر رہے تھے۔ یہ لوگ کون تھے؟

ویڈیو میں دیکھا جا سکتا ہے کہ گیروے لباس میں ملبوس ایک نوجوان کے ہاتھ سے خون نکل رہا تھا۔ کیا وہی نوجوان تھا جس نے کرکرے اور ان کے ساتھیوں سے مقابلہ کیا؟ مگر وہ اجمل تو نہیں تھا۔ یہ دونوں نوجوان کون تھے؟ کہاں سے آئے اور کہاں چلے گئے؟ اسی ویڈیو کی ایک خاص بات یہ ہے کہ کرکرے کے چہرے اور بالائی جسم پر خون اور زخم کے نشان دکھائی نہیں دیتے بلکہ لگتا ہے کہ وہ بے ہوشی کے عالم میں ہیں، مگر جب ان کی ارتھی لوگوں کو دکھائی گئی، تو کرکرے کے چہرے پر تشدد کے واضح نشان تھے۔ جبکہ ان کا بالائی جسم گولیوں سے چھلنی تھا۔

یہ عین ممکن ہے کہ انتہا پسند ہندوؤں نے کرکرے کو اغوا

کر کے انھیں بدترین تشدد کا نشانہ بنایا اور پھر نہایت اذیت ناک طریقے سے مار دیا گیا۔ دراصل اس طرح طاقتور انتہا پسند ہندوتولہ سبھی سرکاری افسروں کو خبردار کرنا چاہتا تھا کہ آئندہ ان کے دہشت گردی والے نیٹ ورک کے خلاف کوئی افسر چھان بین کرنے کی ہمت نہ کرے ورنہ اس کا بھی کرکرے جیسا حشر ہوگا۔ یاد رہے، ہیمنت کرکرے اور ان کے دو ساتھی ممبئی پولیس کے واحد اعلیٰ افسر تھے جنھوں نے دہشت گردوں سے دوبدو مقابلہ کیا اور اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

(۲۳)

بھارتی حکومت کے مطابق گرگام چوپاٹی کے مقام پر اجمل اور اسماعیل کا مقابلہ ایک پولیس پارٹی سے ہوا۔ اس مقابلے میں اسماعیل مارا گیا جبکہ اجمل گرفتار ہو گیا۔

اس مقابلے کا ایک حیرت انگیز پہلو یہ ہے کہ اخباری رپورٹوں کے مطابق گرگام چوپاٹی میں کھڑی پولیس پارٹی کے پاس صرف دو رائفلیں تھیں۔ بقیہ سپاہی لاٹھیاں رکھتے تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے نہ صرف اسماعیل کو مار ڈالا بلکہ اجمل کو زندہ پکڑنے میں بھی کامیاب رہے۔ حالانکہ یہ دونوں خطرناک دہشت گرد انتہائی تجربے کار پولیس افسروں کو قتل کر کے آرہے تھے۔ مگر گرگام چوپاٹی میں کھڑے سپاہیوں نے نہ جانے کیا "چمتکار" دکھایا کہ دونوں دہشت گردوں کی سٹی گم ہو گئی اور وہ قانون کے جال میں پھنس گئے۔

(۲۴)

بھارتی سرکاری بیان کے مطابق کرکرے سے مقابلہ کرتے ہوئے اجمل کا ہاتھ زخمی ہو گیا تھا۔ گرفتاری کے بعد جب اُسے صحافیوں کے سامنے لایا گیا، تو اس کے دونوں ہاتھ صحیح سلامت تھے۔ مگر میٹرو جنکشن میں اتاری گئی ویڈیو میں صاف دیکھا جا سکتا ہے کہ ایک نامعلوم نوجوان کے ہاتھ سے خون بہ رہا ہے۔ کیا یہ وہی دہشت گرد ہے جس نے ساتھیوں کے ہمراہ کرکرے، کامتے اور سالسکر کو مار ڈالا؟ اس نوجوان کی اصلیت آج تک سربستہ راز میں ہے۔

(۲۵)

ایس ایم اشرف نے اپنی کتاب میں ایک اہم اور سنسنی خیز انکشاف یہ کیا ہے کہ ممبئی پولیس کے کنٹرول روم اور پولیس کمشنر، حسن غفور کی وائرلیس کمیونیکیشن کی ٹیپ عیاں کرتی ہے کہ گرگام چوپاٹی پر دو دہشت گردوں اور پولیس کے مابین واقعی مقابلہ ہوا... مگر اس مقابلے میں دونوں دہشت گرد مارے گئے تھے۔

یہ نہایت اہم انکشاف ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ، اجمل قصاب کو گرگام چوپاٹی سے نہیں پکڑا گیا کیونکہ اس مقابلے میں تو دونوں دہشت گرد مر گئے۔ اگلے روز کئی اخبارات میں بھی یہی خبر شائع ہوئی کہ گرگام چوپاٹی کے مقابلے میں دونوں دہشت گرد ہلاک ہو گئے۔

یہ سچائی پھر ثابت کرتی ہے کہ اجمل قصاب کا بہروپ بھر کر بھارتی فوج، کسی انٹیلی جنس ایجنسی یا شیوسینا کا کوئی جنگجو ریلوے اسٹیشن اور دیگر مقامات پر فائرنگ کرتا رہا۔ آپ اگر تصاویر میں ریلوے اسٹیشن پر موجود اجمل اور اسماعیل کو غور سے دیکھیں تو واضح طور پر وہ پاکستانی نہیں بلکہ بھارت کے چھٹے ہوئے بدمعاش دکھائی دیتے ہیں۔

(۲۶)

ممبئی پولیس نے اپنے شہر کے دو مسلمان شہری، فہیم انصاری اور صباح الدین شیخ کو بھی گرفتار کیا۔ ان پر الزام تھا کہ انھوں نے پاکستانی دہشت گردوں کی مدد کی ہے۔ وہ اس طرح کہ فہیم نے ہاتھ سے ممبئی کے اہم مقامات کے نقشے بنائے اور پھر انھیں صباح الدین کے حوالے کر دیا۔ صباح الدین انھیں نیپال لے گیا جہاں یہ نقشے لشکر طیبہ کے اہم لیڈر، ذکی الرحمن لکھوی کے حوالے کر دیے گئے۔

ممبئی کے نوجوان وکیل، شاہد عظمی ان دونوں مسلمانوں کے وکیل تھے۔ انھوں نے سب سے پہلے پولیس کے مرکزی گواہ، نور الدین پر جرح کی۔ جرح نے ثابت کر دیا کہ نور الدین کبھی نیپال نہیں گیا۔ اسی لیے وہ دیکھ ہی نہیں سکتا کہ صباح الدین نقشے ذکی الرحمن لکھوی کو دے رہا ہے۔ شاہد عظمی نے یہ بھی دلیل دی کہ جب انٹرنیٹ پر ممبئی کے بہترین نقشے موجود ہیں تو فہیم کو ہاتھ سے نقشے بنانے کی کیا ضرورت تھی؟

پولیس کے مطابق فہیم کے بنائے گئے نقشے ابو اسماعیل کی جیب سے برآمد ہوئے تھے۔ شاہد عظمی اخباری رپورٹوں کے ذریعے یہ ثابت کرنے میں کامیاب رہا کہ جب اسماعیل مرا، تو اس کا جسم خون میں لت پت تھا۔ شاہد عظمی نے پھر سوال کیا "یہ کیسے ممکن ہے کہ پولیس نے اسماعیل کی جیب سے نقشے برآمد کر لیے اور ان پر خون کا ایک قطرہ تک موجود نہیں؟"

شاہد عظمی کے دلائل اتنے قوی تھے کہ تین مئی ۲۰۱۰ء کو عدالت نے فہیم انصاری اور صباح الدین، دونوں کو رہا کر دیا۔ اس دوران شاہد عظمی پر افشا ہو چکا تھا کہ بھارتی پولیس مسلمانوں پر جھوٹے کیس ڈال کر انھیں گرفتار کر لیتی ہے۔ یہ سلسلہ ۲۰۰۲ء سے چلا آرہا تھا۔ خیال ہے کہ اسے یہ بھی احساس ہو گیا تھا کہ ممبئی حملے بھارتی انٹیلی جنس ایجنسیوں نے ہی انجام دیے ہیں۔ اسی لیے فروری ۲۰۱۰ء میں انھیں ...دہشت گردوں نے گولیاں مار کر ہلاک کر دیا۔ یہ دہشت گرد را یا آئی بی کے ایجنٹ تھے۔

(۲۷)

۲۸ نومبر ۲۰۰۸ء کو بھارتی نیٹ ورک، ڈی این اے (DNA) نے ایک رپورٹ جاری کی۔ اس کے مطابق ...دی سینٹر، نریمان ہاؤس کے سامنے والی عمارت میں آنند راؤرانے (Anand Raorane) نامی ایک شخص مقیم ہے۔ اس نے ڈی این اے کو بتایا کہ جب ٹی وی پر یہ خبر چلی کہ ...ت کر کے مارے گئے ہیں، تو نریمان ہاؤس پر قبضہ جمائے دہشت گردوں نے خوشی سے نعرے لگائے اور یوں جشن منایا جیسے وہ بہت خوش ہوں۔ یہ حقیقت عیاں کرتی ہے کہ نریمان ہاؤس پر قبضہ جمائے بیٹھے دہشت گردوں کا تعلق بھارتی خفیہ ایجنسیوں یا ہندو انتہا پسند تنظیموں سے تھا۔

ڈی این اے کی اسی رپورٹ میں یہ انکشاف بھی کیا گیا کہ صحافیوں کو نریمان ہاؤس کے ایک رہائشی اور مقامی دکاندار نے بتایا کہ دہشت گردوں نے حملے سے قبل بڑی مقدار میں کھانے پینے کی اشیاء اور شراب خریدی تھی۔

سوال یہ ہے کہ اگر دہشت گردوں کا تعلق لشکر طیبہ سے تھا، جیسا کہ بھارتی حکومت کا دعویٰ ہے، تو کوئی بھی ذی عقل یہ کیسے یقین کر سکتا ہے کہ انھوں نے شراب خریدی اور نریمان ہاؤس میں قلعہ بند ہو کر جام خمر چڑھاتے رہے؟

(۲۸)

۲۸ نومبر ۲۰۰۸ء کو اکثر بھارتی اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی: عینی شاہدین نے صحافیوں کو بتایا کہ انھوں نے رات ۱۲:۳۰ پر سینٹ زیویئر کالج کے باہر فٹ پاتھ پر پڑی ایک لاش دیکھی۔ اس کے قریب تین مسلح نوجوان کھڑے تھے۔ وہ لاش کس کی تھی اور وہ تین مسلح آدمی کون تھے؟

(۲۹)

۲۸ نومبر ہی کو بھارتی اخبارات میں یہ خبریں بھی شائع ہوئیں کہ پولیس نے ابتدا میں دو سے آٹھ دہشت گرد زندہ پکڑنے کی کال چلائی تھی، لیکن آخر میں صرف ایک ہی دہشت گرد پایا گیا۔ بقیہ زندہ گرفتار ہونے والے دہشت گرد کہاں گئے؟

(۳۰)

بھارتی سرکاری بیان کے مطابق اجمل قصاب، اسماعیل اور بعض دیگر پاکستانی دہشت گردوں نے اپنے موبائل گرا دیے تھے۔ (گویا انھیں شناخت کرنے میں مزید آسانی رہے)۔ یہ موبائل بھارتی سمیں رکھتے تھے۔

جب پولیس نے چھان بین کی، تو انکشاف ہوا کہ ممبئی حملوں سے قبل کلکتہ میں دو بھارتی مسلمانوں، توصیف رحمان اور مختار احمد نے تین سم کارڈ خریدے تھے جو دہشت گردوں کے زیر استعمال رہے۔ چنانچہ ۶ دسمبر ۲۰۰۸ء کو انھیں گرفتار کرلیا گیا۔ بعدازاں انکشاف ہوا کہ توصیف اور مختار، دونوں آئی بی کے خفیہ ایجنٹ تھے۔ انھیں یہ ذمے داری سونپی گئی تھی کہ وہ لشکر طیبہ میں شامل ہو کر اس کے قائدین کی جاسوسی کرتے رہیں۔

یہ ایک اور نہایت اہم انکشاف ہے۔ اس سے عیاں ہے کہ تمام جنگجو پاکستانی تنظیموں میں بھارتی خفیہ ایجنسیوں کے ایجنٹ کام کر رہے ہیں۔ اسی لیے یہ ایجنسیاں پاکستانی ریاست کے خلاف سرگرم ہوئیں اور اب تک ارض پاک میں دہشت گردی کروا رہی ہیں۔

داؤد گیلانی کا انوکھا کردار؟

ممبئی حملوں کے بھارتی سرکاری بیان میں سید داؤد گیلانی المعروف بہ ڈیوڈ کولمین ہیڈلے بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اس شخص کی داستان بھی بڑی ڈرامائی اور پُراسرار ہے۔

داؤد گیلانی پاکستانی باپ، سید سلیم گیلانی اور امریکی ماں، ایلس شیری کا بیٹا ہے۔ سلیم گیلانی سفارت کار کی حیثیت سے واشنگٹن کے پاکستانی سفارت خانے میں تعینات تھے۔ ایلس وہیں بحیثیت سیکرٹری کام کرتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے جو شادی پر منتج ہوئی۔ اس بندھن سے ۱۹۶۰ء میں داؤد گیلانی پیدا ہوا۔

جلد ہی سلیم گیلانی اہل خانہ کو لاہور لے آئے مگر ایلس پاکستانی معاشرے میں جذب نہ ہو سکی اور واپس امریکا چلی گئی۔ پھر اس نے طلاق لے لی۔ ۱۹۷۷ء میں سترہ سالہ داؤد بھی ماں کے پاس امریکا چلا گیا۔ تب تک سلیم گیلانی نے دوسری شادی کرلی تھی۔ وہ ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل رہے اور ۲۰۰۸ء میں فوت ہوئے۔ ان کا ایک اور سوتیلا بھائی، دانیال بھی سفارت کار ہے۔ وہ سابق وزیر اعظم، یوسف رضا گیلانی کا ترجمان رہ چکا۔

بالغ ہونے کے بعد داؤد پاکستان آتا جاتا رہا۔ ان دوروں کے دوران وہ منشیات کی اسمگلنگ کرنے لگا۔ ۱۹۸۸ء میں آخر وہ جرمنی میں پکڑا گیا۔ جرمنوں نے اُسے امریکا کے حوالے کر دیا جہاں داؤد چار برس جیل میں رہا۔ ۱۹۹۷ء میں داؤد پھر منشیات اسمگل کرتے امریکا میں پکڑا گیا۔

جلد ہی داؤد نے امریکی خفیہ ایجنسیوں کا ایجنٹ بننا منظور کرلیا۔ نتیجے میں اُسے رہا کر دیا گیا۔ یہ واقعہ افشا کرتا ہے کہ امریکی اپنے مفادات کی خاطر غیر قانونی عمل بھی کر ڈالتے ہیں۔ امریکی حکومت کا دعویٰ ہے کہ داؤد کو پھر لشکر طیبہ کی سرگرمیاں جاننے کی خاطر پاکستان بھیجا گیا۔ پاکستان پہنچ کر داؤد لشکر طیبہ کا رکن بن گیا۔ حقیقتاً وہ سی آئی اے کا ایجنٹ تھا۔ وہ امریکی خفیہ ایجنسیوں کو لشکر طیبہ اور دیگر پاکستانی جہادی تنظیموں کے بارے میں اندرونی معلومات دیتا رہا۔

امریکی حکومت کا دعویٰ ہے کہ ۲۰۰۶ء میں داؤد نے اپنا نام ڈیوڈ کولمین ہیڈلے رکھ لیا۔ اس دوران وہ ڈبل ایجنٹ بن گیا۔ یعنی وہ لشکر طیبہ کے لیے بھی کام کرنے لگا۔ اسی حیثیت سے وہ ۲۰۰۶ء اور ۲۰۰۷ء میں ممبئی گیا۔ اس نے تاج محل ہوٹل، اوبرائے ہوٹل، نریمان ہاؤس اور دیگر ٹارگٹوں کی تصاویر اور ویڈیو بنائیں اور لشکر طیبہ کے حوالے کر دیں۔

۲۰۰۹ء میں وہ لشکر طیبہ کو خیر آباد کہہ کر الیاس کاشمیری کا ساتھی بن گیا۔ الیاس کاشمیری ڈنمارک کے بدنام زمانہ اخبار، جیلنڈز پوسٹن کے دفتر پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔ داؤد گیلانی کو یہ ذمے داری سونپی گئی کہ وہ دفتر کی ''ریکی'' کر کے آئے اور کوشش کر کے، تصاویر بھی اتارے۔ چنانچہ داؤد جب امریکا سے ڈنمارک براستہ پاکستان جا رہا تھا، تو اکتوبر ۲۰۰۹ء میں اُسے گرفتار کرلیا گیا۔

امریکی حکومت کا دعویٰ ہے کہ جب داؤد گیلانی سے تفتیش

ہوئی، تو اس نے انکشاف کیا کہ وہ بھی ممبئی حملوں میں ملوث تھا۔ لہٰذا اس جرم پر داؤد کے خلاف امریکا میں مقدمہ چلا اور جنوری ۲۰۱۳ء میں اُسے امریکی عدالت نے پینتیس سال کے لیے جیل بھجوا دیا۔ گویا بالفرض داؤد جیتا رہا، تو رہائی کے وقت وہ ۸۸ سال کا ہوگا۔ لیکن قوی امکان یہی ہے کہ وہ جیل ہی میں وفات پا جائے گا۔ اجمل قصاب کی طرح امریکی حکومت نے بھی داؤد پر بند کمرے میں مقدمہ چلایا۔ اس مقدمے کی تفصیل کلاسیفائیڈ یا خفیہ ہے۔ پس امریکی حکومت جو کچھ صحافیوں کو داؤد گیلانی کے بارے میں بتاتی رہی، وہی سامنے آیا۔

درج بالا حقائق سے عیاں ہے کہ داؤد گیلانی امریکی خفیہ ایجنسیوں کا ایجنٹ تھا۔ اس کی مدد سے وہ لشکر طیبہ اور دیگر جہادی تنظیموں کی جاسوسی کرتی رہیں، لیکن اکتوبر ۲۰۰۹ء میں اچانک اُسے ''ڈبل ایجنٹ'' قرار دے کے گرفتار کرلیا گیا۔ یعنی یہ کہ وہ لشکر طیبہ کے لیے کام کرنے لگا تھا مگر یہ محض ایک الزام ہے جو امریکی حکومت نے داؤد پر لگایا۔ سوال یہ ہے کہ امریکی حکومت نے داؤد پر ہی کیوں لگایا؟ امریکی حکومت نے یہ چال کیوں چلی اور اپنے ہی ایجنٹ کو معتوب ٹھہرا دیا؟ یہ جاننے کی خاطر ہمیں نو سال پیچھے جانا پڑے گا۔

جنوری ۲۰۰۹ء میں بارک اوباما نئے امریکی صدر بن گئے۔ اوباما افغانستان میں امریکی فوج کی تعداد بڑھانا چاہتے تھے تاکہ طالبان کو شکست دی جا سکے۔ پاک فوج نے اس نئی حکمت عملی کو ناقص قرار دیا اور امریکیوں کو بتایا کہ کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ (بعدازاں یہ پیشین گوئی درست ثابت ہوئی۔) رفتہ رفتہ دیگر معاملات پر بھی امریکا اور پاکستان کے مابین عدم اتفاق نے جنم لیا اور دوریاں بڑھنے لگیں۔

مارچ ۲۰۰۹ء میں را نے اپنے ایجنٹوں کی مدد سے لاہور میں سری لنکن کرکٹ ٹیم پر حملہ کروا دیا۔ اس بھارتی حملے کا مقصد پاکستان کو عالمی سطح پر مزید تنہا کرنا اور دہشت گردوں کا سرپرست ملک قرار دلوانا تھا۔ یہ حملے بھی پاکستان کے لیے تباہ کن ثابت ہوئے۔ انھیں انجام پائے نو برس بیت چکے، آج بھی غیر ملکی کھلاڑی پاکستان آتے ہوئے گھبراتے اور خوف کھاتے ہیں۔

حرفِ آخر

قارئین کرام درج بالا تمام حقائق سے عیاں ہے کہ بھارتی فوج، را، آئی بی سے منسلک قوم پرست طاقتور ہندو ٹولے نے ممبئی حملوں کا گمراہ کن اور شاطرانہ منصوبہ تیار کیا تاکہ وہ کثیر مقاصد حاصل کر سکے۔ اس پلان کو انتہا پسند ہندو تنظیموں کی بھی مدد شامل تھی۔ تبھی ممکن ہو سکا کہ جنوبی ممبئی میں وسیع پیمانے پر قتل و غارت مچا کر اس کا مرتکب پاکستان کو قرار دیا جائے۔ یوں پاکستان کو سیاسی و معاشی طور پر زبردست نقصان پہنچتا۔

ممبئی حملوں کے ''فالز فلیگ اٹیک'' سے اس ہندو ٹولے نے گوناگوں فوائد پائے۔ ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ بھارت میں ہندو قوم پرستی بڑھنے لگی تاکہ نام نہاد اسلامی دہشت گردی کا مقابلہ کیا جا سکے۔ چنانچہ صرف پانچ برس بعد ہزارہا مسلمانوں کے قاتل مودی کی زیر قیادت قوم پرست ہندو برسر اقتدار آ گئے۔ اب یہ ٹولہ پورے بھارت میں قدم جمانے کی کوششیں کر رہا ہے۔ اس کا ایک اہم مشن مسلمانان بھارت کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو ہندو بنا لینا ہے۔

اسی طرح ممبئی حملوں کے بعد سے پاکستان اور بھارت کے تعلقات مسلسل تناؤ کا شکار چلے آ رہے ہیں۔ نوبت یہاں تک پہنچ چکی کہ معمولی واقعات کشیدگی بڑھا دیتے ہیں۔ سفارت کاروں کو تنگ کرنے کا حالیہ واقعہ ثبوت ہے۔ غرض برصغیر کی تاریخ میں ممبئی حملے حقیقتاً انقلاب ساز ثابت ہوئے۔ انھوں نے پاکستان کے لیے علاقائی ہی نہیں عالمی سطح پر بے انتہا مسائل کھڑے کر دیے۔ اس گمراہ کن پلان کے بطن سے جنم لینے والی انتہائی منفی تبدیلیاں آہستہ آہستہ ہی کافور ہوں گی۔ ♦♦♦

سیّد عاصم محمود

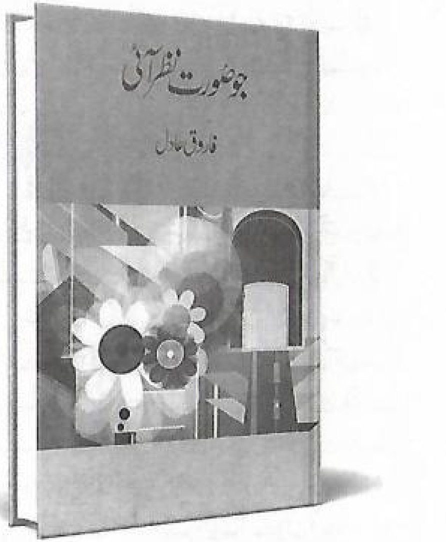

شعور کی آنکھ کھلی تو چاروں جانب رنگ برنگ کتب پائیں۔ ان میں آپ بیتی اور خاکوں پر مشتمل کتابیں مرغوب ٹھہریں۔ ممتاز خاکہ نگاروں میں مولانا سلیمان ندوی، شاہد احمد دہلوی، ملا واحدی، منٹو، اخلاق احمد دہلوی، ڈاکٹر عبادت بریلوی وغیرہ شامل ہیں۔ یہ بات باعث مسرت ہے کہ اب اس مختصر فہرست میں جناب فاروق عادل کا نام بھی شامل ہو چکا۔

خاکوں کی خاصیت یہ ہے کہ وہ قاری کو مختلف النوع شخصیات کے اچھے برے پہلوؤں سے روشناس کرواتے ہیں۔ خصوصاً خاکے میں درج واقعات سے انسان صراط المستقیم پر چلنے کا طریقہ سیکھتا ہے۔ خیر کے واقعات سے جوش و ولولہ پاتا اور شر انگیز واقعوں سے عبرت پکڑتا ہے۔ اگر یہ خاصیتیں عمدہ خاکوں کی کسوٹی قرار پائیں، تو فاروق عادل کی تخلیق ''جو صورت نظر آئی'' میں بہار دکھلاتے خاکے اس پر پورے اُترتے ہیں۔

فاروق صاحب نے ۳۲ شخصیات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ جہاں ایک طرف ان میں قائداعظم، ائیر مارشل محمد اصغر خان، ائیر کموڈور ایم ایم عالم، میاں طفیل محمد، پروفیسر غفور احمد، ڈاکٹر وزیر آغا، محمد صلاح الدین، احمد ندیم قاسمی اور الطاف حسن قریشی جیسی نامور ہستیاں شامل ہیں تو وہ بھی جنھیں ذاتی تعلق کی خاطر یا منفرد خوبیوں کی بناء پر چنا گیا مگر خاکہ کسی بھی ہستی کا ہو، وہ قاری کی جھولی میں کچھ نہ کچھ ضرور ڈالتا اور اُسے غور و فکر کا سامان دے جاتا ہے۔

فاروق صاحب کئی برس سے سیاسی ہفت روزہ تکبیر میں بطور صحافی ذمے داری نبھا رہے ہیں۔ باقاعدہ صحافت میں داخل ہو کر عموماً انداز تحریر بگڑ جاتا ہے لیکن انھوں نے اپنی ادیبانہ حس کو زندہ رکھا۔ اسی کی بدولت وہ اپنے خاکوں میں بھی شگفتگی، بشاشت و سلاست کو جنم دینے میں کامیاب رہے۔

''جو صورت نظر آئی'' کے خاکوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ہر ممدوح کی شخصیت کا یک طرفہ رخ دکھائی نہیں دیتا بلکہ تصویر کے دونوں اطراف دکھائے گئے ہیں۔ ان میں جذبات ہیں، معلومات اور فکر انگیز نظریات بھی۔ گویا انھیں ہر شخص کی زندگی کے سہ آتشہ مختصر نثر پارے سمجھ لیجیے۔

معنوی لحاظ سے یہ کتاب گوناگوں خوبیاں رکھتی ہے تو ظاہری طور پر بھی اس کی تزئین و آرائش میں بڑا اہتمام برتا گیا ہے۔ کاغذ معیاری ہے اور چھپائی اعلیٰ۔ خاکہ نویسی ہی نہیں تاریخ، ادب، سیاست اور معاشرت سے دلچسپی رکھنے والی خواتین و حضرات اسے ایسی منفرد کتاب پائیں گے جسے پڑھ کر انسان کچھ پاتا ہی ہے، کھوتا کچھ نہیں۔ ◆◆◆

عافیہ مقبول جہانگیر

کوئی عہدہ نہ ہونے کے باوجود لیبیا کے دوسرے بااثر ترین انسان کی زندگی

شاہ سے گدا تک

چند مسلمان حکمرانوں کی عیاشیاں پورے عالمِ اسلام کو مہنگی پڑ سکتی ہیں

ایک ویران سی جگہ پر واقع کھنڈر نما مکان سے ۱۹ ر نومبر ۲۰۱۱ء کو ایک ایسے شخص کو گرفتار کیا گیا جو اُس کمرے میں تقریباً پانچ یا چھ ماہ سے چھپا ہوا تھا۔ وہ شدید زخمی اور بیمار تھا۔ کمرے کی حالت اتنی خستہ تھی کہ اُس میں نہ تو کوئی روشنی کا مناسب انتظام تھا اور نہ ہی کمرے میں تازہ ہوا آنے کا کوئی راستہ موجود تھا۔ یہاں تک کہ کمرے میں باتھ روم تک کی سہولت بھی میسر نہ تھی۔ اُس شخص کا کھانا پینا، سونا اور رفع حاجت وغیرہ سب کچھ اس کمرے کی چار دیواری کے اندر ہی محدود تھا۔

جب اُس شخص کو گرفتار کیا گیا تو اُس کی حالت دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ کئی دنوں سے بھوکا پیاسا ہے اور کئی ہفتوں سے نہایا ہوا بھی نہیں۔ اُس کمرے میں پڑا فوم کا گدا، تکیہ اور کمبل اس قدر گندے اور بدبودار تھے کہ اُن کو استعمال کرنا تو درکنار، دیکھ کر بھی گھن محسوس ہوتی تھی۔ گندے اور بدبودار کمبل میں لپٹا گرفتار ہوا وہ شخص کوئی عام آدمی نہیں بلکہ کچھ عرصے پہلے تک دنیا کا ایک امیر ترین شخص تھا اور اُس کا شمار دنیا کے چند بااثر لوگوں میں ہوتا تھا۔

وہ انتہائی پُرآسائش زندگی گزارتا اور اپنی عیاشیوں پر کروڑوں ڈالر کھڑے کھڑے خرچ کرنے کا عادی تھا۔ اُس امیرزادے کی شہ خرچیوں کا یہ عالم تھا کہ ایک بار لندن میں وہ اپنی کار پر سفر کر رہا تھا کہ دورانِ سفر اُسے شمالی لندن کا ایک خوبصورت گھر پسند آ گیا۔ اُس نے اُسی وقت وہ گھر خریدنے کا فیصلہ کر لیا، لیکن مالک اپنا گھر بیچنے پر تیار نہ تھا۔ امیرزادے نے ضد میں آ کر گھر کی ڈبل قیمت وہیں کھڑے کھڑے ادا کر کے آخرکار وہ گھر ایک کروڑ برٹش پاؤنڈز میں خرید ہی لیا۔ پاکستانی روپے کے مطابق اس کی مالیت ایک ارب چالیس کروڑ بنتی ہے۔

۲۰۰۹ء میں اس نے اپنی ۳۷ ویں سالگرہ منائی جو دنیا کی سب سے مہنگی ترین سالگرہ تھی۔ اس سالگرہ میں دنیا کی امیر ترین شخصیات نے شرکت کی۔ جس میں روس کے ٹائیکون، سونے کی کانوں کے مالک، موناکو کے پرنس البرٹ دوم بھی شامل تھے۔ اُس کا ایک اور مہنگا اور بڑا شوق پینٹنگز

تھا۔اس کے پاس اربوں ڈالر مالیت کے شہ پارے تھے جو اس کے گھر کی زینت تھے۔

برطانیہ کے وزیرِ ٹونی بلیئر اسے "مائی فرینڈ" کہتے تھے۔ برطانوی شاہی خاندان نے انہیں کئی بار اپنے محلات میں مہمان کے طور پر ٹھہرایا اور ان کی خوب آؤ بھگت کی جاتی تھی۔ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ یہ اکثر برطانیہ کے شاہی خاندان کے خاص مہمان ہوا کرتے تھے۔اس نے اپنی زندگی کی بیشتر شاموں کا حصہ پلے بوائے کی حیثیت سے لندن اور پیرس میں گزارا۔ پیرس کی خوشبو ساز کمپنیاں اس کے لیے ایسے خاص پرفیوم بنایا کرتی تھیں جو عام آدمی کے لیے نہیں ہوتے تھے اور نہ ہی بازار میں دستیاب ہوتے۔

شاہ خرچ اور عیاش پسند ہونے کے ساتھ ساتھ یہ امیر زادہ قانون شکن بھی تھا۔ قانون کے ساتھ کھیلنے اور اسے توڑنے میں یہ ایک خاص لطف اور تفریح محسوس کیا کرتا تھا۔ ایک بار اس نے پیرس کی ایک مشہور شاہراہ پر ایک سو بیس کلومیٹر کی رفتار سے گاڑی چلا کر پوری یورپی دنیا کو حیران کر ڈالا اور ساتھ ہی وہاں کی سٹی حکومت کے قابو نہ آ کر اُس کو بڑا چیلنج دیا۔ کوشش کے باوجود اس کا چالان نہ ہو پایا۔

۲۰۰۶ء میں اسے ایک اسرائیلی اداکارہ اورلے وِنزے سے عشق ہوگیا۔ کہا جاتا ہے کہ اورلے وِنز دنیا میں سب سے زیادہ مہنگی گرل فرینڈ ثابت ہوئی جس کے گرد اس کے عاشق نے دولت کے انبار لگا دیے تھے۔

یہ مشہور و معروف شخص کوئی اور نہیں، لیبیا کے سابق حکمران معمر قذافی اور اس کی دوسری بیوی کا بیٹا سیف الاسلام تھا۔ جس کی موجودہ زندگی آج کی تاریخ میں سوائے عبرت کے اور کچھ نہیں۔

اتنی با اثر شخصیت ہونے کے باعث دنیا سمجھتی تھی کہ کرنل قذافی کے بعد یہی لیبیا کا حکمران ہوگا مگر ایسا نہ ہوا۔ اس نے باقاعدہ طور پر کوئی بھی سیاسی عہدہ لینا منظور نہ کیا البتہ پسِ پردہ اپنے والد معمر قذافی کے تمام اندرونی معاملات یہی سنبھالتا تھا۔ شاید یہ واحد ایسا شخص تھا جو کوئی عہدہ نہ رکھنے کے باوجود لیبیا کا دوسرا با اثر ترین انسان ہونے کا شرف رکھتا تھا۔ حکومتی معاملات میں اس کا اثر اور دخل اس حد تک تھا کہ کرنل قذافی کو نیوکلیئر پروگرام شروع کے لیے بھی اسی نے قائل کیا۔

سیف الاسلام اپنے ملک کی انویسٹمنٹ اتھارٹی کا سربراہ تھا اور یہ اتھارٹی اتنی طاقتور تھی کہ دنیا کے کسی بھی ملک میں کسی بھی وقت دس بلین تک کی سرمایہ کاری کرسکتی تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ واقعی بہت بڑی بات تھی۔ ایسی شان و شوکت سے زندگی گزارنے والا یہ شخص شاید سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ کبھی اس کی زندگی دنیا کے لیے عبرت ناک بن جائے گی۔ کرنل قذافی کی حکومت ختم ہونے کے بعد سیف الاسلام لیبیا کے ایک چھوٹے سے قصبے میں روپوش ہوگیا اور پھر اسے انتہائی مخدوش حالت میں برآمد کیا گیا۔ اس کے ایک ہاتھ کی دو انگلیاں کٹی ہوئی تھیں اور ان پر پلستر لگا ہوا تھا جو اس نے خود ہی چڑھایا تھا۔ کیونکہ وہ کسی ڈاکٹر سے علاج کروانے کے قابل تک نہ رہا تھا اور نہ ہی اسے کسی قسم کی طبی سہولیات میسر تھیں۔ نومبر ۲۰۱۱ء سے لے کر جون ۲۰۱۷ء تک سیف الاسلام لیبیا حکومت کے قبضے میں رہا۔ اتنے امیر کبیر با اثر شخص کو پناہ دینے والا پوری دنیا میں کوئی ایک انسان بھی نہ تھا۔ وہ دن فاختہ ہوچکے تھے جب اسے سر آنکھوں پہ بٹھایا جاتا تھا اور برطانوی شاہی خاندان اسے اپنا مہمان بنانے پر فخر کرتا تھا۔

چھ سال لیبیا میں ایک مسلح گروہ کی قید میں رہنے کے بعد ۲۰۱۷ء جون میں اسے عام معافی کی بنیاد پر رہا کر دیا گیا۔

جو حکمران عوام کا اعتماد حاصل نہیں کرتے اور جو اپنے اثر و رسوخ کو محض اپنی ذاتی زندگی کی عیاشیوں کے لیے استعمال کرتے ہیں، نیز اپنی دولت و طاقت سے عوام کا جینا دوبھر کیے رکھتے ہیں۔ جو اس قدر مغرور ہوتے ہیں کہ اپنے سوا انہیں دنیا کا ہر عام شخص کیڑے مکوڑے سے زیادہ نظر نہیں آتا، اُن جیسوں کے لیے سیف الاسلام آج کی تاریخ کا سب سے بڑا عبرت انگیز اور سبق آموز نام ہے۔ ◆◆◆

آمنہ اقبال

پکائی تھی کھیر!

ایک نوجوان کے خوابوں کا محل جب دھڑام سے گر پڑا

اشفاق جہاز سے اُتر کر اسلام آباد ہوائی اڈے سے نکلا ہی تھا کہ آصف نے اپنے دوست کو خوش آمدید کہا۔ بھینچ کر گلے لگایا اور پھر اس کے ہاتھ سے اٹیچی کیس لیتے ہوئے اُسے اپنی کار تک لے گیا۔ کار چل پڑی تو اشفاق نے آصف کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

"یہ دوسری دفعہ ہے کہ تم نے تار دے کر پھر اسی کام کے لیے طلب کیا ہے۔"

"تو پھر کیا ہوا؟ آصف بولا: کام بھی تو اتنا ہی اہم ہے۔ تمھارے مشورے کے بغیر کیسے فیصلہ کرسکتا ہوں؟"

"میاں! لڑکی چُننا کہاں کا اہم کام ہے؟ بس لڑکی ہو، چہرہ مہرہ ٹھیک ہو، قد کاٹھ درست ہو اور راضی ہو، تو پڑھا لو دو بول!"

"دوست! چہرے مہرے ہی کے لیے تو تمہاری پسند معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔"

"مگر شادی تم نے کرنی ہے۔ پسند مجھ سے کرواتے ہو۔ کچھ سمجھ نہیں آرہا۔"

"دیکھو اشفاق، سیدھی سی بات ہے۔ یوں تو میں یہ کام کسی نائی یا نائن کو بھی سونپ سکتا تھا لیکن نائیوں کے بس کا کام نہیں۔ اس کے لیے کسی تعلیم یافتہ اور ہمدرد دوست کی ضرورت ہے اور بہر حال میں تمہیں نائیوں پر ترجیح دیتا ہوں۔"

"اس نوازش کا شکریہ، مگر تعلیم اور ہمدردی والی خوبیاں تو تمہارے کئی دوسرے دوستوں میں بھی ہیں۔ آخر مجھے اتنی دور سے بلا کر لڑکی دیکھنے میں کیا حکمت ہے؟"

"حکمت میرے پیارے دوست" یہ ہے کہ

لڑکی امریکن ہے اور تم پورے پانچ سال امریکا میں رہے ہو۔ اتنے نازک مسئلے میں تم سے زیادہ ”ایکسپرٹ“ مشورہ کون دے سکتا ہے؟

”تو یہ بات ہے! لیکن صاحب زادے' میں امریکا میں انجینئرنگ پڑھتا رہا ہوں۔ دلہنوں کو پرکھنا میرے نصاب میں شامل نہ تھا۔“

”اوہ یار' تم اُس سے امریکی لہجے میں انگریزی تو بول سکو گے اور بہر حال میری چھٹی حس بتاتی ہے کہ اگر تم نے اسے پاس کر دیا تو وہ میرے لیے بڑی صحیح بیوی ثابت ہوگی۔“

”تو کیا مجھے اسے تحریری پرچہ دینا پڑے گا؟“ اشفاق نے چونک کر پوچھا۔

”تحریری نہیں، تقریری۔ اس کے ماں باپ ہماری سڑک پر ہی قریب کے بنگلے میں رہتے ہیں۔ لڑکی دیکھی تو یوں بھی جا سکتی ہے مگر میں چاہتا ہوں کہ انٹرویو کے لیے تم ان کے گھر ”کال“ کرو۔“

”کیا تم ”کال“ کر چکے؟ اشفاق نے پوچھا“۔

”نہیں۔“

”لڑکی سے علیک سلیک ہوتی ہے؟“

”نہیں۔ بس' ذرا فاصلے سے دیکھی ہے۔۔۔ گویا صرف ”سلیک“ ہوئی ہے۔“

”خوبصورت ہے؟“

”بھئی سچی بات ہے تا حال اسے سامنے سے نہیں دیکھا۔“

”تو کیا اس کی کمر سے عشق ہو گیا ہے؟“

”صرف کمر ہی سے نہیں، اس کے بالوں سے بھی جو سونے کا ڈھیر ہیں، اس کے بازوؤں سے بھی جو مرمر کی شاخیں ہیں۔ قد سے بھی جو سرو کا بوٹا ہے۔ بس، تم رو برو ہو کر اس سے دو باتیں کر کے اتنی تصدیق کر دو کہ وہ واقعی میرے خواب کی تعبیر ہے۔“

”مگر میرے شاعر یار، مجھے تمہارے خوابوں کے بارے میں کیا معلوم؟ میں تو زیادہ سے زیادہ تمہیں یہ بتا سکوں گا کہ وہ میرے خواب کی تعبیر ہے یا نہیں۔“

”چلو منظور!“ آصف نے وفور شوق سے کہا۔ ”مجھے یقین ہے تمہیں بھی بڑے معیاری خواب آتے ہوں گے۔“

گاڑی آہستہ آہستہ آصف کی کوٹھی میں داخل ہونے لگی تو اشفاق بولا:

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہاری امریکی محبوبہ کا دولت کدہ کس طرف ہے؟“

”ایک کوٹھی چھوڑ کر دوسری۔“ آصف نے ادھر ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”تو کیا دوربین سے دیدار کیا کرتے ہو؟“ اشفاق نے پوچھا۔

”نہیں، وہ دور سے بھی چمکتی ہے۔ ہیرا ہے ہیرا!“

آصف نے گاڑی گیراج میں کھڑی کی تو اشفاق باہر نکلتے ہوئے بولا:

”دیکھو، پہلے مجھے ذرا غسل کر لینے دو۔ پھر چائے پیتے اور تازہ دم ہو کر تمہاری شادی کا بندوبست کرتے ہیں۔ میں انشاء اللہ چار بجے اُن کے گھر جاؤں گا۔“

ابھی تین ہی بجے تھے لیکن آصف بے تاب ہو رہا تھا۔ اس نے نوکر کو چائے کا حکم دیا اور خود چمن میں بیٹھ کر بے صبری سے اشفاق کا انتظار کرنے لگا۔ وہ ہر چند منٹ بعد اپنے ”متوقع“ سسرالی بنگلے کی طرف نگاہ دوڑاتا کہ شاید وہ سرو نظر آ جائے۔ کوئی پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ آصف کے کان میں آواز آئی:

”تو جناب، اب سنائیں اپنی داستان محبت اور ذرا تفصیل سے؟“

یہ اشفاق کی آواز تھی جو غسل سے فارغ ہو کر آصف کی طرف چمن میں آ رہا تھا۔ آصف اشفاق کی سنجیدگی اور ہمدردی

پر خوش ہوا، بولا:

”معلوم ہوتا ہے اس دفعہ تم سچ مچ میری شادی میں گہری دلچسپی لے رہے ہو۔“

”دلچسپی تو میں نے پچھلی دفعہ بھی اتنی ہی گہری لی تھی، فقط یہ کہ لڑکی بھینگی نکل پڑی حالانکہ مجھے بلانے سے پہلے تمہیں کم از کم اس کی آنکھوں کی چال دیکھ لینا چاہیے تھی۔“

”وہ غلطی ہو گئی تھی“ آصف شرمندگی سے بولا۔ ”معافی چاہتا ہوں۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ یہ لڑکی ہر لحاظ سے اے ون ہے!“

”کس کس لحاظ سے؟ ذرا اس مہ وش کا مزید حدود اربعہ بھی بیان کرو۔“

”یار کہہ تو چکا ہوں، قد کی لمبی ہے، جسم کی پتلی ہے، بال سنہرے ہیں، قومیت امریکی ہے۔۔۔“

”اور چونکہ امریکی ہے، اشفاق نے گرہ لگائی۔ ”لہٰذا سرخ ہے، سپید ہے، براق ہے، برندہ ہے۔۔۔“

”بالکل بالکل“ آصف نے تائید کی۔ ”اتنی سرخ، اتنی سپید کہ پچھلی نہ سہی، اگلی سات پشتوں کی قلعی ضرور کر دے گی۔“۔۔۔ یہ کہہ کر آصف ہنس پڑا۔

”مگر تمہارا اپنا وائٹ واش کون کرے گا؟“ اشفاق نے آصف کے سانولے رنگ پر چوٹ کرتے ہوئے ذرا شرارتی انداز میں پوچھا۔

”میرے امریکا پلٹ دوست“ آصف نے کسی قدر طنزاً کہا: ”یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ امریکی لڑکیوں کو گہری جلد والے اور ان ڈھلے، ان کٹے بالوں والے کھردرے مرد اچھے لگتے ہیں۔“

”یعنی تم جیسے؟“

”بالکل!“ آصف نے کسی قدر سینہ پھلا کر کہا۔

”مگر تمہارے چہرے پر تو مونچھ ہے نہ ڈاڑھی۔“

”بھئی، مونچھ ڈاڑھی بے شک اضافی خوبی ہے مگر اصل

غزل

کس حال میں ہے کوئی، اُس کو نہیں خبر
اب تو زباں پر تذکرہ اپنی جفا کا تھا
وہ لاکھ پشیماں ہوں، سر سے پانی اُتر گیا
اب ڈھونڈتا جواز ہے جو بھی خطا کا تھا
عمر بھر نبھاتے رہے جو ہر خطا کو ہم
دانستہ جرم بھی اس کی پہلی ادا کا تھا
یہی شب فراق شبِ غم بھی ہو گئی
اب راستہ سامنے بس اپنی فنا کا تھا
اَب تو بہار کیا، خزاں بھی نہیں رہی
عبرت کا ہر مقام بھی فقط آشنا کا تھا
اَب تو بتاؤ تو نقی بھلا کیسے گزر گئی
ہر لمحہ زندگی کا بس صبر آزما کا تھا

نقی حسین نقی امروہوی

آنکھیں بھیگ جاتی ہیں

دیارِ غیر میں کیسے تجھے صدا دیتے
تو مل بھی جاتا تو آخر تجھے گنوا دیتے
تمہی نے ہم کو سنایا نہ اپنا دکھ ورنہ
دعا وہ کرتے کہ ہم آسماں ہلا دیتے
ہمیں یہ زعم رہا اب کے وہ پکاریں گے
انھیں یہ ضد تھی کہ ہر بار ہم صدا دیتے
وہ تیرا غم تھا کہ تاثیر میرے لہجے کی
کہ جس کو حال سناتے اسے رُلا دیتے
تمہیں بھلانا ہی اول تو دسترس میں نہیں
جو اختیار بھی ہوتا تو کیا بھلا دیتے
ہم اپنے بچوں سے کیسے کہیں کہ یہ گڑیا
ہمارے بس میں جو ہوتی تو ہم دِلا دیتے

سید وصی شاہ (انتخاب: ابوالحسین آزاد، چکوال)

چیز سر کے بال ہوتے ہیں۔

"یہ جنگل تو میں صبح سے دیکھ رہا ہوں۔" اشفاق نے آصف کے سر پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "لیکن لڑکیاں کوئی مکھی مچھر تو نہیں ہوتیں کہ بالوں کے جال میں پھنس جائیں۔"

آصف مسکرایا اور بولا۔ "اشفاق، میرے پیارے یار، مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ لڑکیاں مکھیاں ہوتی ہیں یا مچھر مگر آج تک اس جال سے بہت کم بچ کر نکلی ہیں۔"

"چلو مان لیا مگر ایک امکان تو باقی ہے کہ یہ امریکی مکھی تمہاری ہزار خواہش کے باوجود تمہیں رد کر دے اور تمہارے جال کی طرف دیکھے بھی نہ۔ ایسا ہوا تو بڑی سبکی ہوگی۔"

"تم فکر مت کرو، اشفاق۔" آصف اشفاق کو گھورتے ہوئے بولا۔ "یہ جال غیر ملکی مکھیوں کے لیے بھی اتنا ہی پُرکشش ہے۔"

"داد دیتے ہیں تمہارے اعتماد کی دوست" اشفاق نے ہنستے ہوئے کہا۔

"مگر اب داد کا نہیں، امداد کا وقت ہے۔ دیکھو چار بجنے والے ہیں۔"

"بجنے والے ہیں، بج تو نہیں گئے۔ ذرا دم لو۔ ابھی کھٹکھٹاتے ہیں تمہاری سسرال کا دروازہ۔"

چمن کی گھاس پر سنہری دھوپ کی آخری کرنیں پڑ رہی تھیں۔ اشفاق آرام کرسی پر نیم دراز تھا اور آصف پاس کھڑا جیبوں میں ہاتھ ڈالے، حسب عادت سامنے والی کوٹھی کی طرف متوجہ تھا۔ دفعتاً آصف کے منہ سے نکلا:

"وہ دیکھو سامنے ٹیرس پر۔ پھر اپنا کتا لیے کھڑی ہے مگر..." وہ جھنجھلا اٹھا:

"جب بھی دیکھو، واپس مڑنے کو تیار ہوتی ہے۔"

اشفاق نے فوراً اُٹھ کر دیکھا۔ واقعی ایک پتلی، نازک سی، سنہرے بالوں والی لڑکی نیلی جینز اور لال جرسی پہنے، پشت کیے، اپنے سفید بالوں والے کتے کے پیچھے بھاگتے، سیڑھیاں اُترتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

"چار بج چکے۔" آصف نے اشفاق کو گھڑی دکھاتے ہوئے کہا۔ "اب چلو بھی۔ اس وقت وہ گھر ہی میں ہے۔"

لیکن پیشتر اس کے کہ اشفاق کوئی حرکت کرتا، وہی سفید سفید نرم نرم بالوں والا کتا، بھاگتا ہوا کوٹھی کی باڑھ سے اندر آ گیا۔

"ہیلو ڈارلنگ۔" آصف نے دو قدم آگے بڑھ کر اسے یوں لپیٹ لیا جیسے برسوں کی گمشدگی کے بعد ملا ہو۔

"LOVE ME! LOVE MY DOG" (مجھ سے پیار ہے، تو میرے کتے کو بھی چاہو) اشفاق نے آصف کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

"تم کچھ بھی کہو، یہ اچھا شگون ہے۔" آصف کتے کو بازوؤں میں لپٹائے پیار کرتے ہوئے بولا۔

دفعتاً کوٹھی کے آہنی گیٹ پر نازک سی انگلیاں بج اٹھیں۔ اشفاق اور آصف نے چونک کر دیکھا۔ گیٹ کے نیچے سے نازک سی چپل پہنے گلابی گلابی پاؤں جھانک رہے تھے۔ پھر اُن کی نظریں اُوپر اُٹھیں تو گیٹ کے کنارے سے سفید چمکتے ماتھے کی جھلک دکھائی جس پر سنہرے بالوں کی لٹ گھر آئی تھی اور دو خوبصورت نیلگوں آنکھیں، تبسم بکھیرتی، اشفاق اور آصف پر مرکوز تھیں۔ گیٹ کی اونچائی کی وجہ سے وہ امریکی حسن کا شاہکار اگرچہ پوری طرح نظر نہیں آ رہا تھا تاہم اشفاق یہ ماننے پر مجبور ہوگیا کہ آصف کا انتخاب واقعی لاجواب ہے۔

"Come In" (اندر آئیے)۔ آصف نرم نرم بالوں سے سر اٹھاتے ہوئے بےترتیب سانسوں کے درمیان بولا۔

"I AM JOHN. I HAVE COME TO FETCH MY DOG"!

"(میں جان ہوں۔ میں اپنا کتا لینے آیا ہوں!)"

اور کتا اب آصف کے بازوؤں سے بر سر پیکار تھا۔

اُسامہ عبدالقادر

فاتح ہمدان کہلائے جانے والے عظیم صحابی کی ایمان افروز داستانِ حیات

صحرائے عرب میں سرما جیسی راتوں کی طرح ہی وہ ایک غضب کی رات تھی۔ رات ایسی اندھیری کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا اور اُوپر سے طوفان ایسا زوروں پر کہ صحرا کے مضبوط پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہلتے نظر آتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ محاذ پر ڈٹے ہوئے تھے۔ ایک مہینے سے کفار عرب و یہود یثرب نے تین اطراف سے زبردست محاصرہ کر رکھا تھا۔ مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ ان کی آنکھیں مسلسل جاگنے سے پتھرا گئی تھیں۔ پریشانی سے کلیجے منہ کو آنے لگے تھے اور ہلاک کر دینے والی بھوک سے صحابہؓ نڈھال تھے۔ "جب وہ تمہارے اُوپر نیچے کی طرف سے تم پر (دشمن چڑھ) آئے اور جب آنکھیں پھر گئیں اور دل (مارے دہشت کے) گلوں تک پہنچ گئے اور تم اللہ پر طرح طرح کے گمان کرنے لگے (اُمید و یاس کے ساتھ)۔" (سورہ احزاب آیت نمبر-۱۰)

فریق ثانی بھی عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ وہ تو فقط مدینہ کو فتح کرنے آئے تھے لیکن خندقوں کو دیکھ کر اُن کے ہوش اُڑ گئے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی میں خندقیں دیکھی تھیں اور نہ اس سے پہلے کبھی ان کے بارے میں سنا تھا۔ مجبوراً انھیں خندقوں کے اس پار ہی قیام کرنا پڑا۔

سب سے بڑا مسئلہ اتنے بڑے لشکر کے قیام وطعام کا تھا جس کا وہ قطعاً انتظام نہیں کر کے آئے تھے اور بنو قریظہ کے یہودی جن سے انھیں بڑی امیدیں وابستہ تھیں، عین مصیبت کے وقت ساتھ چھوڑ گئے اور اُس رات تو حد ہوگئی۔ طوفانی ہواؤں کی زد میں آ کر ان کے خیمے اُکھڑ گئے اور دیگیں اُلٹ گئیں۔

جنگ کے ایسے فیصلہ کن موقعوں پر وہی کامیاب رہتا

ہے جو آخر دم تک ثابت قدم رہتا ہے اور جو صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے وہ ناکام و نامراد ہوتا ہے۔

ایسے موقع پر کامیاب سپہ سالار کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ فریق ثانی کے حالات سے باخبر رہے۔ سپہ سالار اعظم ﷺ بھی کفار کے حالات سے باخبر ہونے کے لیے کسی ایسے موزوں شخص کی تلاش میں نکلے جو انھیں حالات سے باخبر کر دے۔ آپ ﷺ کی نگاہِ مبارک جا کے جس موزوں شخصیت پر پڑی وہ حضرت حذیفہؓ بن یمان تھے۔

آپ ﷺ کا معمول تھا کہ آپ ﷺ صحابہؓ کرام کو اپنی نگاہ بصیرت سے خوب اچھی طرح جانچتے۔ جس صحابی میں کوئی خوبی پاتے، مناسب وقت پر اس سے وہ کام لے لیتے۔ آپ ﷺ نے حضرت حذیفہؓ میں جو خوبیاں پائی تھیں۔ اُن میں سے احساس ذمہ داری اور راز داری آپؓ کی قابل دید خوبیاں تھیں۔

اسی لیے آپ ﷺ خفیہ امور آپؓ ہی کو بتاتے تھے۔ آپؓ کے علاوہ کسی کو بھی ان کی خبر نہ ہوتی۔ حتیٰ کہ آپ ﷺ نے ریاست مدینہ کے اندرونی دشمنوں یعنی منافقین کے نام فقط حضرت حذیفہؓ ہی کو بتائے تھے۔

بعض اکابر صحابہؓ کرام نے بہت کوشش کی کہ وہ اُن سے نام اُگلوائیں لیکن آپؓ مرتے دم تک راز اپنی زبان پر نہ لائے۔ حضرت عمرؓ جب آپؓ سے منافقین کے نام معلوم نہ کر سکے تو لوگوں سے پوچھتے کہ حذیفہ فلاں شخص کے جنازے میں شریک ہوئے ہیں یا نہیں؟ اگر حضرت حذیفہؓ شریک ہوتے آپؓ سمجھ جاتے کہ یہ منافق نہیں تھا اور اگر حذیفہؓ شریک نہ ہوتے تو آپؓ سمجھ جاتے کہ یہ منافق تھا۔

یہ ان خصوصیات کی مثالیں تھیں جو حضور اکرم ﷺ نے حضرت حذیفہؓ بن یمان میں پائی تھیں۔ ان ہی خصوصیات کی بناء پر حضرت عمرؓ نے جب انھیں مدائن کا گورنر بنا کر بھیجا تو اُن کے استقبال کے لیے شہر کے اُمراء اور سردار شہر کے باہر نکل آئے۔ جب انھوں نے حضرت حذیفہؓ کو بوسیدہ کپڑوں کے ساتھ خچر پر سوار دیکھا تو بے ہوش ہوتے ہوتے بچے۔

آپؓ کی سادگی و درویشی دیکھ کر اندازہ لگانا مشکل ہے کہ آپ تیغ وزن کے بھی ماہر رہے ہیں۔ آپؓ غزوہ بدر کے علاوہ تمام غزوات میں شریک رہے۔ ہمدان، رے اور دینوار کے فاتح بھی آپؓ ہی تھے۔

آپؓ اگر جنگ میں ہوتے تو اپنی بہادری اور وجاہت کے باعث بے مثال نظر آتے۔ اگر عبادت میں ہوتے تو اپنے خشوع و خضوع اور حکمت و دانائی میں باکمال نظر آتے۔ غرض آپؓ کو جو ذمہ داری سونپی جاتی آپؓ پورے حقوق کے ساتھ ادا کرتے تھے۔

آپؓ کی حکمت و دانائی بھی بے مثال تھی۔ آپؓ کا قول بہت مشہور تھا:

''تمہارے اچھے لوگ وہ نہیں جو آخرت کی خاطر دنیا، چھوڑ دیں بلکہ اچھے وہ ہیں جو اِس میں سے بھی حصہ لیتے ہیں اور اُس سے بھی۔''

راز دار رسول اللہ ﷺ فاتح ہمدان اور قابل تقلید شخصیت حضرت حذیفہ بن یمانؓ سن ۳۶ھ میں دار فانی سے کوچ کر گئے۔

آپؓ کی زبان پر آخری الفاظ یہ تھے جو ان کی حکمت و دانائی کا منہ بولتا ثبوت تھے: ''موت کو خوش آمدید، دوست بڑے چاؤ سے آیا ہے جو اس سے شرمندہ ہوا وہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔''

اس کے بعد یہ متقی و پرہیزگار اور عظیم روح اللہ کی جوارِ رحمت میں پہنچ گئی۔ ♦♦♦

کھوئی ہوئی راہیں روشن کر دینے والے مزید اسلامی واقعات کا انتخاب پڑھیں صفحہ ۴۷ پر

صادق بشیر

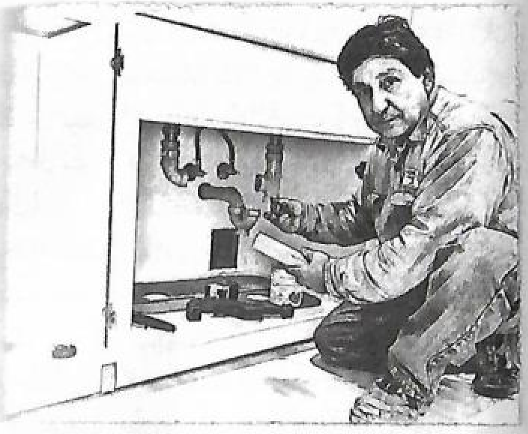

میرا دوست پلمبر

زندگی بھر مشکلات سے نبرد آزما رہنے والے ایک مزدور کا قصہ

ظفر صاحب سے میری پہلی مُلاقات آج سے قریباً دس سال پہلے ہوئی۔ میرے صحن کا نلکا غالباً کام کرنا چھوڑ گیا، تب میں کسی پلمبر کی تلاش میں نکلا۔ جی ہاں، ظفر صاحب ایک پیشہ ور پلمبر تھے۔ محلے کی خراب موٹریں اور نلکے مُرمّت کرتے اور مناسب اُجرت لے کر چلے جاتے۔ دُوسرے کاریگروں کی طرح اُجرت پر بحث نہیں کرتے تھے۔

پہلی بار دیکھنے پر وہ مجھے پلمبر کے بجائے غریب شاعر سے لگے۔ حلیہ ہی کچھ ایسا تھا: دُبلا پتلا بدن، پرانی بھدی سی جینز اور شرٹ میں ملبوس۔ سب سے زیادہ قابل ذکر اُن کے کاندھوں تک آتے لمبے بال تھے۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں جن میں بہت زیادہ چمک تھی۔ عمر قریباً ۵۵ سال۔ جھرّیوں بھرا چہرہ دُھوپ اور ہر قسم کے موسموں میں کام کرنے کا غماز تھا۔ پُرانے ماڈل کی سپورٹس سائیکل سواری تھی۔

میرے گھر نلکا کھولنے کے لیے اپنے چرمی تھیلے سے اوزار نکالے اور پائپ سے زور آزمائی کرنے لگے۔ میں نے کچھ کہنا چاہا، تو انھوں نے سرد سے لہجے میں مجھے ٹوکا اور بولے:

''سر! پلیز مجھے کام کرنے دیں۔ توجہ نہ ہٹائیں۔''

میں حیران سا ہوا۔ بات کرنے کا انداز بھی ان پڑھ کاریگروں والا نہ تھا۔ بہرحال موڈی آدمی سمجھ کر میں چُپکا ہو رہا۔ انھوں نے خاموشی سے کام ختم کیا، اُجرت لی اور اپنی سپورٹس سائیکل پر بیٹھ کر چلتے بنے۔

اس کے بعد گھر میں جب بھی کسی موٹر یا سینٹری کا مسئلہ درپیش ہوتا میں ظفر صاحب کو فون کیا کرتا۔ وہ خاموشی سے مسئلہ سُنتے اور پھر صرف یہ کہتے:

''صادق صاحب آپ کا کام ہو جائے گا۔'' مجھے دوسری کال کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ میں اکثر دفتر میں ہوتا اور ظفر صاحب کی جوابی کال آتی کہ کام ہو گیا ہے۔ شام کو میں اُجرت دیتا تو خاموشی سے رکھ لیتے۔

ایک بار اُن کے ساتھ سائیکل پر حادثہ ہو گیا۔ اس کے بعد وہ ایک دن میرے دفتر آئے اور کہنے لگے۔ ”صادق صاحب مجھے آپ کی مدد چاہیے۔“

حادثے کے نتیجے میں اُن کی ٹانگ میں راڈ ڈالا گیا تھا جس کی وجہ سے وہ مالی بُحران میں مبتلا ہو گئے تھے۔ میں نے فوراً حسب توفیق اُن کی مالی امداد کر دی۔ وہ خاموشی سے شکریہ ادا کر کے لوٹ گئے۔ دو دن بعد اُن کی کال آئی:

”صادق صاحب! میں غریب مگر غیرت والا انسان ہوں۔ آپ نے مُشکل وقت میں میری مدد کر کے بہت احسان کیا۔ میں بہت جلد آپ کا یہ اُدھار چُکا دوں گا۔“

تب میں نے انھیں کہا، یہ اُدھار نہیں تھا۔ صرف آپ کی چھوٹی سی مدد کی تھی۔ مگر ظفر صاحب اُس دن کے بعد میرے احسان مند ہو گئے۔ اُن کا ایک تکیہ کلام تھا جو وہ فون پر کال کے اختتام پر ادا کرتے:

”ملتے ہیں بریک کے بعد۔“

میں اکثر سوچتا کہ دیکھنے میں ظفر صاحب جو لگتے ہیں، حقیقت میں کچھ اور ہیں۔ کئی بار میرے استفسار پہ جواب دیتے کہ میں تنہا آدمی ہوں۔ خاندان شادباغ میں رہتا ہے۔ ایک بڑا بھائی انگلینڈ میں مقیم ہے۔ میں نے کہا، آپ باہر کیوں نہیں چلے جاتے؟ وہ اپنی چُندھیائی آنکھوں سے مجھے دیکھ کر کہتے:

”سر! یہ دُنیا بڑی مُشکل جگہ ہے۔ یہاں کوئی کسی کا نہیں۔ سب غرض کے رشتے ہیں۔ میں محنت کر کے بڑی مُشکل سے پیٹ پالتا ہوں۔ عمر کے اس حصے میں مشقت والا کام کرنا آسان نہیں، مگر کیا کروں، مجبوری ہے۔“

اکثر دفتر میں مجھے کال کرتے کہ صادق صاحب! ”آپ کا چھوٹا دروازہ اکثر تھوڑا کُھلا ہوتا ہے۔ حالات بڑے خراب ہیں۔ اپنے مُلازموں کو تاکید کیا کریں کہ دروازہ بند رکھا کریں۔ ملتے ہیں بریک کے بعد۔“

ایک بار سخت سردیوں کی رات میں پانی کی موٹر خراب ہو گئی۔ دس بجے کا وقت تھا۔ اس وقت کسی کاریگر کا ملنا مشکل لگ رہا تھا۔ میں نے ظفر صاحب کو فون کیا تو کہنے لگے، طبیعت خراب ہے لہٰذا آنا مُشکل ہے۔ تھوڑے وقفے کے بعد اُن کی کال آئی کہ میں آ رہا ہوں۔ کچھ دیر بعد اپنی سپورٹس سائیکل پر سردی سے ہانپتے کانپتے آئے اور موٹر کا نقص ٹھیک کیا۔ میں نے شکریہ ادا کیا تو کہنے لگے ”صادق صاحب! میں غریب ضرور ہوں خود غرض نہیں۔ آپ کا ہمیشہ احسان مند رہوں گا۔“

ایک دن کہنے لگے ”میرے بھائی نے مجھے باہر بُلانے کا وعدہ کیا ہے۔ لہٰذا کچھ عرصے بعد شاید میں باہر چلا جاؤں۔ وہ تو باہر نہ گئے، ہمیشہ لوگوں کی موٹریں ٹھیک کرتے ہی نظر آئے۔ پھر ایک دن کہنے لگے، مجھے ایک پرائیویٹ ٹی وی چینل کے ایک ڈرامے میں مختصر سا کردار ملا ہے۔ اس کی آمدنی ہو گی تو پھر اکاؤنٹ کی ضرورت پیش آئے گی۔ میں نے اپنے بینک میں اُن کا اکاؤنٹ کُھلوا دیا۔ کافی دنوں بعد

> **بامحاورہ اُردو**
>
> ایک بار حضرت داغؔ اپنے ساتھیوں سمیت ’پھول والوں کی سیر‘ میں گئے۔ داغؔ پان کے رسیا تھے۔ ایک نوجوان اور شوخ پنواڑن کی دکان سجی دیکھ کر اس کی طرف بڑھے اور پنواڑن سے بولے، ”بی پنواڑن! دس پان لگانا“۔
>
> پنواڑن نے جوتی کی نوک پر ہاتھ لگا کر کہا، ”کیا فرمایا، کتنے لگاؤں؟“
>
> مرزا داغؔ جھینپ گئے اور پنواڑن سے صحیح محاورہ سن کر چوکڑی بھول گئے اور سنبھل کے بولے، ”دس پان بنانا“۔
>
> دلّی کی پنواڑنیں بھی بامحاورہ اُردو بولتی تھیں۔

محلے کی مارکیٹ میں نظر آئے۔ میں نے پوچھا تو سرد آہ بھر کر کہنے لگے:

”سر جی! کام کچھ چلتا نظر نہیں آ رہا۔“

پھر ایک روز کام کے دوران بتایا ”کافی دنوں سے طبیعت ٹھیک نہیں۔ سینے پر بوجھ پڑا رہتا ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے آرام کرو۔ بھلا اب آپ ہی بتائیں کہ آرام کروں گا تو کمرے کا کرایہ کہاں سے دُوں گا، دو وقت کی روٹی کا بندوبست کہاں سے ہو گا؟ سرکاری اسپتال جاتا ہوں تو وہاں نفسا نفسی کا عالم ہے۔ غریب آخر کہاں جائے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں گھر کا کھانا کھاؤ۔ میں تو اکیلا ہوں۔ یہ کیسے مُمکن ہے۔ بہت مشکل ہے۔ یہ زندگی بڑی ظالم شے ہے۔“

وقت گزرتا چلا گیا۔ کافی دن بعد ظفر صاحب مارکیٹ میں ایک جگہ خاموش بیٹھے نظر آئے۔ میں نزدیک سے گزرا تو مجھے سلام کیا۔ میں نے حال احوال دریافت کیا تو کہنے لگے:

”کارڈیالوجی اسپتال میں ایک دوست نے بڑے ڈاکٹر سے وقت لے کر دیا ہے۔ اُس نے ایک ماہ بعد آنے کو کہا ہے۔ اُس ٹیسٹ میں پتا چل جائے گا کہ کیا مسئلہ ہے۔ آپ دُعا کریں۔“

میں نے اُن کا حوصلہ بڑھایا اور آگے بڑھ گیا۔ دو دن بعد میں دفتر میں بیٹھا تھا کہ اُن کی کال آئی کہ میرا اکاؤنٹ منجمد ہو گیا ہے۔ کچھ پیسے جمع کروا کر اسے چلانا چاہتا ہوں۔ میں نے طریقہ کار بتایا تو کہنے لگے، ”صادق صاحب آپ ہمیشہ میری مدد کرتے ہیں۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔ ملتے ہیں بریک کے بعد!“

۲۶ ر مارچ ۲۰۱۷ بروز اتوار مجھے سینٹری کا ایک مسئلہ درپیش آ گیا۔ دوپہر کے وقت میں نے ظفر صاحب کا نمبر ملایا۔ کافی دیر بعد کال ملی۔

ایک نامانوس سی آواز نے ہیلو کہا۔ پیچھے ٹریفک کا شور تھا۔ میں سمجھا شاید رانگ نمبر مل گیا ہے۔ دوبارہ نمبر ڈائل کیا تو اُسی نامانوس شخص نے ہیلو کیا۔ میں نے کہا:

”یہ ظفر پلمبر کا نمبر ہے؟“

اُس آدمی نے جواب دیا۔ ”ہاں جناب۔ آپ کون بول رہے ہیں؟“

”ظفر صاحب سے بات کرنی ہے۔“ میں نے کہا۔

ٹریفک کے شور میں اُس آدمی نے ذرا توقف سے کہا ”جی۔ ظفر صاحب تو ابھی گھنٹہ پہلے فوت ہو گئے ہیں۔“

یہ سن کر میں سناٹے میں آ گیا۔ ایسا لگا جیسے وہ آواز کسی گہرے کنویں سے آ رہی ہے۔

”کیا مطلب...! آپ کون ہیں؟“ الفاظ میرے حلق میں پھنس گئے۔

”جی! میں انھیں تھوڑی دیر پہلے اسپتال لے کر آیا تھا۔ وہ انتقال کر گئے ہیں۔ دل کا دورہ پڑا تھا۔“ وہ آدمی بولتا جا رہا تھا۔ ”کیا آپ اُن کے کسی عزیز کو جانتے ہیں۔ مجھے اُن کے لواحقین کو اطلاع کرنی ہے۔“

”ہیلو... ہیلو...!“

مجھے سمجھ نہ آیا کیا کہوں، بمشکل کہہ سکا۔ ”نہیں بھائی۔ میں اُن کے کسی عزیز رشتے دار کو نہیں جانتا۔ میں تو اُن سے کام کرواتا ہوں۔“

یہ کہہ کر میں نے فون کاٹ دیا... اور کیا کرتا؟ میں نے تو ایک غریب پلمبر کو فون کیا تھا جو دن رات لوگوں کی موٹریں مرمّت کر کے پیٹ پالتا تھا۔ اُس کی جدّ و جہد آج ختم ہو گئی۔ زندگی کی مُشکلات کا خاتمہ ہو گیا۔ ایک مزدور خاموشی سے دُنیا سے چلا گیا۔ کسی کو کوئی فرق نہیں پڑا۔ مجھے بھی شاید کوئی فرق نہیں پڑا۔ کسی اور پلمبر کو بُلا کر اپنا کام کروا لیا مگر ظفر صاحب کے الفاظ بہت دنوں تک میری سماعت میں گونجتے رہے:

”ملتے ہیں بریک کے بعد!“...

پروفیسر خالد پرویز

ایک دفعہ مدینہ منورہ سے ایک شخص کوفہ آیا۔ وہ اس غرض سے آیا تھا کہ گھریلو ضروریات کا ساز و سامان خرید سکے اور چیزوں کے علاوہ اسے کپڑے کی خریداری بھی کرنا تھی۔ کوفہ میں اس نے اپنے دوستوں سے خاص قسم کے کپڑے خریدنے کا ارادہ ظاہر کیا تو انھوں نے کہا ''اگر آپ کو اعلیٰ معیار کا کپڑا خریدنا ہے تو ابوحنیفہؒ کی دکان پر تشریف لے جائیے، وہاں آپ کو مطلوبہ کپڑا بھی مل جائے گا اور قیمت بھی مناسب ہو گی۔ آپ ایک بات کا خیال رکھنا کہ جو قیمت وہ بتائیں،

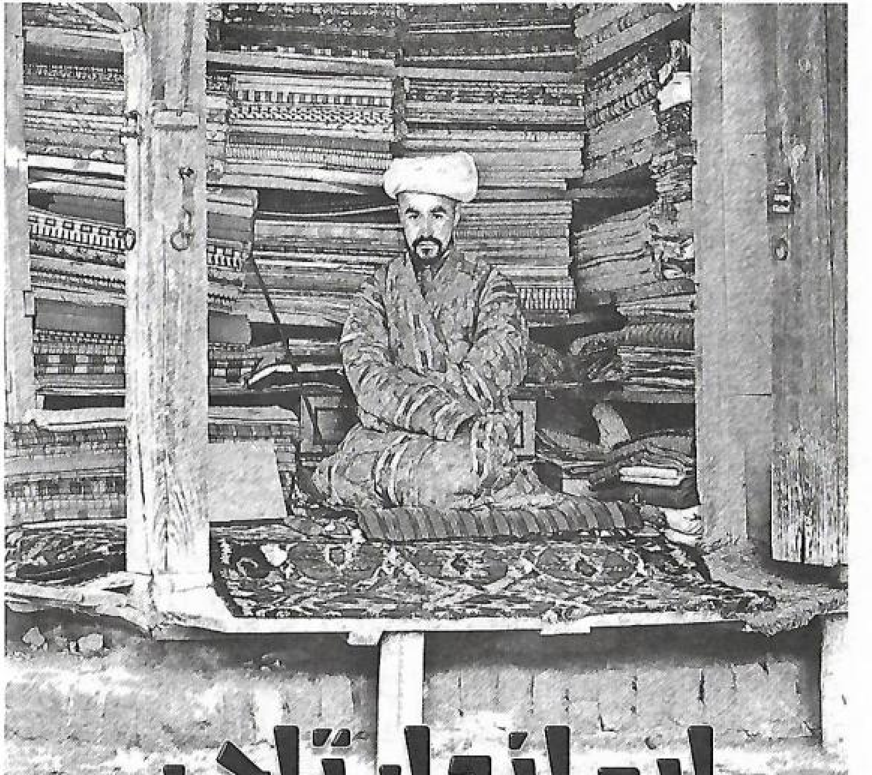

ایماندار تاجر

کھوئی راہ روشن کر دینے والے سبق آموز اسلامی واقعات کا اچھوتا انتخاب

اس پر بحث نہ کرنا۔ قیمت کم کروانے کے لیے ہرگز نہ جھگڑنا کیونکہ وہ صرف ایک ہی بات کرتے ہیں۔ ایک ہی قیمت بتاتے ہیں جو پہلی اور آخری ہوتی ہے۔''

وہ شخص دوستوں کے مشورے پر حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی دکان پر پہنچا۔ وہ دکان پر موجود نہیں تھے۔ وہاں ان کا ایک شاگرد بیٹھا ہوا تھا۔ اس شخص نے یہی سمجھا کہ ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ ہی دکان پر بیٹھے ہیں۔ اس نے مطلوبہ کپڑا دیکھا۔ اسے پسند کیا اور قیمت دریافت کی۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے شاگرد نے اسے بتایا ''یہ کپڑا ایک ہزار درہم کا ہے۔''

اس شخص نے دوستوں کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے بلا چوں و چرا ایک ہزار درہم ادا کیے اور کپڑا خرید کر آ گیا۔ اس کے بعد وہ اپنی دوسری خریداری مکمل کر کے واپس مدینہ منورہ روانہ ہوا۔

کچھ عرصہ بعد حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے کسی ضرورت سے اس کپڑے کے بارے میں اپنے شاگرد سے دریافت کیا۔ اس نے بتایا ''جناب وہ کپڑا تو بک گیا۔''

حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے پوچھا ''کتنے میں بکا؟''

شاگرد نے بتایا ''جناب! وہ کپڑا میں نے ایک ہزار درہم میں بیچا۔''

آپؒ نے شاگرد سے پوچھا ''کس کے پاس بیچا؟''

شاگرد نے بتایا ''ایک شخص مدینہ منورہ سے آیا تھا، اس کے پاس بیچا تھا۔''

حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ ایک ہزار درہم لیے اس شخص کی تلاش میں مدینہ منورہ پہنچے جو کپڑا خرید کر لے گیا تھا۔ کافی تلاش کے بعد آپؒ کو وہ شخص مل گیا۔ دیکھا کہ اس شخص نے وہی کپڑا پہنا ہوا ہے اور مسجد میں نماز پڑھ رہا ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بھی وہاں نماز پڑھنے لگے۔ جب وہ شخص نماز سے فارغ ہوا اور حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بھی، تو آپؒ نے بڑھ کر اس شخص کو سلام کیا۔

سلام دعا کے بعد حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے اس شخص سے کہا۔ ''بھائی! یہ جو کپڑا تم نے پہن رکھا ہے یہ میرا ہے۔''

وہ شخص از حد حیران ہوا اور کہنے لگا ''جناب! آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ کپڑا آپ کا ہے۔ میں نے تو یہ کپڑا کوفہ سے ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی دکان سے ایک ہزار درہم میں خریدا ہے۔''

حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے کہا ''اگر تم ابوحنیفہ کو دیکھ لو تو پہچان لوگے؟''

اس شخص نے کہا ''بالکل! میں ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو فوراً پہچان لوں گا کیونکہ میں نے اُن ہی سے تو یہ کپڑا خریدا تھا۔''

حضرت نے اس شخص سے کہا ''ابوحنیفہ تو میں خود ہوں۔ کیا آپ نے یہ کپڑا مجھ سے خریدا تھا؟''

اُس نے کہا ''میں نے یہ کپڑا آپ سے تو نہیں خریدا۔ وہ تو کوئی اور شخص تھا جسے میں ابوحنیفہ سمجھا۔''

حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ''اچھا! جو کچھ ہوا سو ہوا۔ اب یوں کرو کہ اپنے ہزار درہم واپس لے لو اور مجھے میرا کپڑا دے دو۔ دراصل یہ کپڑا میرے ایک شاگرد نے آپ کے پاس بیچا تھا۔ اب میں اس کپڑے کو واپس لینے آیا ہوں۔''

اس شخص نے کہا ''حضرت! میں اس کپڑے کو کئی مرتبہ پہن چکا۔ اب یہ مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ کپڑا استعمال کرنے کے بعد اسے آپؒ کو واپس کر دوں۔ ہاں! اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ کپڑا اس قیمت سے زیادہ کا تھا جتنی قیمت پر میں نے خریدا اور آپ کے شاگرد نے بیچا تو میں زائد رقم دینے کو تیار ہوں۔ آپ بتائیے کہ زائد قیمت کتنی بنتی ہے؟''

حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے کہا ''نہیں! ایسا ہرگز

نہیں۔ میں آپ سے زائد قیمت لینے نہیں آیا۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ اس کپڑے کی صحیح قیمت چار سو درہم ہے۔ میرے شاگرد نے آپ کو اسے ہزار درہم میں فروخت کر دیا۔ میں چاہتا ہوں کہ چھ سو درہم آپ کو واپس کر دوں اور کپڑا بھی آپ کے پاس رہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس معاملے پر آپ رضامند ہو جائیں گے۔ اگر یہ صورت آپ کو پسند نہیں تو از راہ صد لطف و کرم میرا کپڑا مجھے واپس کر کے ایک ہزار درہم کی رقم واپس لے لیں۔ البتہ اس دوران آپ نے یہ کپڑا جو بار بار استعمال کیا ہے اس کی میری طرف سے آپ کو اجازت ہے۔''

اس شخص نے کہا ''حضرت! اب میں کسی صورت یہ کپڑا واپس کرنے کو تیار نہیں۔ میں نے یہ کپڑا ایک ہزار درہم میں اپنی خوشی سے خریدا تھا۔ اس لیے ایک ہزار درہم میں ہی یہ کپڑا میرے پاس رہنے دیں۔ میں اب اسے واپس نہیں کروں گا۔''

حضرت امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اپنی بات پر ڈٹے اور برابر اصرار کرتے رہے۔ آخر کار وہ شخص مجبور ہو کر اس بات پر رضامند ہو گیا کہ چھ سو درہم کی رقم واپس لے اور چار سو درہم کے عوض کپڑا بھی اس کے پاس رہے۔ اس شخص کی رضامندی پر حضرت امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ از حد خوش ہوئے۔ چنانچہ چھ سو درہم کی رقم اسے واپس کر کے ہی مدینہ منورہ سے کوفہ لوٹے۔ (المناقب الموفق)

آخر معاملہ کیا ہے؟

اس کا پیشہ جواہرات کی تجارت تھا۔ ایک مرتبہ وہ تجارت کی غرض سے روم پہنچا۔ وہاں اس کی ملاقات قیصر روم کے ایک وزیر سے ہوئی۔ دوران گفتگو وزیر نے اس سے کہا ''ہم آج ایک جگہ جا رہے ہیں۔ میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔ اس سے ہمیں خوشی ہو گی۔''

اس نے وزیر کے اظہار دعوت پر پسندیدگی اور رضامندی کا جواب دیا اور ساتھ چل پڑا۔ وزیر اسے ایک جنگل کی طرف لے گیا۔ جب وہ جنگل میں پہنچا تو وہاں ایک عجیب و غریب منظر دیکھا۔ جنگل میں انتہائی خوبصورت اور بیش قیمت خیمہ نصب تھا اور ایک بہت بڑا لشکر خیمے کے گرد چکر لگا رہا تھا۔ جب لشکر خیمے کے گرد چکر لگا چکا تو پھر حکیموں اور فلاسفروں کے ایک بہت بڑے گروہ نے خیمے کے گرد چکر لگایا۔ بعد ازاں بے شمار حسین و جمیل عورتیں قیمتی لباس زیب تن کیے نایاب زر و جواہرات کے تھال اٹھائے خیمے کے چکر لگانے میں مصروف ہو گئیں۔

جب یہ سب لوگ خیمے کے گرد چکر لگا چکے تو پھر بادشاہ اور وزیر اس خیمے کے اندر تشریف لے گئے اور تھوڑی دیر اندر ٹھہرنے کے بعد باہر نکل آئے۔

وہ یہ سارا منظر از حد حیرت، استعجاب اور انہماک کے ساتھ دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ وہ کافی دیر تک سوچتا رہا مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ بالآخر اس نے وزیر سے پوچھا ''یہ سب کچھ کیا ہے؟''

وزیر نے اسے بتایا ''قیصر روم کو رب کائنات نے انتہائی خوبصورت اکلوتا بیٹا عطا فرمایا تھا۔ کچھ عرصہ ہوا وہ عین عالم شباب میں اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اس کی قبر خیمے کے اندر موجود ہے۔ اس کی وفات کی برسی پر ہر سال ہم لوگ اسی شان و شوکت کے ساتھ یہاں آتے اور یہ سب کچھ کرتے ہیں۔''

اس نے وزیر سے پوچھا ''آخر تم یہ سب کچھ کیوں کرتے ہو؟''

وزیر نے بتایا ''اس سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم مرنے والے کو یہ باور کروا دیں، اگر تجھے زندہ کرنے میں کوئی بھی کوشش کارگر ہو سکتی تو ہم ضرور ایسا کرتے۔ ہم تجھے زندہ کرنے کے لیے اپنی تمام فوج، حکیم، فلاسفر، مال و دولت حتیٰ کہ سب کچھ تجھ پر نچھاور کر دیتے۔ اگر ہم جانتے کہ اس

...نے سے تُو زندہ ہو جائے گا، تو سب کچھ کرتے مگر افسوس ...تیرا معاملہ ایسی عظمت والی ذات اقدس سے ہے جو ...ات و ممات کی مالک ہے جس کے مقابلے میں ساری ...شاہی تو کیا، ساری کائنات کی طاقت اور قوت بھی بالکل ...نہیں کر سکتی۔ زندہ رکھنے اور مارنے کا اختیار صرف اُسی ...ات واحد کو ہے۔''

وہ شخص بصرہ سے تجارت کی غرض سے روم پہنچا تھا۔ اس ...ے وزیر کی یہ باتیں سنیں تو دل میں ایسا انقلاب برپا ہوا کہ وہ ...تمام کاروبار اور مال و متاع روم میں چھوڑ کر واپس اپنے ...بصرہ پہنچا اور جس قدر بھی بیش قیمت جواہرات اس کے ...س موجود تھے، وہ سب اللہ کی راہ میں غریبوں، مسکینوں اور ...اجت مندوں میں تقسیم کر دیے اور ترک دنیا کی راہ اختیار کر ...ے اپنا تعلق صرف اور صرف اللہ تعالیٰ سے جوڑ لیا۔ اس قدر ...اضت و عبادت کی کہ رہتی دنیا تک اس کا نام زندہ و تابندہ ...ہے گا کیونکہ وہ اب محض حسن نام کا ایک تاجر نہیں رہا تھا ...وہ حضرت خواجہ حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ بن چکے تھے۔

ایک انوکھا تحفہ

ایک غیبت گو حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ کے دور میں ...ی موجود تھا۔ اس کا ہر لمحہ دوسروں کی غیبت جوئی ...ں گزرتا۔ سارا دن ایک سے دوسری جگہ پہنچتا۔ ایک کی ...ائی دوسرے کے پاس اور دوسرے کی تیسرے کے پاس ...رتا۔ ایک ساعت ایک مقام پر تو دوسری ساعت ...وسرے مقام پر گزارتا۔ وہ جہاں جاتا کسی نہ کسی کو اپنی بے ...نقید کا نشانہ بناتا۔ اس کی ناپائیدار زندگی کے شب و روز ...ی طرح بسر ہو رہے تھے۔ جس کسی کو معلوم ہوتا کہ اس ...یبت گو نے اس کے بارے میں یہ کچھ کہا ہے تو وہ غم زدہ ہو ...کر رہ جاتا۔ کچھ لوگ اپنی صفائی بیان کرتے تو کچھ خاموش ...ہو کر رہ جاتے۔

وقت کے ساتھ ساتھ وہ اپنے فن میں ماہر ہو چکا تھا۔ ایک وقت آیا کہ اس نے وقت کے ولی حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ کو بھی نہ چھوڑا اور ان کی غیبت سے اپنے دامن کو آلودہ کر لیا۔ لوگوں نے سنا تو اسے ٹوکا مگر وہ کب رکنے والا تھا۔ مریدین نے حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ کو اس کے بارے میں بتایا کہ وہ آپ کے متعلق ایسی باتیں بناتا پھر رہا ہے۔

ولی اللہ کے ہر کام کا اپنا جدا انداز ہوتا ہے۔ حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ نے سنا تو فوراً اپنے ایک مرید کو آواز دی۔ مرید حاضر خدمت ہوا اور عرض کی ''فرمائیے جناب! کیا حکم ہے؟''

حضرت حسن بصریؒ نے کہا ''یہ لو پیسے، جیب میں ڈالو اور ابھی اسی وقت بازار جاؤ، وہاں سے تازہ اعلیٰ چھوہاروں کا ایک ٹوکرا خرید لاؤ۔''

مرید دوڑا گیا اور تھوڑی ہی دیر بعد چھوہاروں کا ایک ٹوکرا لا حاضر کیا۔ حضرتؒ نے ان چھوہاروں کو ایک طباق میں سجایا اور ایک مرید خاص کو کہا ''طباق کو اس شخص کے پاس لے جاؤ جو ہماری غیبت کرتا ہے۔ اسے یہ پیش کرو اور ہماری طرف سے کہو کہ یہ تحفہ حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ نے آپ کے لیے بھیجا ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ میں آپ کا از حد شکر گزار اور ممنون ہوں کہ آپ نے میری غیبت کر کے اپنی نیکیوں کو میرے دفتر اعمال میں منتقل کر دیا۔ میں آپ کی یہ عنایت ساری عمر نہیں بھولوں گا۔ اگرچہ میں آپ کے اس احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتا تاہم یہ حقیر سا تحفہ قبول فرمائیے۔''

مرید خاص نے حضرت کے حکم کی تعمیل میں آپؒ کا پیغام اور چھوہاروں سے بھرا طباق غیبت گو تک پہنچایا۔ وہ حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ کے اس قول و فعل سے اپنے کیے پر شرمندہ اور نادم ہوا۔ اس نے حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہو کر معافی طلب کی اور غیبت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تائب ہو گیا۔ سورۃ الحجرات کی آیت ۱۲ میں رب کائنات ارشاد فرماتا ہے:

"اے ایمان والو! بہت سی بدگمانیوں سے بچتے رہو۔ بلا شبہ بعض گمان گناہ ہیں اور جاسوسی بھی نہ کیا کرو اور نہ کوئی کسی کی غیبت کیا کرے۔ کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔ اس کو تو تم ناپسند کرتے ہو اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا نہایت رحم والا ہے۔"

مسجد سے کوتوالی تک

آج رات خاموشی رہی۔ کوئی شور شرابا یا ہنگامہ نہیں۔ کوئی ساز و آہنگ کا طوفان نہیں جو ان کی نماز، عجز و نیاز، تلاوت اور عبادت میں خلل انداز ہو۔ ورنہ یہ تو روز کا معمول تھا کہ ان کا ہمسایہ شراب پی کر غل غپاڑہ کیا کرتا تھا۔ بدمستی اور بدتمیزی کا ایسا مظاہرہ ہوتا کہ سکون کا سانس لینا دشوار تھا۔ اس ہلڑ بازی میں وہ ایک شعر بھی چلا چلا کر پڑھتا تھا جس کا مفہوم تھا کہ لوگوں نے مجھے کھو دیا اور مجھے کھو کر ایسے شخص کو کھو دیا جو لڑائی کے روز کام آنے والا تھا۔

اس سب ہنگامے کے باوجود وہ تمام رات بارگاہ رب العزت میں سجدہ ریز رہتے۔ روزانہ ایک قرآن ختم کرتے اور تہجد کے لمحات سعید میں تو ان پر خاص قسم کی روحانی سرشاری اور ایمانی خمار طاری ہوتا۔ تاہم انھوں نے اپنے ہمسائے سے کبھی شکوہ و شکایت کا ایک لفظ تک نہ کہا کہ اس کا بے ہنگم سرگم ان کی عبادت و ریاضت میں کس قدر بدمزگی پیدا کرتا ہے۔ وہ تو محض ہمسائیگی کا خیال کر کے اس کی اس ایذارسانی پر صبر فرماتے۔

مگر آج رات مکمل خاموشی رہی۔ رات خراماں خراماں اپنا سفر مکمل کیا ہی چاہتی تھی۔ تہجد کا وقت تھا اور یہ وقت بھی سکون سے گزر گیا۔ اتنے میں مؤذن نے اللہ اکبر کی صدا لگائی۔ وہ مسجد کی جانب تشریف لے گئے مگر تمام راستے ذکر کے ساتھ ساتھ اس فکر میں رہے کہ آخر آج میرے پڑوس میں سناٹا کیوں ہے! اللہ خیر کرے! نماز سے فراغت کے بعد وہ سیدھے ہمسائے کے مکان پر گئے اور دستک دی۔

ایک بچی روتی ہوئی باہر آئی۔ اس سے پوچھا "بیٹا! ابو کہاں ہیں؟ خیریت سے تو ہیں!"

بچی نے بتایا "آوارہ گردی کے جرم میں کوتوال شہر نے میرے باپ کو گرفتار کر لیا ہے۔ یوں وہ تمام رات کوتوالی میں رہے اس وقت بھی وہیں ہیں۔"

جیسے ہی انھوں نے اپنے ہمسائے کی گرفتاری کی خبر سنی فوراً کوتوالی پہنچے۔ کوتوال شہر کو آپ کی آمد کا علم ہوا تو خوشی اور حیرانی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ استقبال کرنے باہر آیا۔ وہ اپنی قسمت پر نازاں تھا کہ اتنی بڑی شخصیت نے اس کے ہاں خود آ کر ملاقات کا شرف بخشا مگر وہ حیران تھا کہ وہ کونسی بات تھی جو انھیں کوتوالی تک لے آئی۔

کوتوال شہر نے ان سے دست بستہ عرض کی "فرمائیے جناب! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

انھوں نے کہا "میں اپنے پڑوسی کی سفارش لے کر حاضر ہوا ہوں۔ ہو سکے تو اسے رہا کر دیجیے۔"

کوتوال شہر نے کہا "عالی مرتبت! آپ کا کہا تو میرے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ میں آپ کے پڑوسی کو تو کیا بلکہ اس رات جتنے لوگ گرفتار ہوئے ہیں، سب کو رہا کرتا ہوں۔"

جب وہ اپنے پڑوسی کو کوتوالی سے رہا کروا کر اپنے ساتھ لا رہے تھے تو انھوں نے اپنے پڑوسی سے کہا "تو اکثر گایا کرتا تھا کہ لوگوں نے تجھے کھو دیا۔! کیا میں نے تجھے کھو دیا؟"

ان کی اس بات کا وہ کیا جواب دیتا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اس نے صرف اتنا کہا "اے امام ابو حنیفہؒ! اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ نے مجھے نہیں کھویا بلکہ میں نے آپ کی بدولت اللہ کو پایا ہے۔"

انور مقصود

حبیب جالب
بنام انور مقصود
عالم بالا سے پاکستانی قوم کے نام ایک چشم کشا خط

اردو کے آخری عوامی شاعر حبیب جالب صاحب کو میں نے خط لکھا اور یہ جواب میرے پاس آیا:

انور میں تم کو اب تک ۲۵ خط لکھ چکا ہوں۔ اب جالب جالب تو نہیں کہ ہر خط کی دو کاپیاں بناؤں ایک چھپنے کے لیے اور ایک بھیجنے کے لیے۔ اگر میرے خط تمہارے پاس محفوظ ہیں تو یہاں آنے والے کسی شاعر یا ادیب کے ہاتھ بھجوا دینا۔

لائل پور کا نام جب تم لوگوں نے فیصل آباد رکھ دیا تو میں نے وہ شہر چھوڑ دیا۔ اب وہ شہر میرا نہیں رانا ثناء اللہ کا ہے۔ تمہارے خط سے پاکستان کے حالات معلوم ہوئے۔ یہاں کے حالات بھی کچھ کچھ پاکستان کی طرح ہیں۔ کل یہاں ایوب خان، یحییٰ خان، جنرل موسیٰ اور ضیاء الحق کی میٹنگ تھی۔ یہ بات ہم لوگوں کو یہاں کی آئی ایس پی آر کے ٹویٹ سے معلوم ہوئی۔ صدیق سالک یہاں کی آئی ایس پی آر کے انچارج ہیں۔

اسی رات فیض اور فراز میرے پاس آئے اور کہنے لگے جالب تم جلدی سے اس میٹنگ پر کوئی نظم لکھ دو۔ میں نے کہا میں نے ہمیشہ زندہ شاعری کی ہے مری ہوئی شاعری کبھی نہیں کی۔ تم دونوں کوشش کرو۔ دونوں چلے گئے۔ میں یہاں پاکستان ٹیلی ویژن دیکھتا ہوں۔ ن لیگ کے روشنی کے اشتہار جو تاریکی سے بھرے ہوتے ہیں، دیکھ کر دل خراب ہو جاتا ہے۔ بجلی کا حال اگر تمہارے یہاں یہی رہا تو آنے والے دنوں میں تم لوگ ایمان کی روشنی میں نقب لگا کر ٹیلی ویژن دیکھو گے۔ میں نے تمہارا ۱۴/اگست کا پروگرام دیکھا۔

تم کو پروگرام کا آغاز میرے اس شعر سے کرنا چاہیے تھا۔

بہتے لہو میں سب تیرا مفہوم بہ گیا
۱۴/اگست صرف تیرا نام رہ گیا۔۔۔

یہاں مجھے ایک ہی بات کا افسوس ہے کہ تم ابھی تک گرفتار نہیں ہوئے۔ تم اسیری کے لطف سے آج تک ناواقف ہو۔ میری تو آدھی زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزری۔ سلاخوں کے پیچھے ساری قوم کو جالب قیدی نظر آتا تھا مگر سلاخوں کے سامنے جالب کو ساری قوم قیدی نظر آتی تھی۔

میرے ایک رشتہ دار ہیں، ان کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی ہے۔ ان کا خط میرے پاس آیا۔ مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ بیٹی کا نام کیا رکھوں؟ میں نے خط لکھ کر کہا۔ فیصلہ رکھ لو۔ کم از کم محفوظ تو رہے گی۔

میں ہر جمعے کی شام قائداعظم اور فاطمہ جناح سے ملنے جاتا

ہوں۔ وہ دونوں کہیں نہیں جاتے۔ میں نے قائد سے کہا پاکستان میں آپ کی سالگرہ کا کیک کوئی نہیں کاٹتا۔ قائد نے کہا، جالب میں نے پاکستان ایک کیک کی طرح اس قوم کو پیش کیا تھا، جس کو اس قوم نے ۱۹۷۱ء میں کاٹ دیا۔ آدھا کیک بنگلہ دیش بن گیا، آدھا مغربی سیاست دان کھا گئے۔ ہم لوگ پاکستان کی باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں رئیس امروہی آگئے۔ یہ بھی جمعے کی شام قائد سے ملنے آجاتے ہیں۔ محترمہ فاطمہ جناح نے کہا ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اب لوگ قائد کے مزار پر بھی جاتے ہیں یا نہیں۔ رئیس نے اپنے چار مصرعے سنائے:

بہت سے لوگ جدائی میں جان کھوتے ہیں
بہت سے اشک سے نوک نشتر بھگوتے ہیں
بہت سے لوگ جنہیں ضبط غم کے دعوے تھے
مزار قائد اعظم پہ جا کر روتے ہیں......

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد قائد نے پوچھا: رئیس مہاجروں کا کیا حال ہے؟ رئیس نے کہا قائد! لندن میں تو مہاجر خوش ہیں مگر کراچی میں مہاجروں کا حال تباہ ہے۔ میں نے تو بہت پہلے کہہ دیا تھا

جو زندگی یہ فراغت گزر نہیں سکتی
تو زندگی کی رہ تنگ سے گزر جاؤ
مہاجرین غریب دیار پاکستان
تمہارے حق میں مناسب یہ ہے کہ مر جاؤ

میں نے رئیس سے کہا، آپ لوگ خود کو مہاجر کیوں کہتے ہیں؟ بتائیے قائد؛

نہ وہ ادائے تکلم نہ احتیاط زباں
مگر یہ ضد ہے کہ ہمیں اہل لکھنو کہیے

بھول جائیں لفظ مہاجر۔ اب آپ لوگ سندھی ہیں۔ رئیس غصے میں آگئے۔ کہنے لگے، اپنے نام سے امروہہ نکال دوں رئیس ٹنڈو رکھ لوں؟ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ بات یہ ہے قائد کہ جب تک ن لیگ کی حکومت ہے، مہاجر پریشان ہی رہیں گے اور مجھے ن کی حکومت جاتی نظر نہیں آتی۔ اگلے الیکشن میں بھی لگتا ہے کہ یہی جیتیں گے۔ جس کی وجہ ہے مسلمان میں ن، پاکستان میں "ن"، پاکستان کے صدر ممنون میں "ن"، پاکستان کے وزیراعظم خاقان میں "ن"، پاکستان کے قانون میں "ن"، پاکستان کے نظام میں "ن"، سرکاری افسران میں "ن"، نیب تو "ن" سے ہی شروع ہوتا ہے۔ نیشنل بینک آف پاکستان شروع "ن" سے ہوتا ہے اور ختم "ن" پر ہوتا ہے۔ میں نے رئیس سے کہا، اس طرح تو بے ایمان میں "ن"، بجلی کے بحران میں "ن"، تعلیم کے فقدان میں "ن"، پنجاب کے ہر پہلوان میں "ن"۔ رئیس کہنے لگے، قائد! آپ کے زمانے میں کراچی پاکستان کا کیپٹل تھا۔ اب پاکستان کا آدھا Capital دبئی میں ہے، پاؤ لندن میں ہے، پاؤ جینیوا میں ہے۔ سارا قومی خزانہ ملک سے باہر ہے اور وزیر خزانہ تقریباً اندر۔ یہ ہے آپ کا پاکستان۔ دہشت گرد جب چاہتے ہیں ہزاروں بے گناہ مار دیتے ہیں۔ فاطمہ جناح نے کہا مسلم لیگ دہشت گردوں کے خلاف کیوں نہیں کھڑی ہوتی؟ رئیس بولے: صرف اس لیے محترمہ کہ طالبان میں بھی "ن" ہے۔

اللہ حافظ کہہ کر رئیس چلے گئے۔ قائد نے کہا اللہ پاکستان کی حفاظت کرے۔ محترمہ نے کہا، آمین۔ میں نے کہا محترمہ! آمین میں بھی "ن" ہے۔ یہ کہہ کر میں چلا آیا۔ اتنا طویل خط میں نے پہلے کبھی نہیں لکھا۔

مگر قائد اور رئیس کی باتیں تمہیں سنانا چاہ رہا تھا۔

تمہارے یہاں نہ آنے کا طالب...

جالب ●●●

پڑھیئے
"اردو ادب کا چھلاوہ"
شوکت تھانوی کی شخصیت پر انوکھی تحریر صفحہ ۱۰۴ پر

ائے میرے جوڑ

بیگم عامر ملک

درتی غذاؤں کے ذریعے ایک موذی بیماری سے نجات پا لیجیے

جسم میں یورک ایسڈ (uric acid) کی سطح کا بڑھنا ام سی بات ہوگئی ہے اور اکثر لوگ اس جانب کوئی خاص توجہ یں دیتے۔ یورک ایسڈ میں مسلسل اضافہ انسان کو خاص طور جوڑوں کے درد کا نشانہ بناتا ہے۔ یہی وجہ ہے، آج کل جوڑوں کے درد میں مبتلا مریض ہمیں اپنے اردگرد دکھائی دیتے یں۔ یورک ایسڈ سے جوڑوں میں درد، سوزش اور سوجن پیدا وتی ہے اور بعض اوقات اتنی زیادہ ہوجاتی ہے کہ انسان چلنے ھرنے سے بھی قاصر ہوجاتا ہے۔

یورک ایسڈ بڑھنے کی وجوہ بلڈ پریشر، موٹاپا، خون کی کمی اور بیطس ہیں۔ طبی ماہرین کے مطابق بہت زیادہ سرخ گوشت کا ستعمال اسے بڑھاتا ہے۔ تاہم چند قدرتی غذاؤں کو اپنی وراک کا جزو بنا کر یورک ایسڈ کی اضافی سطح کو کم کیا جاسکتا ہے۔

کیلے

یہ پھل جوڑوں کے سبھی امراض کا شکار مریضوں کے لیے ہترین غذا ہے۔ البتہ بطور علاج روزانہ آٹھ سے نو کیلے کھانے پڑتے ہیں اور یہ عمل تین سے چار روز تک مسلسل جاری رہتا ہے۔ مرض سے چھٹکارے کی واضح علامت یہ ہے کہ جوڑوں پر موجود سوجن اور سوزش کم یا ختم ہوجائے گی۔

اسٹرابیری

یہ بھی ایک ایسی قدرتی غذا ہے جو جسم میں پائے جانے والے مضر صحت کیمیائی مادوں کی بلند سطح کے خلاف مزاحمت پیدا کرتی ہے۔ یہ مزیدار غذا یورک ایسڈ کم کرکے آپ کو گنٹھیا سے آرام پہنچا سکتی ہے۔

سیب

سیب میں میلک (Malic) ایسڈ کی بھاری مقدار پائی جاتی ہے۔ یہ تیزاب قدرتی طور پر یورک ایسڈ کے اثرات بے اثر کرتا اور اس سے پیدا شدہ امراض میں آرام فراہم کرتا ہے۔ بہترین فوائد کے لیے روزانہ ایک سیب کھانا ضروری ہے۔

چیری

اس میں انتھوسینین (anthocyanin) نامی کیمیائی مادہ سوزش کے خلاف مزاحمت پیدا کرتا ہے۔ چیری نہ صرف یورک ایسڈ کی سطح بڑھنے سے روکتی بلکہ جسم کو مختلف کیمیکل سے جنم لینے والے مرکب کے نقصانات سے بھی محفوظ رکھتی ہے۔ یورک ایسڈ کی سطح میں کمی کے لیے روزانہ دو سو گرام چیری کھائیے۔

پانی

یہ سیال تمام جانداروں کے لیے ضروری ہے۔ پانی جسم میں موجود اضافی یورک ایسڈ اور زہریلے مادے خارج کرتا ہے جس سے گنٹھیا جاتا رہتا ہے۔ ماہرین کے مطابق روزانہ دس سے بارہ گلاس پانی ضرور پینا چاہیے۔

سبزیوں کا رس

جسم میں یورک ایسڈ کی سطح کم کرنے کا یہ آسان اور نہایت اہم گھریلو ٹوٹکا ہے۔ گاجر، کھیرے اور چقندر کے رس باہم شامل کرکے پینے سے آپ کو جوڑوں کے امراض سے نجات ملے گی۔

فائبر والی غذائیں

یونیورسٹی آف میری لینڈ میڈیکل سینٹر کی ایک تحقیق کے مطابق ایسی غذائیں جن میں فائبر کی بھاری مقدار پائی جاتی ہے، جسم میں موجود یورک ایسڈ کی سطح کم کرتی ہیں۔

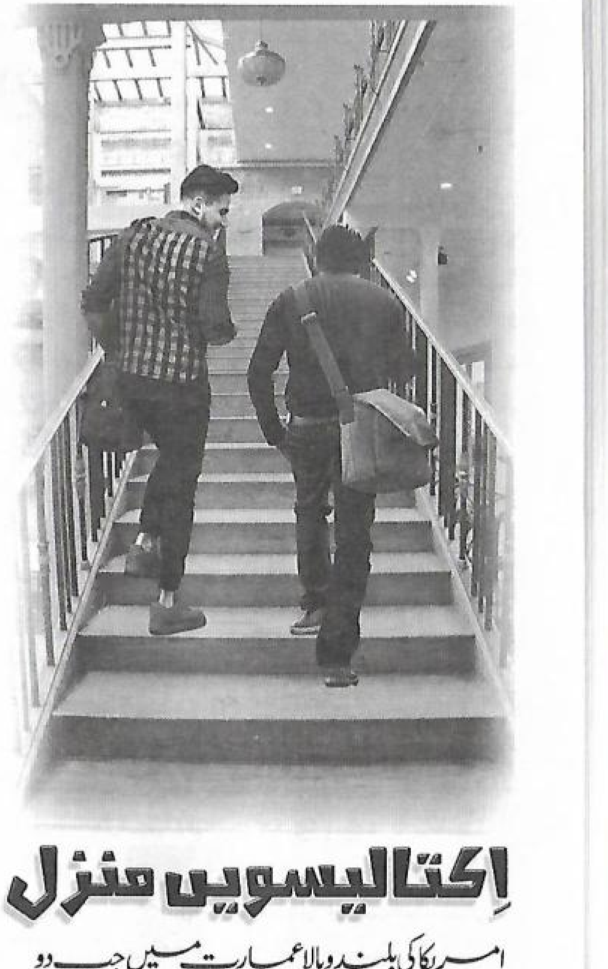

اکتالیسویں منزل

امریکا کی بلند و بالا عمارت میں جب دو پاکستانی طلبہ ایک دلچسپ حادثے کا شکار ہو گئے

رضیہ بٹ

کاشف کے کمرے سے نکلنے کے بعد انجم نے دروازہ بند کیا۔ لاک لگانے سے پہلے کاشف سے پوچھا ''بند کر دوں۔ کوئی چیز تو نہیں لینی اندر سے؟''

''نہیں، کر دو بند۔''

اس نے دروازے کو تالا لگایا اور کاشف کو لیے لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔ انجم کا اپارٹمنٹ بلڈنگ کی اکتالیسویں منزل پر تھا۔ یہ پچاس منزلہ عمارت تھی۔ امریکا میں جہاں سو منزلوں سے بھی زیادہ پر مشتمل عمارتیں موجود ہیں، وہاں پچاس منزلہ عمارت کچھ زیادہ اونچی شمار نہیں ہوتی۔ یہاں منتقل ہونے سے پہلے انجم جس اپارٹمنٹ میں رہائش پزیر تھا، اس کی ستر منازل تھیں۔ وہ اس سے بھی اونچی عمارتیں دیکھ چکا تھا۔ اس لیے یہ عمارت اسے زیادہ موزوں اور اچھی لگی تھی۔ تین سال میں وہ ان فلک بوس عمارتوں میں رہنے کا عادی ہو چکا تھا۔

کاشف ابھی حال ہی میں امریکا آیا تھا۔ وہ انجم کے پاس ہی ٹھہرا تھا۔ دونوں دوست تھے۔ برسوں اکٹھے رہے۔ اسکول اور کالج میں ساتھ رہا۔ انجم اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے امریکا چلا آیا۔ یہاں پڑھ رہا تھا اور ملازمت بھی کرتا۔ اپنے تعلیمی اخراجات اور رہن سہن کے لیے پیسہ فالتو وقت میں کام کر کے ہی اکٹھا کیا جا سکتا تھا۔ عام طالب علم ایسا ہی کرتے ہیں۔ کچھ تو پیسے کمانے میں اس طرح جت جاتے کہ پھر تعلیم کی طرف سے غافل ہی ہو جاتے۔ دو سال کا کورس چھ سال میں بھی سنہ کر پاتے لیکن جو سنجیدگی سے پڑھنا چاہتے تھے، انھوں نے اپنے کام، آرام اور تعلیم کے اوقات کار تقسیم کر رکھے تھے۔ انجم کا شمار بھی ایسے ہی طالبعلموں میں ہوتا تھا۔

امریکا جیسی جگہ میں کوئی طالب علم دوسرے کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہوتا ہے لہٰذا اپنا کماؤ اپنا کھاؤ والے مقولے پر عمل ہوتا ہے۔ انجم نے یہ بات کاشف پر واضح کر دی تھی۔ فی الحال دونوں اکٹھے ہی رہ رہے تھے۔ کاشف کے پاس ابھی ساتھ لائے ہوئے پیسے موجود تھے اور انجم نے بھی کچھ رقم پس انداز کی ہوئی تھی۔ کاشف کی یونیورسٹی میں جماعتیں شروع ہونے میں ابھی دو ہفتے باقی تھے۔ انجم نے دوست کے لیے وقتی طور پر کام بھی تلاش کر لیا تھا۔ یونیورسٹی کافی دور تھی۔ کاشف کو اُسی علاقے میں رہائش کا بندوبست کرنا تھا جہاں یونیورسٹی تھی۔ انجم اس کے لیے اپارٹمنٹ تلاش کر رہا تھا۔ کل بھی کافی وقت انھوں نے اس تلاش میں گزارا اور آج بھی وہ اسی کام کے لیے جا رہے تھے۔

لفٹ سے دونوں نیچے آئے۔ انجم نے گیراج سے گاڑی نکالی۔ کاشف اس میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''بھئی میرے لیے تو اپارٹمنٹ کسی ایک یا دو منزلہ عمارت میں ہی تلاش کرنا۔''

''کیوں۔''

''تمہارا ہی حوصلہ ہے جو ان اونچی اونچی عمارتوں میں رہ لیتے ہو۔''

''اونچی نیچی سے فرق کیا پڑتا ہے۔ ہر عمارت میں لفٹ موجود ہے۔ منٹوں میں اُوپر منٹوں میں نیچے۔''

''لفٹ تو ہے لیکن......''

''لیکن کیا۔''

''جو کبھی لفٹ خراب ہو جائے تو۔''

''جناب کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اول تو ایسا کبھی ہوتا نہیں اگر ہو بھی جائے تو لفٹ کے ساتھ سیڑھیاں بھی موجود ہیں۔ آنے اور جانے کے لیے لوگ انھیں متبادل کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔''

''تمہارے ساتھ کبھی ایسا اتفاق ہوا؟''

''نہیں، میرے قیام کے دوران کبھی لفٹ خراب نہیں ہوئی۔ ویسے لوگ سیڑھیاں چڑھنے اترنے میں بھی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ اپنی مصروف ترین زندگی میں یہی ورزش کر لیتے ہیں۔ کچھ لوگ تجربے کے لیے اُترتے چڑھتے ہیں۔''

''بے وقوف ہی ہوں گے۔''

''اپنی اپنی سوچ ہی ہے۔''

''تم بھی یہ ورزش کر کے دیکھو تو۔''

''نہ بابا، میں تو باز آیا۔ مجھے کیا مصیبت پڑی ہے۔''

''تجربہ کرنے میں کیا ہرج ہے۔''

''ہرج نہیں تو پھر تم ہی کر لو۔''

''میں...... توبہ۔ توبہ۔ میں تو کانوں کو ہاتھ لگاتا ہوں بھئی۔ مجھے تو ہول آتا ہے یہ سوچ کر کہ اتنی اونچی عمارت میں رہ رہے ہیں۔ اسی لیے تو کہتا ہوں کہ میرے لیے کسی اکیلی دوکیلی منزل والی بلڈنگ میں جگہ تلاش کرنا۔''

''نہیں ملے گی۔''

''کوشش تو کرنا۔''

''اتنے دنوں سے سرگرداں پھر کے دیکھ لیا نا۔''

''نچلی منزلوں کے کرائے بھی تو زیادہ ہیں۔''

''وہ تو ہوں گے ہی۔''

دونوں باتیں کرتے ہوئے راستہ طے کر رہے تھے۔ کاشف نے جس علاقے میں رہنا تھا، وہ تقریباً تیس میل دور تھا۔ وہاں دو ایک ایسے اپارٹمنٹس کا پتا چلا تھا جہاں ہندوستانی اور پاکستانی طالب علم مل کر رہ رہے تھے۔ انجم نے کاشف کو یہی مشورہ دیا تھا کہ کسی کے ساتھ رہ لے، اس طرح کافی بچت ہو جائے گی اور تنہائی کا احساس بھی زیادہ اذیت ناک نہیں ہو گا۔

کاشف کو یہ رائے پسند تو تھی لیکن مسئلہ وہی تھا۔ یہ اپارٹمنٹس بھی ستر ستر اسی اسی منزلہ عمارات کے اندر تھے۔ کوئی باون منزل پر تھا، کوئی تریسٹھ منزل پر۔ ایک اپارٹمنٹ انھوں نے کل ہی دیکھا تھا۔ وہ تیرھویں منزل پر تو تھا لیکن اتنا زیادہ کرایہ دینا ایک طالب علم کے بس میں نہیں تھا۔

اب دونوں صلاح کر رہے تھے۔ انجم نے کہا ’’کوئی اور سٹوڈنٹ مل جائے تو مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔‘‘

’’سٹوڈنٹ کسی اسٹور میں تو ملتے نہیں جو خرید کر لے آئیں۔‘‘

’’بات کرنا پڑے گی۔‘‘ شاید کوئی آسامی ہاتھ آ ہی جائے۔ وہ جو کل انڈین اور پاکستانی سٹوڈنٹ ملے تھے، ان سے بات کرتے ہیں۔ شاید ان کے کسی واقف کار کو جگہ کی تلاش ہو۔‘‘

’’یہ بات ٹھیک ہے۔ اللہ کرے یہ تیرھویں منزل والا کام بن جائے۔‘‘

’’تیرھویں منزل بھی تو کچھ کم اونچائی پر نہیں۔‘‘

’’پھر بھی تمھاری اس فلک بوس اپارٹمنٹ کی طرح تو نہیں۔‘‘

’’ایسے ہی خوفزدہ ہو۔ میرا خیال تھا تم کسی پاکستانی لڑکے سے شیئر کر لو گے تو مسئلہ حل ہو جائے گا۔‘‘

’’تم چلو تو سہی۔ آج شاید تیرھویں منزل والا کام بن جائے۔‘‘

’’تیرھویں والا بنے یا تریسٹھویں والا، بہرحال آج طے کر کے آنا ہے۔ روز روز میں چھٹی کر سکتا ہوں نہ اتنی دور آ جا سکتا ہوں۔‘‘

’’امریکا میں رہ کر مروت کا دامن بھی چھوڑ دیا‘‘ کاشف نے ہنس کر اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

’’یہاں اسے مروت نہیں بے وقوفی کہتے ہیں۔‘‘ انجم نے ہنس کر کہا ’’گنے چنے پیسے ہوتے ہیں یار۔ اس میں اخراجات بھی پورے کرنا ہوتے اور ٹرم کی فیسوں کے لیے بھی جمع کرنا پڑتے ہیں۔ مروت میں تم پر ڈالر لٹاتا رہا تو اس ٹرم کی فیس جمع نہیں کروا سکوں گا۔‘‘

’’میں سمجھتا ہوں یار۔ فکر نہ کرو، ابھی میرے پاس کچھ پیسے ہیں۔‘‘

’’انھیں سنبھال کر رکھو۔ شروع شروع میں کافی خرچے آ جاتے ہیں۔ ایک ایک ڈالر قیمتی ہوتا ہے۔‘‘

کاشف نے سر ہلایا۔ اسے یہاں کوئی تجربہ تو نہیں تھا لیکن اتنے دنوں سے انجم کے ساتھ رہ کر بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ واقعی اسے اگر تعلیم حاصل کرنے کی لگن تھی، تو ہر طرح سے محتاط ہو کر گزر بسر کرنا ضروری تھی۔ دونوں نے بڑا مصروف دن گزارا۔ انجم کاشف کو جگہ جگہ لیے پھرتا رہا۔ ہندوستانی اور پاکستانی طلبہ سے بھی ملاقات کی۔ سب نے کاشف کو اپنے ساتھ ٹھہرانے کی پیشکش کر دی۔

لیکن کاشف متذبذب تھا۔ وہی تریسٹھویں بلڈنگ کا مسئلہ! اسے تو تیرھویں منزل کا اپارٹمنٹ ہی بمشکل پسند آیا تھا۔ اسے یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اگر کبھی خدانخواستہ لفٹ خراب ہو جائے تو تریسٹھویں منزل تک آتے جاتے دم نکل سکتا ہے۔ تیرہ منزلیں تو ضرورت پڑنے پر سیڑھیوں کے ذریعے طے کی جا سکتی تھیں۔ حالانکہ یہ بھی کم اونچائی نہ تھی، پاکستان میں تو وہ کبھی دوسری سے تیسری منزل پر بھی نہ گیا تھا۔

بچپن میں ایک دفعہ اندرون شہر وہ اپنے کسی عزیز کے ہاں اس کے پانچ منزلہ گھر میں گیا۔ امی سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے ہانپنے لگی تھیں۔ وہ خود بھی تھک گیا۔ امی تیسری یا چوتھی منزل کے گھماؤ پر دھپ سے سیڑھی پر بیٹھ گئیں۔ لمبے لمبے گہرے گہرے بے ربط سانس لیتے ہوئے انھوں نے کہا تھا ’’توبہ عذاب ہے سیڑھیاں چڑھنا۔‘‘

تب سے اسے بھی سیڑھیاں چڑھنا عذاب لگتا تھا لیکن یہاں تو لفٹ تھی۔ منٹوں میں اوپر منٹوں میں نیچے۔ سب کا تجربہ یہی تھا کہ یہاں لفٹ خراب نہیں ہوتی اور پانچ دس برسوں میں کبھی ایسا موقع آ بھی جائے تو فوراً ہی ٹھیک کر دی جاتی ہے۔ اللہ اللہ کر کے کاشف کی رہائش کا مسئلہ حل ہو ہی گیا۔ دو انڈونیشی مسلم طالب علم بھی کسی شیئر کرنے والے طالب علم کی تلاش میں تھے۔ انھیں بھی تیرھویں منزل والا اپارٹمنٹ پسند آیا تھا۔ تین سٹوڈنٹ اس میں بآسانی گزر بسر کر سکتے تھے۔ کاشف نے ہامی بھر لی۔ دونوں ضروری کارروائیوں کے بعد رات کو واپس لوٹے۔ راستے ہی میں دونوں نے برگر کھائے اور گھر کی طرف چل دیے۔ انجم نے کار گیراج میں کھڑی کی اور کاشف کو لیے لفٹ کی طرف بڑھا۔ رات کافی ہو چکی تھی۔ اکا دکا لوگ آ جا رہے تھے۔

لفٹ میں اس وقت رش نہیں تھا۔ دو تین مرد اور عورتیں لفٹ کی طرف جا رہے تھے لیکن پتا چلا کہ لفٹ تو بند تھی۔

اس جگہ بڑا سا بورڈ آویزاں تھا، ’’لفٹ خراب ہے۔ مرمت کے لیے بند ہے۔ براہ مہربانی سیڑھیوں کی طرف جائیے۔‘‘

’’اوہ میرے خدا‘‘ ایک بچے والی عورت نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ اس کا اپارٹمنٹ ساتویں منزل پر تھا۔ باقی مرد عورتوں نے نچلی منزلوں پر جانا تھا۔ اس لیے وہ جلدی سے سیڑھیوں کی طرف مڑ گئے۔

لیکن جب کاشف اور انجم کو لفٹ بند ہونے کا پتا چلا تو دونوں سٹپٹا گئے۔ ’’اف۔ اب کیا کریں؟‘‘ انجم نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

کاشف دل جلے انداز میں بولا ’’اب چڑھو سیڑھیاں۔ تم تو کہتے تھے یہاں لفٹ کبھی بند نہیں ہوتی، اب سناؤ۔‘‘

’’یہ پہلا موقع ہے یار۔ پتا نہیں کیا ہوا۔ کس وقت سے بند ہے۔‘‘

قریب کھڑے ایک امریکی سے انجم نے پوچھا تو اس نے بتایا۔ ’’تھوڑی دیر ہی ہوئی ہے۔ تیسویں منزل پر کوئی خرابی ہوئی ہے۔ ٹھیک کر رہے ہیں۔ لیکن معلوم ہوا ہے، کوئی بڑی خرابی ہے۔ ہو سکتا ہے صبح تک ٹھیک نہ ہو سکے۔ ویسے آپ سیڑھیوں کی طرف سے اپنے اپارٹمنٹ میں جا سکتے ہیں۔‘‘

’’جا تو سکتے ہیں‘‘ کاشف غرایا۔ ’’لیکن اس منزل تک جاتے جاتے بالکل ہی اُوپر بھی پہنچ سکتے ہیں۔‘‘

انجم کاشف کی بات پر بے دلی سے ہنس دیا اور بولا ’’اب کیا کریں؟‘‘

’’رات باہر ہی گھوم پھر کر گزار لو۔‘‘ کاشف نے مشورہ دیا۔

’’نہیں بھئی۔ مجھے تو کام بھی کرنا ہے۔‘‘

’’تو پھر کمر کس لو۔ ورزش ہی سہی۔ مناسب سمجھو تو مجھے اپنی گاڑی کی چابی دے دو۔ میں تو اسی میں پڑا رہوں گا۔‘‘

’’تو کیا تمھارا خیال ہے کہ میں اکیلا اتنی سیڑھیاں چڑھ کر جاؤں گا؟‘‘

’’تمھارا تو گھر ہے، تمھیں تو جانا ہی ہوگا۔‘‘

’’تم بھی آج کل اس گھر کے مکین ہو۔‘‘

’’میں تو بالکل بھی نہیں چڑھوں گا اتنی سیڑھیاں۔‘‘

’’تو کیا کرو گے؟‘‘

’’کسی نہ کسی طرح رات گزار ہی لوں گا۔‘‘

’’اتنی سردی میں مرنا ہے؟‘‘

’’سیڑھیاں چڑھنا بھی تو مرنے کے برابر ہے۔‘‘

’’اب کچھ بھی ہو، اُوپر تو جانا ہی ہے۔‘‘

دونوں تھوڑی دیر بحث و تکرار کرتے رہے۔

پھر کاشف نے ہمت مجتمع کر ہی لی، بولا ''اچھا چلو۔''

دونوں سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ ''ایک بات کہوں'' کاشف بولا۔

''کہو'' انجم نے جواب دیا۔

''یوں کرتے ہیں۔ ذہن میں یہ تصور باندھ لیتے ہیں کہ ہم کسی پُرفضا جگہ پر چہل قدمی کر رہے ہیں۔ اس طرح تکان نہیں ہوگی اور مسافت بھی کٹ جائے گی۔'' کاشف نے جیسے حل نکالا۔

''تم ایسا کر سکتے ہو؟ میں نہیں۔'' انجم کا لہجہ قطعی تھا۔

''پھر تو بڑی مشکل سے چڑھ پائیں گے۔'' کاشف مایوسی سے بولا۔

''تم ٹھیک ہی خوفزدہ تھے۔'' انجم نے اقرار کرتے ہوئے کہا۔

''اب مانے استاد۔'' کاشف چہکا۔

''کالی زبان ہے تمہاری۔ تین برسوں سے یہاں ہوں۔ کبھی لفٹ میں خرابی نہیں ہوئی۔ تم کو اعتراض ہی یہی تھا، اس لیے بدشگونی ہوئی۔'' انجم نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''میرے ساتھ تم بھی لپیٹ میں آ گئے۔''

دونوں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے پہلی منزل پر آ گئے۔ کاشف نے رک کر انگلی اٹھالی، بولا ''ایک گھٹی، باقی رہیں چالیس۔''

انجم اس کی بات پر مسکرایا۔

''انجم'' کاشف بولا۔ ''مصیبت تو بہرحال کاٹنی ہی ہے۔ اس لیے کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہنس کر کاٹیں۔''

''ہنسنے کی بات کرتے ہو مجھے تو رونا آ رہا ہے۔''

''شکر ہے میرا مسئلہ تمہاری سمجھ میں تو آیا۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ یوں کرتے ہیں کہ......''

''کیا۔''

''لطیفہ گوئی کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہنستے ہنستے سیڑھیاں چڑھتے جائیں گے۔ بوریت بھی نہیں ہوگی اور تھکن کا احساس بھی نہ رہے گا۔''

''یہ ٹھیک کہا تم نے۔''

''مجھے بہت سے لطیفے ازبر ہیں۔ سنو گے تو ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جائیں گے۔''

''باتیں کرتے کرتے انھوں نے دوسری سے تیسری منزل بھی طے کر لی۔''

''اچھا میں سناؤں لطیفہ۔''

''سناؤ۔''

اور کاشف لطیفہ سنانے لگا۔

اب وہ چوتھی منزل کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ کاشف لطیفہ سنا رہا تھا لطیفہ سنانے کا فن اسے خوب آتا تھا۔ منہ بنا بنا کر آواز بدل بدل کر لطیفہ اس طرح سناتا کہ سننے والے کو خود بخود ہنسی آ جاتی۔ ہنستے ہنستے وہ سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ پتا بھی نہ چلا اور وہ دونوں ساتویں منزل پر پہنچ گئے۔

''دیکھا'' کاشف نے چند لمحوں کو رک کر کہا ''ہم آٹھویں منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ میری ترکیب کتنی کامیاب ہوئی۔''

''واقعی'' انجم بولا۔ ''سناتے چلو لطیفے۔ وقت اور سفر اچھا گزر رہا ہے۔''

مگر اب ان کی رفتار سست پڑ رہی تھی۔ ٹانگیں شل ہو رہی تھیں۔ لطیفوں کا بھی لطف نہیں آ رہا تھا۔ چوبیسویں منزل پر پہنچ کر دونوں ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گئے۔ ''کچھ دیر رک کر دم لینا چاہیے۔ انجم بولا ''ستانا ضروری ہے۔''

''ہاں، کچھ آرام کر لیں تو باقی منزلیں آسانی سے چڑھ لیں گے۔''

دونوں دس پندرہ منٹ وہیں بیٹھے رہے۔ ان کے قریب سے کبھی کبھی کوئی ہانپتے ہانپتے خراب لفٹ ہی کی باتیں کرتا گزر رہا تھا۔ انھیں اس انداز میں بیٹھے دیکھ کر ایک امریکی نے انھیں مسکرا کر ہیلو بھی کہا۔

ستا کر وہ کچھ تازہ دم ہو گئے۔ دونوں پھر سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ بلندی کی وجہ سے ہوا قدرے ہلکی ہو رہی تھی۔ سانس جلد ہی پھولنے لگتی اور رفتار بھی پہلے کی طرح تیز نہ تھی۔

''یہاں کی خاموشی سے تو میرا جی بھی اوب رہا ہے۔''

''تو شروع ہو جاؤ۔''

''ٹھیک ہے سنو۔''

وہ پھر لطیفے سنانے لگا۔ بعض لطیفوں پر تو انجم کو واقعی اتنی ہنسی آئی کہ پیٹ میں ہنستے ہنستے بل پڑ گئے۔ کچھ منزلیں انھوں نے خاموشی سے طے کیں۔

''بھئی تم نے تو چپ سادھ لی۔ کچھ ہنسو بولو۔ خاموشی سے تو فاصلے بڑھتے ہوئے لگتے ہیں۔'' انجم نے کاشف سے کہا۔

ہنستے، روتے، ہانپتے وہ بالآخر چالیسویں منزل تک آ ہی گئے تھے۔ اب آخری منزل سامنے تھی مگر ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ اپنا وجود سنبھالے نہ سنبھل رہا تھا۔ سانس سینے میں سما نہیں رہی تھی۔

وہ وہاں تھوڑی دیر کو رک گئے۔

''اب تم جا کر دروازہ کھولو'' کاشف نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''میں تم سے زیادہ تھک گیا ہوں۔ اُوپر چڑھنے کے ساتھ ساتھ مسلسل بول بول کر میرا ذہن اور دماغ بھی تکان سے چور ہے۔ تم جا کر دروازہ کھولو، مجھ میں اب دروازہ کھلنے تک کھڑے رہنے کی بھی ہمت نہیں۔''

''چلتے آؤ۔ اب تو ہم اپنی منزل تک تقریباً آ ہی گئے ہیں۔'' انجم نے آخری منزل کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے جیب میں چابی نکالنے کے لیے ہاتھ ڈالا۔

کاشف واقعی بے دم ہو رہا تھا۔ وہ درمیانی سیڑھی پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا۔ ریلنگ سے پشت لگا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور لمبے لمبے بے ترتیب سانس لینے لگا۔

انجم دو سیڑھیاں آگے تھا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ پھر گھبرا کر دوسری جیب دیکھی۔ پھر پتلون کی جیبوں میں ہاتھ گھسیڑے۔ اندر قمیص کی جیب کو تھپتھپایا۔

اس کا دماغ چکرا گیا۔ ریلنگ کا سہارا نہ ہوتا تو شاید وہ گر جاتا۔ کئی لمحے یونہی گزر گئے۔ اسے سمجھ نہ آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ کھلکھلا کر ہنس دے یا چیخ چیخ کر رو دے۔

وہ اسی کیفیت سے گزر رہا تھا کہ کاشف نے آنکھیں کھولیں، سر اٹھا کر انجم کی طرف دیکھا اور اسے کھڑا دیکھ کر غصے سے بولا:

''ابھی تک یہیں کھڑے ہو۔ چار سیڑھیاں اور نہیں چڑھ سکتے تھے۔ میں سمجھا تم نے دروازہ کھول دیا ہے۔''

انجم اسے ٹکر ٹکر تکنے لگا۔

کاشف تیز و تند لہجے میں بولا ''یار کیا بے ہودگی ہے، جاؤ ادھر دروازہ تو کھولو۔ مجھ سے زیادہ تو نہیں تھک گئے۔ میں نے تمھیں اتنے لطیفے سنائے ہیں کہ......''

''لطیفہ تو تمھیں میں سناؤں گا ابھی۔'' انجم روتی ہوئی ہنسی کے ساتھ بولا۔

''کمرے میں جا کر بھی سنا سکتے ہو۔ میں قطعاً ہنسنے کے موڈ میں نہیں۔''

''اس لطیفے پر تمھیں ہنسی تو کیا رونا بھی پڑے گا بلکہ سیدھے سیدھے بے ہوش ہو جاؤ گے۔''

''کیا'' کاشف بیزاری سے چیخا۔

''وہ......وہ میں...... میں اپارٹمنٹ کی چابیاں نیچے گاڑی ہی میں بھول آیا ہوں۔'' انجم روہانسی آواز میں بولا۔

''اوہ تیرا بیڑا غرق......'' کاشف نے ماتھے پر زور سے ہاتھ مارا۔ اس کے چاروں طرف واقعی اندھیرا پھیل گیا تھا۔

ڈاکٹر ایس ایم قریشی

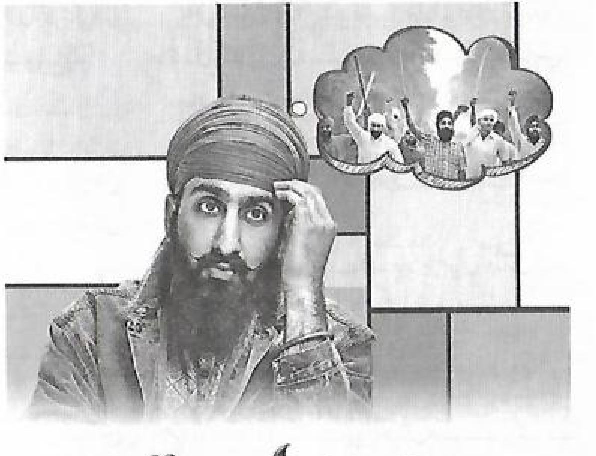

حجامت قبل از گرفتاری

کچھ سزائیں ایسی بھی ہیں جو ملتی ہیں خطا سے پہلے

انسان اپنی طاقت، ذہانت، متانت اور مہارت کے بل بوتے پر شیر، چیتے اور بھیڑیے جیسے خونخوار درندوں کو مطیع کر سکتا ہے۔ تاریخ صدیوں میں ایک آدھ ایسے جانباز کا پتا بھی دیتی ہے جس نے اپنی بیوی پر قابو پا لیا یا ساس کے سامنے ڈٹ گیا لیکن... جذبات کو قابو میں رکھنا ان سب سے مشکل کام ہے۔ اسی لیے استاد ذوق نے کہا تھا ؎

نہنگ و اژدہا و شیر نر مارا تو کیا مارا
بڑے موذی کو مارا نفس امارہ کو گر مارا

ایک صاحب جو پیشے کے لحاظ تاجر تھے، اکثر مصروف سفر رہتے۔ وہ جس ہوٹل میں بھی قیام کرتے احتیاطاً آگ سے بچاؤ کا راستہ تلاش کر لیتے۔ ایک روز کسی ہوٹل میں یہی راستہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے انھوں نے بے خیالی میں ایک باتھ روم کا دروازہ کھول لیا جہاں ایک نوجوان محو غسل تھا۔ انھوں نے جھٹ یہ کہہ کر دروازہ بند کر دیا ''معاف کیجیے، میں فائر ایگزٹ تلاش کر رہا تھا۔''

ساتھ ہی وہ پلٹے۔ ابھی انھوں نے چند ہی سیڑھیاں طے کی تھیں کہ غسل خانے والا نوجوان پانی میں تربتر تولیا لپیٹے پیچھے سے بھاگتا ہوا آیا اور انھیں بازو سے پکڑ کر بدحواسی کے عالم میں بولا ''کہاں لگی ہے آگ؟''

بعض لوگ کسی سے ملنے جائیں تو پیش آنے والی کیفیت کا پہلے سے ذہنی خاکہ تیار کر کے اپنے مؤقف کا تعین کر لیتے ہیں۔ خواتین اپنے آپ کو دنیا کی حسین ترین، ذہین ترین اور نہ جانے کیا کیا ''ترین'' مخلوق سمجھتی ہیں۔ انھیں ہمیشہ دور کی سوجھتی ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ ان کی قریب کی عقل کمزور اور دور کی تیز ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ بہت آگے کی فکر بہت پہلے کر لیتی ہیں۔

ایک مرتبہ ہماری بیگم نے ایک خاندانی تنازع نمٹانے کے لیے ہمیں اپنے قریبی عزیز کے گھر جانے کے لیے کہا۔ ہم بادل نخواستہ راضی ہوئے۔ ہمارے گھر چھوڑنے سے پہلے انھوں نے ہمیں جو ہدایات دیں وہ کچھ یوں تھیں:

''دیکھو وہ خود تو بے چارے سیدھے سادے آدمی

ہیں لیکن ان کی بیوی بڑی فتنہ ہیں۔ تمہارے گھر میں داخل ہوتے ہی وہ مجھ پر الزام لگائیں گی کہ میں تعویذ گنڈا کرواتی ہوں۔ اس پر تم بھی اس عامل کا نام بتا دینا جہاں سے وہ خود تعویز لے آتی ہیں۔ جیسے ہی تم عامل کا نام لو گے بات بڑھ جائے گی اور ان کی ساس مداخلت کرنے لگیں گی۔ یوں تو ساس اور بہو میں بنتی نہیں لیکن میری مخالفت میں دونوں ایک ہو جائیں گی۔ مگر تم ہرگز ڈھیلے نہ پڑنا ورنہ ہماری ناک کٹ جائے گی۔ پھر تمہیں تو معلوم ہی ہے، ان کی چھوٹی بہن بھی ہری مرچ سے کم نہیں۔ اگر وہ...''

اس مرحلے پر ہم نے کان میں انگلیاں ٹھونسیں اور چلا کر کہا ''دور اندیش خاتون، بس اتنا اور بتا دو کہ اگر اس عورت نے تم پر وہ تعویذ والا جائز الزام نہیں لگایا جس کے گرد تم نے اس پوری کہانی کا پلازہ کھڑا کیا ہے تو میں کیا کروں گا؟ تمہاری تازہ ہدایات لینے کے لیے گھر لوٹ آؤں؟''

بیگم نے بیزاری سے کہا ''اب جاؤ گے بھی یا یہیں کھڑے کھڑے باتیں بناتے رہو گے؟''

ہم نے اچانک اپنا بلڈ پریشر گر جانے کا بہانہ کر کے ان کا بلڈ پریشر تو ضرور بڑھا دیا لیکن اپنے آپ کو ایک ممکنہ آفت سے بچا لیا۔ اس لیے کہ ہم اگر وہاں جاتے تو لازماً صلح کر کے آتے اور اس سے ہماری خود دار بیگم کی ناک نہیں کٹ جاتی؟

بعض لوگ اپنے جذبات کے زیر اثر ہمیشہ دوسروں کے جذبات سے کھیلتے ہیں۔ ایک بار سکھوں کے کسی گاؤں کی پنچایت میں فیصلہ کیا گیا کہ گاؤں سے باہر خالی زمین پر گنے اگا دیے جائیں تاکہ علاقے کی خوبصورتی میں اضافہ ہو اور فصل کی آمدنی سے عوام کے لیے فلاحی کام کیے جا سکیں۔ جب تمام منصوبہ بندی مکمل ہو گئی تو ایک خالصے نے کھڑے ہو کر کہا ''او بیلیو! یہ سب تو ٹھیک ہو گیا لیکن آپ جانتے ہیں، ساتھ کے گاؤں والے ہم سب کے ازلی دشمن ہیں۔ وہ اگر ہمارے گنے توڑ توڑ کر کھا گئے تو ہم کیا کریں گے؟''

یہ سن کر ایک دوسرے سردار جی گرج کر بولے ''ہم ان کی ٹانگیں توڑ دیں گے۔ سمجھ کیا رکھا ہے ان لوگوں نے اپنے آپ کو؟''

اس پر چند اور جنگجو لال پیلے ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ سرپنچ نے جوش میں آ کر اعلان کیا ''تو پھر دیر کس بات کی ہے، چلو ابھی انھیں اس حرکت کا مزہ چکھاتے ہیں۔''

چنانچہ پوری جمعیت نے ڈنڈے سنبھالے اور انتہائی طیش کے عالم میں پڑوس کے گاؤں پر حملہ کر دیا۔ وہ ان نہتے، بے قصور اور بے خبر دیہاتوں کو مارتے جاتے اور غصے میں کہتے جاتے ''اور توڑو گے ہمارے گنے؟'' گویا بہ قول فانی ؎

کچھ سزائیں ہیں جو ملتی ہیں خطا سے پہلے

ہمیں بھی ایک بار اپنے ایک کالم کے سلسلے میں ایک جذباتی قاری کی طرف سے ایسی ہی سزا کا حقدار ٹھہرایا گیا۔ کالم کا عنوان تھا ''یاد قاضی عذاب ہے یارب۔'' یہ معصومانہ کالم ''لو میرج'' کے موضوع پر تھا۔ میرج کا ذکر ہو تو قاضی کا ذکر نوک قلم پر آ ہی جاتا ہے۔ بس یہی غضب ہو گیا۔ مذکورہ قاری نے، جن کی سیاسی بصیرت پر ہمیں رشک آتا ہے، اس قاضی کو قاضی حسین احمد تصور کر لیا۔ وہ عنوان دیکھتے ہی جذبات کے ہاتھوں اتنے بے قابو ہوئے کہ کالم پڑھنے کی زحمت گوارا نہ فرمائی اور فوراً ایڈیٹر صاحب کو قاضی حسین احمد کے دفاع میں ایک خط لکھ مارا جس میں ہمارے خلاف بغض و عناد کے اخراج کے بعد دھمکیاں دینے پر اتر آئے۔

خط پڑھ کر ہم نے ان کی ذہانت کی داد دی اور شجاعت کی بھی۔ اس لیے کہ انھوں نے اپنا پتا لکھنے کا خطرہ مول نہیں لیا تھا۔ ہمارے قارئین گواہ ہیں کہ کالم نگاری کی حد تک ہم نے سیاست کو ہمیشہ اپنے لیے شجر ممنوعہ سمجھا ہے، اس لیے کہ آج کل زندگی کے ہر میدان میں سیاست ہے، سوائے میدان سیاست کے، جہاں محض فاؤل پلے ہو رہا ہے لہٰذا ہماری توبہ جو آئندہ کسی تحریر میں قاضی کا لفظ استعمال کریں۔ محاورہ چاہے وزن سے گر جائے لیکن ہم اس کی بھی ٹانگ توڑ کر یہ کہیں گے کہ میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا نکاح خواں! ◆◆◆

اطالوی ہمارے بھائی ہیں

لندن میں مقیم ایک پاکستانی سیاح کا دلچسپ سفر نامہ جنھوں نے تہذیب و ثقافت کے گہوارے، اٹلی میں گھومتے پھرتے ہم وطنوں اور اطالویوں میں بڑی مماثلت پائی اور قدم قدم پر انھیں پیارا دیس یاد آتا رہا

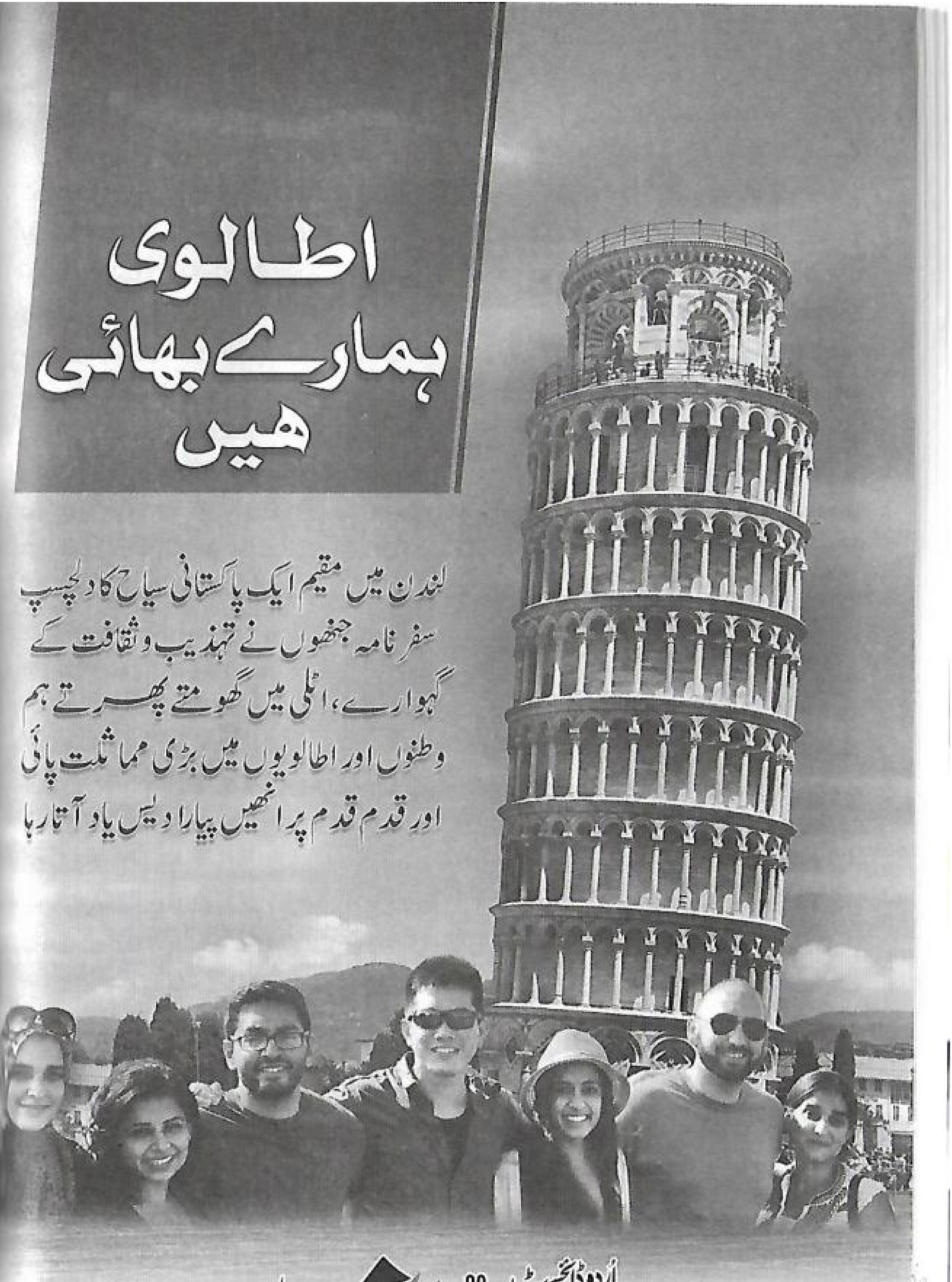

ذکیہ علی بیگ

شہرہ آفاق (خود ساختہ) تحقیق... پاکستانی مردوں کا اطالویوں سے تقابلی جائزہ جوش وخروش سے جاری ہے کیونکہ میں نے دونوں میں خاصی مماثلت پائی۔ اطالوی مرد طبیعت کے لحاظ سے پاکستانیوں کے قریب ہیں۔ باتیں بنانے کے ماہر، تیز تیز بولتے ہوئے، بے تکلف اور ہنس مکھ۔ کچھ اطالوی ساتھی میرے ساتھ کبھی کبھار کام کرتے ہیں تو ان سے بھی تحقیقی مواد جمع کرتی رہتی ہوں۔

اس دفعہ میرے خاوند، خلیل کو اٹلی کے شہر جنیوا میں کچھ کام تھا۔ میں نے سوچا کہ اپنی ریسرچ پر دوبارہ سے کام شروع کرنے کا نادر موقع ہے لہٰذا ساتھ ہولی۔ جنیوا ہوائی اڈے پر ہی تحقیقی مواد جمع ہونے لگا۔ گاڑی کرائے پر دینے والا عملہ تیس کے پیٹے میں ہوگا یا اس سے بھی کم۔ اطالوی مرد خوبصورت مشہور ہیں۔ سروقد، سیاہ بال، گورا رنگ (پاکستان کے لحاظ سے)، گندمی آنکھیں اور شادی سے پہلے تک متناسب جسم۔ بعد میں بیگم کے ہاتھ کی مار، اوہ معاف کیجیے زبان پھسل گئی، میرا مطلب ہے کہ بیگم کے ہاتھ کے پکے پیزا، سپیگٹی، پاستا، چیز وغیرہ کھانے سے ان کے جسم پھیل جاتے ہیں، جیسے ہمارے پاکستانی شوہر بھی دیسی گھی لگا کر روٹی کھائیں، تو جلد موٹے ہو جاتے ہیں۔ ہیں نا بالکل ہمارے پاکستانی مردوں والی باتیں؟

اور سنیے، کار کرائے پر دینے والی ایک ذمے داری پر تین تین بندے مامور تھے لیکن اللہ کے فضل سے کام اور کمپیوٹر کی رفتار وہی تھی جو ہمارے ہاں ہوتی ہے۔ ہم ٹھہرے انگلستان کے عادی جہاں پلک جھپکنے میں کام ہو جاتے ہیں۔

دائیں بائیں سے نکلتے موٹر سائیکل

اللہ اللہ کر کے ائیر پورٹ سے نکلے اور ہوٹل پہنچے جو پرانے شہر کے عین درمیان تھا۔ صرف اطالوی مردوں ہی نہیں ہوٹل نے بھی پاکستان کی یاد تازہ کروا دی۔ اونچی چھتیں، سنگ مرمر کے فرش، لمبی چھت تک کھڑکیاں، روشندان، چوڑے پلنگ اور صوفے۔ انگلینڈ اور جرمنی، ہالینڈ، آسٹریا وغیرہ میں موسم کی مناسبت سے چھوٹے اور تنگ گھر بنتے ہیں۔ بچپن کی یادیں در آئیں جب ہم پنڈی، مری، کراچی وغیرہ امی ابو کے ساتھ جاتے تھے اور ایسے ہی ہوٹلوں میں ٹھہرتے جہاں بل کھاتے لوہے کی جالی والے زینے اور غسل خانے میں چھوٹی چھوٹی صابن کی ٹکیاں ہوتی تھیں کاغذ میں لپٹی ہوئیں۔ ہوٹل کے حالات بھی پاکستان والے تھے، نل سے پانی نہیں آرہا تھا، بلوا کر ٹھیک کروایا۔

ٹریفک کے حالات بھی مختلف نہ تھے۔ موٹر سائیکل والے گھوم گھوم کر دائیں بائیں سے نکل رہے تھے۔ اٹلی میں موٹر سائیکل کی سواری عام ہے۔ یہ مجھے شہاب نامہ میں درج واقعہ کی یاد دلاتی ہے جس کی رو سے اشفاق احمد ہاتھ چھوڑ چھوڑ کر سکوٹر چلا شہاب صاحب کو روم کی سیر کرواتے رہے تھے۔

ہم شام کو دیر تک اندرون شہر کی تنگ گلیوں میں گھومتے رہے۔ سڑک پتھروں سے بنی تھی اور دونوں اطراف تین تین منزلہ گھر تھے جن کی کھڑکیاں گلی میں کھلتی تھیں۔ کھڑکیوں کے چوبی جالی دار پٹ بیرونی دیواروں کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ ایسی گلیوں اور گھروں کا ذکر ''اندلس میں اجنبی'' میں ملتا ہے۔ ان گلیوں میں دکانیں ملتی ہیں اور ریستوران بھی جن کے فٹ پاتھ پر میزیں، کرسیاں اور پھول سجے ہوتے ہیں یعنی وہی مناظر جو مستنصر تارڑ نے کھینچے ہیں۔

پیزا اور جیلاٹو

کھانا کھانے پیزا کی دکان میں گئے۔ اٹلی کے پیزے ہمارے ہاں کے پیزا سے بہت مختلف ہیں۔ ہمارے پیزے امریکی پیزے کی پاکستانی شکل ہیں جس کی موٹی بیس پر ڈھیر سارا پنیر اور گوشت لاد دیا جاتا ہے۔ اطالوی پیزا پتلی بیس، موزریلا چیز اور ٹماٹر کی چٹنی کے ساتھ بنتے ہیں اور بس! جنیوا

میں پیزا ریستوران میں کھائے لیکن وہ مزہ نہ تھا جو روم والے میں تھا۔ روم ہم دسمبر ۲۰۱۴ء میں گئے تھے اور زندگی بھر نہیں بھولے گا وہ سفر۔ عام گلی کی دکان سے لے کر کھائے گئے پیزا میں، بریانی سے بھی زیادہ لذت تھی۔ جانے کس آٹے سے بناتے تھے بالکل کرنچی، ہلکی سی بیس جس پر چیز بینگن یا توری یا شملہ مرچ کی ٹاپنگ۔ منہ میں رکھتے ہی گھل جائیں اور بھاری بھی نہیں۔

روم سے لے کر سسلی کی ساحلی پٹی تک ایک بات اطالوی مردوں میں مشترک نظر آئی کہ وہ خواتین کو ایسی ہی نظروں سے گھورتے ہیں جن سے پاکستانی بازاروں میں واسطہ پڑتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ پاکستانی مرد ڈانٹنے پر باز آ جاتے ہیں لیکن اطالوی اس خوبی سے بے نیاز ہیں۔

بہرحال کھانا کھا کر نکلے تو جیلاٹو کھانے چل نکلے۔ آپ اٹلی آئیں اور پیزا نہ کھائیں تو گناہ کبیرہ ہے۔ ان کی مشہور کافی کپوچینو، ایکسپرسو، موکا نوش نہ کریں تو اٹالین کی بے عزتی ہے لیکن اگر ان کی آئس کریم جیلاٹو نہ کھائیں تو قابل دست اندازی پولیس کیس ہے۔ مجھے تو تمام آئس کریمیں ایک جیسی لگتی ہیں۔ لیکن اس کا شوق رکھنے والے بتاتے ہیں کہ ہر آئس کریم مختلف ذائقہ رکھتی ہے۔ مجھے تو آج تک ایک ہی آئس کریم کا لطف آیا۔ وہ انگلینڈ کے ساحلی علاقے کارن وال کی آئس کریم کا تھا، جو فارم کے تازہ دودھ سے بنتی ہے۔

ہم جہاں بھی جائیں، انگلینڈ سے اپنے ساتھ بارش لے جاتے ہیں۔ یکایک کالی گھٹا اٹھی اور ڈوبتے سورج کو ڈھانپ لیا۔ ہوٹل تک جاتے جاتے گرج چمک کے ساتھ ہوتی بارش نے بہت لطف دیا۔ پاکستان کی یاد پھر سے تازہ ہو گئی۔ بارش تو انگلینڈ میں بھی بہت ہوتی ہے لیکن ہر وقت کن من جاری رہتی ہے بغیر شور کے... عین انگریزوں کے مزاج کی طرح!

صبح ناشتے کے لیے پہنچے تو ایک مکھی بھنبھناتی ہوئی پھر رہی تھی۔ کسی نے اُسے بھگانے کی کوشش نہ کی۔ میں نے اٹلی میں نوٹ کیا کہ پاکستان کی طرح اطالوی بھی مکھیوں، مچھر کے عادی ہو گئے ہیں جب کہ انگلینڈ میں صفائی کا بے حد خیال رکھا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی وجہ اٹلی کا موسم ہو جس میں اتنی صفائی رکھنا مشکل ہے لیکن لاس اینجلس کا موسم بھی تو گرم ہے پر وہاں مجھے صفائی کا معقول انتظام نظر آیا۔ خاص کر کھانے کی دکانوں پر۔ بہرحال واپس چلتے ہیں اطالوی ناشتے کی طرف۔ اٹلی اپنی ڈبل روٹی کے لیے بھی مشہور ہے اطالوی طرح طرح کے نان بناتے ہیں، جس میں زیتون اور ٹماٹر وغیرہ لگاتے ہیں۔ نہایت خستہ، لذیذ اور کافی کے ساتھ مزا دیتے ہیں۔

فلورنس کو روانگی

جنیوا سے باہر نکلے تو پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سمجھ لیں کہ ہم پنڈی سے جہلم جا رہے ہیں۔ سرسبز پہاڑیاں کاٹ کر جو بہت اونچی نہیں، سرنگوں میں سے سڑکیں نکالی گئی ہیں۔ پہاڑ سے گزرتے ہوئے سمندر نظر آیا۔ اٹلی کے سمندر بہت خوبصورت ہیں۔ تاحد نظر نیلے رنگوں کا حسین امتزاج، گرم سمندر جو سمندری حیات سے مالا مال ہے۔ ٹسکنی کا علاقہ ساحلی پٹی اور رنگ برنگ کھانوں کے لیے شہرت رکھتا ہے۔ جیسے جیسے ہم سفر طے کرتے فلورنس کی جانب بڑھے، پاکستان کی یادیں سمندری لہروں کی طرح ذہن پر مدوجزر بنانے لگیں۔ لگتا تھا ہم پاکستان میں سفر کر رہے ہیں۔ اطالوی بھی پاکستانیوں کی طرح سڑکوں پر گاڑیوں کو ادھر ادھر سے نکالنے کے ماہر ہیں۔ پاکستان بہت یاد آیا۔

پہاڑ سکڑ کر اطراف میں سمٹ رہے تھے اور اطراف میں کہیں کہیں گھر نظر آتے اور کہیں کہیں فصلیں۔ زیتون کے درخت ایسے عام ہیں جیسے ہمارے ہاں نیم کے۔ مکانات کی تعمیر بھی موسم کی مناسبت سے کھلی کھلی ہوتی ہے۔ کھپریل چھتیں، کھڑکیوں کے باہر کھلتی بالکنی اور وسیع دالان و صحن میں دھوپ میں سوکھتے کپڑے۔ گھروں اور گلیوں میں کوئی ترتیب نہیں، بس چلے جا رہے ہیں۔

کھانا پیش کرنا آرٹ ہے

فلورنس پہنچے تو شام ڈھل رہی تھی اور موسم بے حد خوشگوار تھا۔ ہوٹل میں ہم کھانا کھانے گئے۔ اطالوی، انگریزی اور فرنچ ریستوران میں کھانا کھانے کے بھی آداب ہیں۔ بیروں کا انداز تکلم اور انداز آداب دونوں نہایت پرتکلف ہوتے ہیں۔ پہلے آپ کو مینو پیش کیا جاتا ہے جس کے بعد خمر دی جاتی ہے۔ خمر کی کئی قسمیں ہیں، ہر کھانے کے ساتھ مخصوص وائن پی جاتی ہے۔ کھانا پیش کرنا اور اس کے بارے میں بتانا بھی ایک آرٹ ہے۔

ہم نے ہنگری میں اس فن کا نمونہ دیکھا۔ بیرا سالم

فٹ پاتھ پر بنا ریستوران

ٹراؤٹ مچھلی دم پخت کر کے لایا۔ اس نے چھری کی مدد سے درمیان سے کاٹا اور دو چمچوں کی مدد سے ایک جھٹکے میں ریڑھ کی ہڈی نکال لی۔ یہ ایسا مظاہرہ تھا کہ اسے بے داد ملتی ہو گی کیونکہ اس نے نہایت فاتحانہ نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔ ایسی ٹراؤٹ دوبارہ صرف مشی گن کی جھیل کی ہی نصیب ہوئی لیکن ایسا مظاہرہ دیکھنے کو نہ ملا۔ واپس چلتے ہیں اطالوی ریستوران میں۔ پھر بیرا آپ کے سامنے ٹوکری میں اطالوی نان، تافتان کے ٹکڑے رکھ دے گا۔ زیتون کا تیل ڈال کر کھائیے بہت لطف آئے گا۔

اس کے بعد وہ پہلا کورس لائے گا۔ کھانا ڈونگوں میں نہیں لایا جاتا۔ یورپ میں یہ کورس کی شکل میں پیش ہوتا ہے۔ میں نے پاستا، وائٹ ساس اور خلیل نے سپیگٹی ٹماٹر ساس میں منگوائی جو بہت لذیذ تھی۔ ملازم پھر برتن اٹھا کر لے گیا۔ گلاس بھی تین رکھے جاتے ہیں آپ کے سامنے: وائن گلاس، پانی کا اور سوفٹ ڈرنک والا۔ چھری کانٹوں کی بھی خاص ترتیب ہوتی ہے۔

اطالوی مرد حضرات اور پاکستانیوں میں ایک قدر مشترک ہے کہ وہ اپنے کھانے کو بے حد سنجیدگی سے لیتے ہیں۔ کھانے کے معاملے میں کوئی سمجھوتہ نہیں کرتے! کھانا مزیدار ہونا چاہیے۔ پنیر اور زیتون کے تیل کی بہتات ہو اور خوب ہو۔ اسی لیے پاکستانیوں کی طرح اٹالین مرد بھی شادی کے بعد توند نکال لیتے اور جلد ڈھل جاتے ہیں۔

شہر کی سیاحت

صبح ہم بس پر سوار ہو کر شہر پہنچے۔ بس سٹاپ کے قریب

ایک کیفے تھا۔ میں نے ایکسپریسو میں، جو انتہائی تلخ کافی ہوتی ہے، دودھ ڈال دیا تو گویا لطیفہ ہوگیا۔ سب لوگ زور زور سے اشارے کر کر کے ہنسنے اور زور زور سے اٹالین میں بولنے لگے۔ بالکل پاکستانی دکان والا منظر تھا۔ اطالوی یہ کڑوی کسیلی کافی پی کر اوپر سے پانی کا گلاس پیتے ہیں۔ عجیب رسم و رواج ہیں ملک ملک کے!

اطالوی آج بھی اپنے کلچر پر خاصا غرور کرتے ہیں، اپنی لمبی ناکوں کی طرح۔ روایتی اطالوی میکڈونلڈ، کے ایف سی اور سٹار بگ وغیرہ میں جانا جرم سمجھتے ہیں۔ کافی کوئی ان کے جیسی نہیں بنا سکتا، کیا مجال کہ کسی اور کی کافی پسند آجائے۔ ہر موقع کی کافی الگ ہے۔ صبح تلخ کافی ایکسپریسو نوش کی جاتی ہے جس کے بعد پانی کا ایک گلاس۔ صبح صبح کپوچینو پئیں تو وہ بہت برا مناتے ہیں۔ چائے صرف ایک بار پیتے ہیں جو انگلش بریک فاسٹ کہلاتی ہے۔ انگریز خود کو دنیا سے ارفع سمجھتے ہیں، اسی لیے طرح طرح کی چائے پیتے ہیں۔

فلورنس کی وجہ شہرت یہ ہے کہ وہ قرون وسطی میں تجارت و مالیات کا مرکز تھا۔ وہ نشہ جو روم کی تاریخی عمارات دیکھتے ہوئے چڑھتا ہے، شاید فلورنس پہنچ کر اتر جاتا ہے۔ روم کی تنگ تنگ، اینٹوں سے بنی گلیوں میں چلتے ہوئے لگتا ہے جیسے آپ زمانہ قدیم میں سانس لے رہے ہوں۔ قدم قدم پر گرجے آتے ہیں کیونکہ روم کیتھولک عیسائیت میں مکہ کا درجہ رکھتا ہے۔ گرجوں اور عمارتوں کے باہر مذہبی مجسمے نصب ہیں۔ کئی منزلہ مکان جن کی کھڑکیوں پر سبز رنگ کے لکڑی کے شٹر جو اٹلی، مالٹا اور اسپین میں عام ہیں اور ان سے لٹکتی پھولوں کی بیلیں۔

راستے میں چلتے راہب جو زمانہ قدیم کے سفید لباس میں ہوتے ہیں۔ ان کی کمر سے بندھی رسی اور صلیب، راہبائیں جو عبائیں پہنے، صلیب لٹکائے، کھڑاوئیں پہنے چل رہی ہیں۔ لگتا ہے ابھی رات ہوگی اور مشعل بردار صلیب اٹھائے، جلوس کی صورت میں نمودار ہو کر ان تنگ گلیوں کا طواف کریں اور مناجات گائیں گے۔

لیکن فلورنس میں ایسا کچھ نہ تھا۔ گلیاں تھیں اور گرجے بھی لیکن روحانیت مفقود تھی۔ شاید ہر جگہ کا اپنا خاص اثر ہوتا ہے۔ روم میں تقدس کی فضا ہے۔ روم عیسائیت کا مرکز ہونے کے باعث کمرشل ازم سے آج بھی خاصی حد تک دور ہے۔ فلورنس بھی اپنی تاریخی عمارات اور حسن کے لیے مشہور ہے۔ ویسے تو اٹلی کا ہر شہر تاریخی عمارات سے مالا مال اور دیکھنے کے لائق ہے۔

فلورنس میں پنینی کی ایک دکان بہت مشہور ہے۔ چھوٹی سی دکان میں بہت بھیڑ تھی۔ پنینی برگر کی قدیم قسم ہے۔ ہم نے بھی یہ برگر کھایا مگر اپنے پلاؤ اور بریانی کے سامنے وہ ماند دکھائی دیا۔

دکان کے سامنے ایک شاندار عمارت تھی۔ کئی کونوں والی، قدیم تعمیرات کا شاہکار۔ ایک سرے سے دوسرے تک نقش و نگار۔ ایسی شاندار اور پرشکوہ کہ دیکھو تو دیکھتے چلے جاؤ۔

اٹلی کے گرجا گھر

اس کے اندر جانے کے لیے لمبی قطار لگی تھی۔ ہم اندر گئے تو معلوم ہوا گرجا گھر ہے جو خاندان مدیسی (House of Medici) کے رئیس اعظم نے بنوایا تھا۔ اودھ اور لکھنو کی طرح زمانہ قدیم میں ہر ملک کے شہروں میں تہذیبی مسابقت تھی۔ پیرس اور فلورنس کی بھی مسابقت مشہور تھی۔ ان کے نواب ہر دم نئی نویلی عمارات بنوا کر بازی مارنے کی فکر میں رہتے۔ آج کل الامارات کے حکمران بھی نت نئی عمارتیں بنا رہے ہیں۔

یہ پندرھویں صدی کا شاہکار گرجا تھا جو کلیسا سان لورنیز[o] کہلاتا ہے۔ اتنے بڑے گرجا گھر کے اوپر گنبد تعمیر کر[نا] آسان نہ تھا اور نواب خاندان سبقت لے جانے کے لیے اسے ہر حال میں بنوانا چاہتا تھا۔ مشہور ماہر تعمیرات [ب]رونلسکی نے یہ ذمہ لیا اور کر دکھایا۔ اس نے پھر اپنے ڈرافٹ کا بلیو پرنٹ جلا دیا۔ لیکن انگریز قوم بھی بضد تھی کہ راز کھول کر دم لے گی۔ انھوں نے تھری ڈی کی مدد سے راز جان لیا۔ اگر آپ آرکیٹیکٹ ہیں تو بی بی سی کی ویب سائٹ پر جا کر ساری داستان پڑھ سکتے ہیں۔

گرجا گھر حضرت عیسیٰؑ، بائبل کی کہانیوں، حضرت مریمؑ، فرشتوں، جنّت، جہنم، راہبوں وغیرہ کی تصاویر سے سجا تھا۔ گنبد میں بھی خوبصورت نقش نگاری کی گئی تھی لیکن وہی بات کہ روم والا مزہ نہ آیا۔

روم میں واقع ویٹیکن سٹی کیتھولک عیسائیوں کا خانہ کعبہ ہے۔ واہ! کیا شاندار عمارت ہے۔ ہم ٹکٹ کی قطار میں کھڑے تھے تو پوپ نے کھڑکی میں آ کر خطبہ دیا۔ ہزاروں کے مجمع نے دم سادھ کر سنا، جیسے خانہ کعبہ میں جمعہ کا خطبہ ہو۔ مذہب کی طاقت کا اندازہ ہوا۔ ویٹیکن سٹی مائیکل اینجلو کے فن مصوری کا شاہکار ہے۔ جب اندر گئی تو مبہوت رہ گئی۔ میں نے ایسی شاندار عمارت کبھی نہ دیکھی تھی۔ سرتاپا دلہن کی طرح سجی۔ مائیکل اینجلو کے متعلق برسوں پہلے نصاب میں پڑھی تاریخ گویا حقیقت میں تبدیل ہوگئی۔ باکمال فنکار جس نے پوری بائبل ویٹیکن میں چھاپ دی۔ خود وہ لادین تھا۔ شرابی، خود پرست اور بدزبان۔ اپنے کام میں رعایت نہ کرنے والا اور پرفیکشنسٹ۔

مہذب قوم... ایک نعمت

فلورنس کی گلیوں میں ہزاروں نہیں لاکھوں کا مجمع دکھائی دیتا ہے مگر نہایت پرامن، کسی کا کچھ چوری نہیں ہوتا (ہوا ہو تو علم نہیں) کسی نے دوسرے کو نہیں چھیڑا سوائے نگاہ مستانہ ڈالنے کے۔ ایک مہذب قوم ہونا بھی کتنی بڑی نعمت ہے۔ مجھے ٹی وی میں دیکھے گئے پاکستانی سیاسی جلسے کے بعد بٹتے کھانوں کے مناظر یاد آگئے۔ جانور بھی جنگل میں ایسے ہی کھاتے ہیں جیسے پاکستانی کھانے پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ شرمناک مناظر ہیں۔ ان پر پابندی ہونی چاہیے۔ دل خراب ہوتا ہے بلکہ اس کو چھوڑیے، ہمارا اعلیٰ طبقہ شادی بیاہ میں کیا کرتا ہے؟ یقین نہیں آتا کہ ہمارا تعلق صوفیاء کی سرزمین سے

فلورنس کا مشہور گنبد والا مقبرہ

ہے جو ضبط نفس کا سبق دیتے ہیں۔

ہم پھر ایک روز گارڈن پہنچے۔ سخت دھوپ میں پودے کملائے ہوئے تھے۔ باغ میں گلاب تھے مگر خوشبو ندارد، پاکستانی باغ تو مہک رہے ہوتے ہیں۔ باغبانی میں سوئس، جرمن، سویڈن اور انگریز ماہر ہیں۔ ان کا موسم باغبانی کے لیے موزوں نہیں پھر بھی لندن میں ہر سال چلسی کا شو ہوتا ہے جس میں انواع واقسام کے پودے ہوتے ہیں اور پھولوں کو تو دیکھتے ہی رہیے۔

راستے میں نوادرات کی دکان آ گئی۔ اطالوی فرنیچر اپنی ڈیزائننگ کے لیے پورے یورپ میں مشہور ہے۔ اندر گئے۔ سیستا یعنی قیلولے کا وقت تھا۔ دکاندار خاتون بور ہو رہی تھیں لہٰذا ہم سے لمبی چوڑی گفتگو چھیڑ دی۔ گویا اس معاملے میں بھی اطالوی پاکستانی جیسے ہیں۔ بہت باتیں کرتے اور فوراً بے تکلف ہو جاتے ہیں۔ انگریزوں کی طرح سنبھل کر گفتگو نہیں کرتے بلکہ لاہوریوں کی طرح دل کی بات لبوں پر ہی رہتی ہے اور ہنستے مسکراتے رہتے ہیں۔

شام تو ڈھل رہی تھی مگر بہت کچھ دیکھنا باقی تھا۔ ہم گلیوں میں گھومتے گھومتے پیزا کے چھوٹے سے ریستوران میں چلے گئے۔ اس کے ساتھ والا ریستوران صرف پاستا بناتا تھا۔ یہاں بھی پاکستان کی طرح ریستوران کے باہر کھڑے ہو کر گاہک گھیرنے کا رواج ہے۔ ایک خوبصورت سا نوجوان صاف ستھرا ایپرن پہن کر مینو پکڑے کھڑا تھا۔ اس کی مسکراہٹ بہت خوبصورت تھی۔ اسے دیکھ کر اپنی سہیلی کی بات یاد آ گئی، ”ذکیہ، اب تو کوئی بھی خوبصورت لڑکا دیکھ کر پتا نہیں کیوں اپنا بیٹا یاد آ جاتا ہے“۔

پیزا کھا کر ہم آئس کریم کی سب سے بہترین دکان کی جانب چلے۔ حقیقت ہے کہ انٹرنیٹ نے دنیا کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ اب لوگ اپنی آرا ہم تک بآسانی پہنچا دیتے ہیں۔ آئس کریم کی اس دکان کو انٹرنیٹ پر لوگوں نے بہت پسند کیا تھا۔ دکان پر پہنچے تو چھوٹے سے پیارے کتے نے جس کی دم سے ربن بندھا تھا، پیار سے سونگھ کر ہمارا استقبال کیا۔ اطمینان ہونے پہ اپنے تکیہ پر لیٹ مراقبے میں کھو گیا۔ آئس کریم مزے کی تھی۔ کھا پی کر بس میں بیٹھے تو اتنی بھری ہوئی تھی کہ سانس لینے کی بھی جگہ نہ تھی۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ اس سے تو پیدل چلنا بھلا تھا سو اتر کر چل دیے۔

اٹلی فطری خوبصورتی، کھانوں، زبان، ثقافت اور خمر کے علاوہ اپنے برانڈز (Brands) کی وجہ سے بھی عالمی شہرت رکھتا ہے۔ اطالوی برانڈ اور ڈیزائننگ بہت اعلیٰ معیار کی ہے مثلاً بربری، وارچی، وغیرہ۔ روم میں بھی دکانیں ڈیزائنر برانڈ سے مالا مال ہیں۔ اطالوی چمڑے کی مصنوعات بھی اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ دکاندار بھی پاکستانی دکانداروں کی طرح بے حد چرب زبان ہیں۔ آپ کو بیچ کر دم لیں گے (جی ہاں، آپ کو بھی)۔ آپ کو دکان کے باہر جاتے جاتے بھی چیزیں بیچتے چلے جائیں گے، بالکل پاکستانیوں کی طرح۔ انگریزوں، جرمنوں، ڈچ اور ڈنمارک کے لوگوں کا رویہ ہے کہ خریدنا ہے تو خریدو ورنہ اللہ حافظ۔

روم کا ٹھگ

روم کا ایک اور واقعہ یاد آ گیا۔ ایک اطالوی نوجوان نے جو فیٹ کار میں بیٹھا تھا، سڑک کے کنارے کھڑے ہارن بجا بجا کر ہمیں متوجہ کیا، بالکل پاکستانی سٹائل میں۔ مجھے بہت ناگوار لگا کیونکہ انگلستان میں یوں ہارن بجانا گالی دینے کے مترادف ہے۔ مسلسل ہارن بجنے پر خلیل متوجہ ہوئے۔ ایسا لگتا تھا گویا اٹلی میں بنائی گی ۶۰ء کی دہائی کی ہالی وڈ فلم کا منظر ہے۔ فیٹ میں بیٹھا چھیل چھبیلا سا دبلا نوجوان جس نے بالوں کے گچھے اکڑا کر آگے کیے ہوئے تھے اور ٹیڈی ڈیزائنر لباس میں ملبوس تھا، اطالوی انداز میں انگریزی بولتے خلیل سے کہنے لگا کہ میں وثاچی کا نمائندہ ہوں۔ فیشن شو سے آ رہا ہوں۔ اب میلانو (میلان) جا رہا ہوں۔ آپ بہت اچھے لگے۔ ذرا راستہ تو بتا دیں میلانو کا۔

(سوچیے ذرا، کیا غیر ملکیوں کو میلانو کا راستہ پتا ہو گا؟

کسی مقامی سے پوچھو اپنی زبان میں۔ بہانہ تو ڈھنگ کا بناؤ ٹھگنے کے لیے ورنہ پاکستانیوں سے سبق لو، اس معاملے میں ہم سے بہتر ہیں)۔ خیر خلیل نے کہا مجھے تو میلانو کا راستہ معلوم نہیں۔ اس نے کہا، میرے پاس یہ سیمپل کے ڈیزائنر سوٹ ہیں۔ فیشن شو والوں نے دیے تھے۔ آپ کو میری طرف سے تحفہ۔

اٹالین بلاشبہ مہمان نواز ہیں مگر مجھے تشویش ہونے لگی۔ خلیل کو میں نے واپس آنے کے لیے آوازیں دینی شروع کر دیں۔ خلیل نے کہا کہ میں نہیں لے سکتا۔ اس نے کہا، اچھا، پھر ۴۰ یورو کا پیٹرول ڈلوا دو، میلانو جانے کے لیے اور ۵۰۰ یورو کے سوٹ لے لو۔

میں نے چیخ کر کہا ”فراڈیا“۔ وہ جلدی سے گاڑی چلا کر بھاگ گیا۔ اس قسم کے نوسر باز پاکستان ہی نہیں دنیا کے تقریباً ہر ملک میں پائے جاتے ہیں۔

جب دیرپا خوشی ملی

فلورنس میں عوام کی سہولت کے لیے جگہ جگہ ہینڈ پمپ لگے ہیں جیسے کبھی ہمارے ہاں بھی سبیل عام ہوا کرتی تھی۔ پیاس لگی تو میں نے ہینڈ پمپ چلا کر پانی پینا شروع کر دیا۔ ایک آدمی نے دیکھا تو بھاگا بھاگا پانی کی بوتل بھرنے چلا آیا۔ پھر ایک اور، اور ایک اور، مجھے ایسا لگا کہ یہ بھی روحانیت کا کوئی درجہ ہے جب آپ بلا امتیاز رنگ و نسل کسی کو پانی پلانے لگتے ہیں اور خصوصاً جب اس میں کوئی غرض پوشیدہ نہ ہو۔

لوگ کچھ حیران تھے لیکن خوش بھی۔ ایک چینی عورت کا بیٹا بھی پانی کی بوتل بھرنے بڑھا۔ اس عورت کے چہرے پر ممنونیت کے نقش گہرے تھے اور احترام و حیرت کے بھی۔

مصنفہ کے عقب میں رومن اسمبلی کی عمارت ہے

پھر بعد میں وہ پانی پینے آگے بڑھی۔ میں اس کے دس بارہ سالہ بیٹے کے چہرے پر آئے تاثرات فراموش نہیں کر سکتی۔ اپنی ماں کو پانی پلاتے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں میرے لیے ممنونیت اور پیار بھرا تھا۔ وہ دس سالہ بچہ جیسے اپنی ماں کا رکھوالا تھا اور اس کی ممنونیت میں اپنی ماں کے لیے محبت پنہاں تھی۔ اس نے بڑے احترام سے مجھے گرسیا (شکریہ اطالوی زبان میں) کہا اور ہینڈ پمپ کی موٹر پکڑ بھی لی۔

یہ چند لمحوں کا کھیل تھا لیکن ہم اجنبی ہوتے ہوئے ایک دوسرے کے جذبات محسوس کر سکتے تھے۔ مجھے انگریز نیورو سرجن ہنری مارش کی بات یاد آ گئی کہ اصل اور دیرپا خوشی مادی چیزوں سے نہیں ملتی، وہ کسی کی دادرسی کرنے میں پنہاں ہے۔ شاید یہ وہی کیفیت ہے جس میں انسان ایک دفعہ گم ہو جائے تو یہ ظاہری دنیا بے معنی ہو جاتی ہے۔ ہم اکثر واقعات میں پڑھتے ہیں کہ کئی بزرگ ساری عمر پانی پلانے کی ڈیوٹی پر ہی رہے اور روحانیت کے اعلیٰ درجے پا گئے۔ اس کیفیت میں بہرحال ایک نشہ تو ہے۔ یہ کیفیت میں نے بارہا محسوس کی ہے۔ مادی اشیاء کے حصول کی خوشی لمحاتی ہے اور جب کسی کی مدد کر دی تو اس سرور کی کیفیت جاوداں ہو گئی۔

اسلام آباد کی یاد

خیر واپس فلورنس چلتے ہیں۔ وہاں موسم ہمیشہ معتدل رہتا ہے، لہٰذا گھروں کے باہر صحن ہیں اور بالکنی بھی۔ ہوٹل کے باہر بھی بالکنیاں بنی تھیں۔ میں دیر تک اس میں کھڑی پہاڑوں کے پار سورج کو ڈوبتے دیکھتی رہی۔ مجھے فلم 'جہاں آرا' کا ایک کلاسیک سین یاد آ گیا جس میں قلعہ بند جہاں آرا (اداکارہ مالا سہنا) جھروکے میں بیٹھی اندھیرے میں باہر دیکھ رہی ہے۔ اس کی ملازمہ آ کر پوچھتی ہے "بیگم صاحبہ، اندھیرے میں کیا دیکھ رہی ہیں؟" جہاں آرا کہتی ہے "آگرہ"۔ وہ حیرت سے پوچھتی ہے "آگرہ؟" کیونکہ جہاں آرا آگرہ سے میلوں دور بیٹھی ہے۔

میں بھی فلورنس، اٹلی کی بالکونی میں کھڑی اسلام آباد کو دیکھ رہی تھی۔ اسی قد و قامت والی مارگلہ کی پہاڑیاں۔ شہر بھی ویسا ہی۔ سامنے ایک دو بوسیدہ مکانات استادہ جو اب خالی تھے۔ پاکستان کے گھروں کی طرح صحن، بڑے بڑے کمرے اور برآمدے۔ یادیں تھیں کہ موج در موج آتی گئیں۔ پھر سورج ڈوبنے لگا اور اس کی کرنیں مارگلہ کی پہاڑیوں کو شعلہ بار کرنے لگیں۔ آہستہ آہستہ اندھیرے کا راج ہونے لگا اور پہاڑ پر کہیں کہیں بتیاں ٹمٹمانے لگیں۔ شہر میں بھی بتیاں جل اٹھیں۔

یہ جلترنگ بھی اسلام آباد جیسا تھا۔ جلتی روشنی میں بے ترتیبی، ہوا میں تازگی، فضا میں خوشگوار حدت، بڑے سے ہوٹل کا پارکنگ ایریا اور لان۔ سامنے کسی مقدس ہستی کے مجسمہ کا استھان، جلتی بتیاں اور اس پر پڑے منّت کے سکے۔ ہماری طرح اطالوی بھی خاصے مذہبی ہیں۔ ہر وقت دعائیں اور مناجات پڑھتے رہتے ہیں۔ صلیب اور مریم و عیسیٰؑ کے مجسمے عام ہیں۔ مذہب سے عقیدت غیر معمولی ہے۔ عورتیں پاکستانی خواتین کی طرح وفا شعار اور گھریلو ہیں۔ فراک پر ایپرن پہنے کھانے پکاتی ہوئیں۔ بچوں کی فوج ظفر موج، شو مارنے کا شوق، شوخ چیزوں کا اہتمام۔ عورتیں اور مرد خوبصورت نقش و نگار والے، لیکن جوانی پھلانگتے ہی بھدے جسم کے ہو جاتے ہیں۔ کھانے اور کھلانے کے شوقین اور پینے کے بھی۔

اطالوی مرد رنگیلے مزاج کی وجہ سے بھی معروف ہیں۔ فلرٹ کرنا کوئی ان سے سیکھے۔ یورپ میں مشہور ہے کہ جنّت میں اطالوی عاشق و معشوق ہی ہوں گے۔ عورتوں کو گھورنے کے شوقین۔ پاکستانی مردوں سے زیادہ ڈھیٹ ہیں ہمارے اٹالین بھائی۔ پاکستانی مرد تو ڈانٹنے یا واپس گھورنے پر شرمندہ ہو جاتے ہیں لیکن یہ حضرات اپنا وتیرہ نہیں بدلتے۔

صبح اٹھ کر کھڑکی کھولی اور پردہ اٹھایا اس بے یقینی کے ساتھ کہ جانے آج کیسا موسم ہو گا۔ "واہ" بے ساختہ دل نے کہا، کتنا پیارا موسم، خوبصورت چمکتی صبح جو سورج کی سنہری کرنوں میں نہائی ہوئی تھی۔ دور پہاڑوں پر بھی کرنیں رقص صبح میں محو تھیں۔ پھر پاکستان یاد آ گیا اور بچپن کا وہ گیت بھی جو

صح کی نشریات میں ٹی وی پر سکول جاتے وقت سنا کرتے تھے: "پورب کا دروازہ کھلا، ٹھنڈی ٹھنڈی چلی ہوا، سورج نے کہا جاگو جاگو صبح ہوئی"۔ جبکہ میں تو عادی ہو گئی ہوں کہر آلود ش صبح کی! پردہ ہٹائیے اور کبھی معلوم نہیں ہوتا کہ کیا منظر ہے، کبھی سورج نکلتا تو گھڑی بعد بارش ہونے لگتی۔ عموماً دلوں بھرا سرد موسم ملتا۔

مجھے ہوٹل میں کمرے کی کھڑکی کے باہر لگے شٹر بھی بہت پسند آئے۔ بٹن دبانے پر خودکار طریقے سے نیچے اوپر ہوتے۔ پٹ بھی مکمل یا نیم وا ہو سکتے تھے۔ سخت گرمی میں کمرے میں سورج کا داخلہ مکمل ممنوع کر دیتے۔ اپنی مرضی کے مطابق کرنیں انھیں نیم وا کر کے مدہم کر لیں۔ عرب ممالک میں بھی ایسے لکڑی کے منقش تختے لگے ہیں جو شدید گرمی میں حدت روکتے ہیں۔

پیسا کا خمیدہ مینار

ہر رُت کا اپنا مزہ ہے۔ سخت گرمی میں دوپہر کے وقت نیم روشن کمروں میں سونے اور شام کو چھڑکاؤ کر کے باہر بیٹھنے کا! یہ مزہ انگلستان میں مفقود ہے لیکن وہاں کی سخت سردی میں آتشدان میں لکڑیاں، اُونی جرابیں پہن کر گرما گرم چاکلیٹ پینے میں عیاشی ہے۔ خاص طور پر جب آپ کا گھر پہاڑی پر ہو، باہر بارش ہو، ہوائیں چل رہی ہوں یا برف گر رہی ہو، گھپ اندھیرے اور خاموشی میں!

چلتے ہیں اب پیسا کی طرف۔ ترچھا مینار جو شاید کسی پاکستانی ٹھیکیدار نے بنایا تھا۔ ہم اسے دیکھنے فلورنس سے نکلے۔ پہاڑیاں دور بھاگنے لگیں جیسے ہم پھر اسلام آباد سے جہلم جا رہے ہوں۔ جگہ جگہ زیتون، سبزیاں کاشت ہو رہی تھیں لیکن جہلم کی طرح زیادہ زور معدنی وسائل کی دریافت پر

پیسا کی ایک رومانوی گلی

تھا۔ سنگ مرمر کے ڈھیر لگے تھے۔ اطالوی سنگ مرمر کی شہرت کے بارے میں کون نہیں جانتا؟

قدم قدم پاکستان کو یاد کرتے، بالآخر پیسا شہر پہنچے۔ یہ مینار اور ایک شاندار کلیسا ساتھ ساتھ ہیں۔ وہاں امریکی سیاحوں کی کثرت تھی۔ بے شمار اٹالین اٹھارویں اور انیسویں صدی کے آغاز میں قحط، غربت اور جنگ اول و دوم کی وجہ سے امریکا سدھار گئے تھے۔ ایسے امریکی اپنے پرکھوں کی تلاش میں انگلینڈ، آئرلینڈ، جرمنی، ویانا، پولینڈ وغیرہ بھی آتے ہیں۔ ان کا رویہ عام سیاحوں سے مختلف ہوتا ہے، گویا وہ دنیا کے مالک ہیں۔ بہت لیے دیے رہتے ہیں۔ اپنے آپ کو ڈان سمجھتے اور کافی بدتمیز بھی ہوتے ہیں۔ اٹلی آ کر بھی چپس اور مچھلی کھانے کی فرمائش کرتے ہیں۔ حقیقی امریکی عموماً خوش اخلاق اور دوستانہ رویہ کے حامل ہوتے ہیں۔

کھانا کھا کر گرم چمکتی دوپہر میں ہم گلیوں کی خاک چھاننے نکل کھڑے ہوئے۔ پتھروں سے بنی گلیاں، دورویہ مکانات، گھروں کی کھلی کھڑکیاں۔ چلتے چلتے دریا کے قریب پہنچے، نہایت آلودہ تھا۔ چاکلیٹ کی دکان پر پہنچے تو طرح طرح کی چاکلیٹیں دیکھنے کو ملیں۔ یورپ نے چاکلیٹ کو بھی ایک آرٹ بنا دیا ہے۔ اس میں وہ ایسے ذائقے اور نمونے دریافت کرتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جائے۔ البتہ اس فن میں بھی اطالوی فنکاروں کے برابر کوئی نہیں۔

گلیوں سے پھرتے پھراتے گرجا گھروں کے پاس سے گزرتے پیسا مینار کی طرف چلے۔ ایک گرجا گھر میں بپتسمہ دینے کی رسم ہو رہی تھی جس میں بچوں کو باقاعدہ عیسائی بنایا جاتا ہے۔ دیکھنے میں اچھا لگا۔ روم کی یاد پھر سے آ گئی۔ وہاں ہر گرجے میں دن میں کئی بار یہ رسم انجام دی جاتی ہے۔ پادری خطبہ دیتا ہے جو شاید لاطینی زبان میں ہوتا ہے۔ قدیم بائبل اسی زبان میں تھی۔ جرمن پادری مارٹن لوتھر نے وہی کام کیا تھا جو شاہ ولی اللہ نے ہندوستان میں کر ڈالا یعنی الہامی کتاب کو مقامی زبان میں ترجمہ کر دیا تاکہ یہ خواص کی کتاب بن کر نہ رہ جائے۔ اس کام نے یورپ میں وہی انقلاب برپا کیا جو ہندوستان میں دیکھنے کو ملا۔ عام آدمی کو پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ مذہب پر برہمن کی اجارہ داری نہیں بلکہ اس کا پیغام ملت و نسل سے بالاتر ہے۔

چلتے چلتے پیسا پہنچے تو معلوم ہوا کہ اندر جانے کے لیے تین گھنٹے انتظار کرنا ہو گا۔ میں تھک گئی تھی۔ گھاس پر لوگ سو رہے تھے۔ ہزاروں کا مجمع تھا لیکن سبھی ایسے سکون سے بیٹھے تھے کہ طلائی سکے بھی اچھال دو، کوئی توجہ نہیں دے گا۔ شاید تعلیم و تربیت اسی کو کہتے ہیں۔ گھاس کا قطعہ گرجے کے قبرستان کے پہلو میں تھا جہاں قدیم روحیں روزِ محشر کا انتظار کر رہی ہیں۔ میں بھی وہاں اسی انتظار میں سو گئی، گہری نیند۔ جب بیدار ہوئی تو شام ہو چکی تھی۔ چار بج رہے تھے۔ ایک عرب مسلمان جوڑا اپنے نوجوان بیٹے کے ساتھ گرجے کی دیوار کے سائے میں نماز پڑھ کر سلام پھیر رہا تھا۔

نیند سے اٹھی تو تازہ دم تھی۔ غسل خانے گئی تو لمبی قطار لگی تھی۔ ایک یورو دے کر رسید لو اور قطار میں لگ جاؤ۔ کئی ملکوں سے آئے ہزارہا مرد و زن انھیں استعمال کر رہے تھے پھر بھی واش روم صاف تھے۔ اطالوی پھر بازی لے گئے۔

مینار پر چڑھنے کے لیے بھی قطار بنی نظر آئی۔ ہمارے پیچھے جنوبی ہند سے تعلق رکھنے والا گھرانا کھڑا تھا۔ ان کا بچہ باپ کے ساتھ جرمن زبان بول رہا تھا۔ باپ کی جرمن غلط سلط تھی مگر دس سالہ بچہ بہت رواں تھا۔ غالباً اس کی پیدائش جرمنی کی تھی اور باپ نے جرمن شاید بالغ ہونے پر سیکھی۔ جیسے ہی بچے نے اپنی ماں کو دیکھا تو پٹ پٹ ساری روداد تامل زبان میں اُسے سنا دی۔ وہ کمال پھرتی سے ایک زبان سے دوسری میں سفر کر رہا تھا۔

زبان اور بدن بولی

زبانوں کا سیکھنا حیرت انگیز عمل ہے۔ بچے بیک وقت کئی زبانیں سیکھ سکتے ہیں، درست تلفظ اور گرائمر کے ساتھ۔ نئی زبان سیکھنے سے دماغ کو تقویت ملتی ہے۔ بچپن میں سیکھی

زبان عموماً نہیں بھولتی۔ مادری زبان وہ ہے جس میں آپ سوچتے ہیں۔ تاہم دیگر زبانوں میں بھی سوچنا ممکن ہے۔

پیسا مینار کی ۱۴۰ سیڑھیاں میں آسانی سے پھلانگ گئی۔ میرا دفتر ساتویں منزل پر تھا اور میں دن میں دو سے تین دفعہ ۱۲۰ سیڑھیاں چڑھتی تھی۔ پھر ہم پچھلے ہفتے انگلینڈ کی سب سے اونچی چوٹی فتح کر کے آئے تھے لہٰذا مینار پر چڑھتے ہوئے تھکن نہ ہوئی۔ البتہ اوپر جا کر موت کی تمنا سے بھی خوف آنے لگا۔ مینار ٹیڑھا تھا اور محسوس ہوتا تھا کہ اب گرا اب گرا۔

مینار سے باہر نکلے تو جدید دور میں پھر چلے آئے۔ خلیل نے آئس کریم کھانی تھی، سو پیدل چلتے چلتے ایک چھوٹی سی دکان پر پہنچے۔ خلیل نے آٹھ ذائقوں کی آئس کریم کھائی جس میں بیک وقت خربوزہ، تربوز، پودینہ، لیموں وغیرہ کے ذائقے شامل تھے۔

ہم پھر ٹیکسی کی تلاش میں سرگرداں چلے۔ شام کا وقت تھا۔ لگا کہ لاہور میں گھوم رہے ہیں۔ حدت جا چکی تھی اور مدہم پڑنے کے بعد ہلکی سی خنکی فرحت بخش تھی۔ وہی دو رویہ سڑکیں، پھولوں بھرے درخت، ڈھلتی چھاؤں اور پھیلتا اندھیرا، بے ترتیب سڑکیں اور وہی صحن اور اونچی دیواروں والے گھر جن پر بوگن ویلیا لٹک رہی تھی۔ واپسی کے سفر میں سرنگوں سے ہوتے، پہاڑ دیکھتے، دیہات سے گزرتے جنیوا پہنچے۔ ہوائی اڈے پر پاکستانی انداز و اطوار رکھنے والے عملے سے پالا پڑا۔

ہر قوم کی پہچان اس کا لباس ہی نہیں بلکہ خاص قسم کی باڈی لینگویج یا ”بدن بولی“ بھی ہوتی ہے جس سے وہ پہچانے جاتے ہیں۔ وہ بولیں یا نہ بولیں یہ پکار پکار کر ان کی شناخت ظاہر کر دیتی ہے۔ پاکستانیوں اور اطالویوں میں یہ بھی خصوصیت مشترک ہے کہ وہ کھلے ڈھلے ہو کر بولتے ہیں۔ سر ہلاتے، جسم کو دائیں بائیں حرکت دیتے رہتے اور ہاتھوں سے اشارے کرتے ہیں۔ انگریز اور جرمن صرف چہرے سے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ انگریز کچھ نہ جانتے ہوں تو مخصوص سا منہ بنا کر سوری کہتے یا آنکھوں سے اشارہ کرتے ہیں۔ ان کی اس عادت کا امریکی بہت مذاق بناتے ہیں۔ مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا۔

میری ملاقات مشی گن میں ایک پاکستانی خاتون سے ہوئی جو بہت رواں اُردو بول رہی تھی لیکن مجھے کچھ کھٹک رہا تھا۔ وہ باتیں کرتے کرتے ہاتھ اور بازو فضا میں بلند کرتی۔ کبھی ہاتھ ملتی، کبھی منہ پر ہاتھ پھیرتی کبھی اسکارف مخصوص انداز میں ٹھیک کرتی۔ اس کی فرشی نشست بھی ہم سے مختلف تھی۔ مجھے وہ کسی عرب بدو خاتون کی یاد دلاتی تھی۔

میں نے پوچھا تو ہنس پڑی اور کہا ”میں ہوں ہی عرب بدو۔ میری نانی دبئی میں پیدا ہوئی تھی اور ماں بھی اور میں بھی لیکن ہم ہیں دراصل پنجابی۔ میری زیادہ عمر دبئی میں بدوؤں اور عربوں کے ساتھ گزری۔“ یوں یہ معمہ حل ہو گیا اور مجھے سکھا گیا کہ انسان کسی علاقے میں طویل عرصہ گزارے، تو وہاں کے انداز و اطوار بھی اختیار کر لیتا ہے لیکن انداز مقامی لوگوں ہی سے سیکھ سکتے ہیں۔ معلوم نہیں لارنس آف عریبیا اس کام میں کتنا ماہر تھا۔ کہتے ہیں عرب بھی دھوکہ کھا جاتے تھے اس کی نشست و برخاست اور زبان سے۔

اٹلی کے سفر سے میری ”ریسرچ“ میں اضافہ ہوا لیکن وہ ابھی جاری ہے۔ مجھے اٹلی کے بار بار دورے کرنے ہی ہوں گے کیونکہ یہ ملک انتہائی خوبصورت اور ثقافت سے رنگا رنگ سجا ملک ہے۔ اگر میں آواگون پر یقین رکھتی تو تمنا کرتی کہ میری دوبارہ پیدائش اٹلی میں ہو۔ کسی گاؤں میں جو ساحل سمندر کے کنارے پہاڑی پر آباد ہو۔ پھولوں سے سجے گھروں کے درمیان سے میں گزرتی، چمکتی دوپہر میں صحن پار کر باورچی خانے میں زیتون کے نان اور پاستا بناؤں اور اپنے محبوب کے انتظار میں اطالوی گانا گاؤں۔ لیکن میں مسلمان ہوں اور یہی میرا آخری جنم ہے۔ ◆◆◆

کیا آپ نے ”پردیس میں دیسی کھانے“ اور وہ بھی بہترین، کھائے ہیں؟ تو آئیے کینیڈا چلیں
صفحہ نمبر ۱۳۳ پر

حیوانی دنیا کی ماہرِ تعمیرات

اِس ننھی مخلوق کی بنائی بستیاں باہمی محبت اور ایثار کی عمدہ مثال ہیں

محمد خلیل چودھری

چیونٹی ایک ننھی سی مخلوق ہے مگر یہ بہت منظم، محنتی اور سمجھ دار ہوتی ہے۔ دنیا میں کوئی بھی جگہ ایسی نہیں جہاں چیونٹیاں نہ پائی جاتی ہوں۔ اب تک چیونٹیوں کی دس ہزار سے زائد اقسام دریافت ہو چکیں۔ ان کی بعض اقسام زہریلی بھی ہیں۔ چیونٹی کی اوسط عمر پینتالیس سے ساٹھ دن تک ہوتی ہے۔

ملکہ چیونٹی کا کام صرف انڈے دینا اور بستی میں چیونٹیوں کی تعداد بڑھانا ہے۔ وہ اس کے علاوہ کوئی کام نہیں کرتی۔ ملکہ چیونٹی جسامت میں عام چیونٹی سے کئی گنا بڑی ہوتی ہے۔ باقی چیونٹیاں ملکہ کی خدمت گار ہوتی ہیں۔ ملکہ کی حفاظت کرنا، خوراک پہنچانا اور اس کے گھر کی صفائی کرنا ان کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ ہر کام کے لیے الگ گروہ ہوتا ہے جو اپنے حصے کا کام ایک لمحے کی تاخیر یا سستی کے بغیر کرتا ہے۔

چیونٹیوں کی بستیاں باہمی محبت اور ایثار کی عمدہ مثال ہیں۔ اگر خوراک کم پڑ جائے تو نوجوان چیونٹیاں اپنے پیٹ سے خوراک نکال کر ننھی چیونٹیوں کو کھلاتی ہیں۔ ایسا اکثر جنگ کے دنوں میں ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس ننھی مخلوق کو شہر بسانے اور اجتماعی نظام قائم کرنے کی بہترین تعلیم دی ہے۔ ہر چیونٹی انجینئر ہوتی ہے۔ مٹی کے گھروں، میدانوں یا جنگلوں میں آپ نے یقیناً بُھر بُھری مٹی کے چھوٹے چھوٹے گھر دیکھے ہوں گے۔ یہ چیونٹیوں کی بستیاں ہیں۔ ایک بستی سینکڑوں سے لے کر کروڑوں چیونٹیوں پر مشتمل ہو سکتی ہے۔

کروڑوں چیونٹیوں پر مشتمل بستی کو ''سپر کالونی'' کہا جاتا ہے۔ ۲۰۰۰ء تک دریافت ہونے والی چیونٹیوں کی کالونیوں میں سب سے بڑی کالونی جاپان کے شہر ایشی کاری کے ساحل پر دیکھی گئی۔

یہ اڑھائی تین مربع کلومیٹر پر پھیلی کالونی تقریباً پینتالیس ہزار گھروں پر مشتمل تھی۔ ۲۰۰۲ء میں ایک حیرت انگیز تحقیق سامنے آئی۔ جنوبی یورپ میں بحیرہ روم کے ساتھ ساتھ چھ ہزار کلومیٹر لمبی ایک سپر کالونی دریافت ہوئی۔ اس دریافت نے

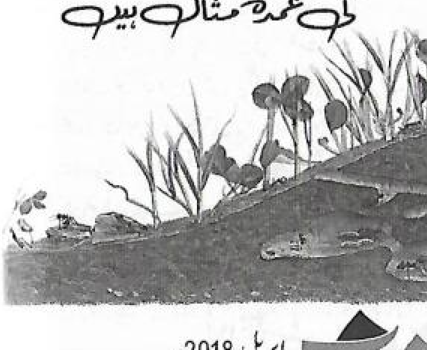

کیڑے مکوڑوں پر تحقیق کرنے والوں کو حیرت زدہ کر دیا۔ دو سال بعد براعظم امریکا کے ملک میکسیکو میں بھی نو سو کلومیٹر لمبی کالونی دریافت ہوئی۔

چیونٹیوں کی ہر بستی کی اپنی الگ خوشبو ہوتی ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ ایک چیونٹی کس بستی سے تعلق رکھتی ہے۔ چنانچہ کوئی اجنبی چیونٹی بستی میں داخل ہو تو پکڑی جاتی ہے۔ محافظ چیونٹیاں فوراً حرکت میں آتی اور باہر کی چیونٹی کا سر قلم کر دیتی ہیں۔

چیونٹیوں کے سب سے بڑے دشمن پرندے ہیں جو جھپٹ کر ایک ہی وار میں کئی چیونٹیاں چٹ کر جاتے ہیں۔ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے لڑاکا چیونٹیاں بستی کے سوراخوں پر لیٹ جاتی ہیں۔ جیسے ہی پرندہ قریب آتا ہے، اس پر خود تیار کیا گیا تیزاب، فارمک ایسڈ پھینکتی ہیں۔ اس تیزاب کے باعث پرندہ بھاگ جاتا ہے۔

جب چیونٹیوں کی ایک بستی کو پتا چلتا ہے کہ قریب کوئی اور بستی یا خوراک کا ذخیرہ موجود ہے تو وہ اس پر قبضے کی تیاری شروع کر دیتی ہیں۔ جیسے ہی دونوں لشکر آمنے سامنے آئیں، جنگ کرنے والی چیونٹیاں فوراً پتا چلا لیتی ہیں کہ کس لشکر کی تعداد زیادہ ہے۔ جس کی تعداد کم ہو وہ پسپائی اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اگر انھیں پتا چلے کہ ان کی طرف ایک سپاہی بھی زیادہ ہے تو اُن کا لشکر حملہ کرنے میں دیر نہیں لگاتا۔

چیونٹیاں اپنے راستے میں آنے والا ہر ندی، نالا، جھیل یا دریا پار کر جاتی ہیں۔ سب چیونٹیاں ایک دوسرے کے پنجے سے پنجہ ملا کر ایک چپاتی کی شکل بنا لیتی ہیں۔ پانی کا سطحی تناؤ انھیں ڈوبنے نہیں دیتا۔ پانی میں اس طرح سے تیرنے کے دوران چیونٹیوں کو دو خطرات کا سامنا ہوتا ہے۔ ایک پانی کی تند و تیز لہریں جن میں ڈوبنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ دوسرے مچھلیاں اور وہ جو انھیں اپنی خوراک بنا سکتی ہیں۔

اس تیرتی چپاتی میں ملکہ چیونٹی سب سے اوپر سوار ہوتی ہے۔ چیونٹیوں کا یہ قافلہ جب بخیریت دوسرے کنارے پر پہنچے تو چیونٹیاں سب سے پہلے ملکہ کو کنارے پر اتارتی ہیں۔ اس کے بعد انڈوں کو حفاظت سے اتارا جاتا ہے۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے چیونٹیاں خشکی پر اترتی ہیں۔ ایسا اکثر براعظم امریکا کے ملک برازیل کے جنگلات میں دیکھا گیا ہے جنھیں ایمزان کے جنگلات کہتے ہیں۔

☆ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''یہاں تک کہ وہ چیونٹیوں کی بستی سے گزرے تو ایک چیونٹی نے کہا کہ اے چیونٹیو! کہیں سلیمان (علیہ السلام) اور ان کا لشکر تم کو کچل نہ ڈالے اور تم کو پتا بھی نہ چلے۔'' (النمل:۱۸)

یہ ایک خطرے کا پیغام تھا جسے ایک چیونٹی نے نشر کیا۔ قرآن پاک ہمیں چودہ سو سال پہلے بتا چکا کہ چیونٹیاں پیغام رسانی کا مکمل نظام رکھتی ہیں۔ یہ نظام کیسے کام کرتا ہے؟ اس بارے میں سائنس دان آج تک تحقیق کر رہے ہیں لیکن کسی واضح نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ ایک اندازہ ہے کہ خوشبو، انٹینے کی حرکت اور جسم کی حرکت سے پیغام منتقل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ چیونٹیوں کی ایک خاص قسم ہر بستی میں پائی جاتی ہے۔ وہ صرف خبریں دینے کا کام کرتی ہے۔

بہت سے پرندے چیونٹیاں پکڑ کر اپنے پروں میں چھپا لیتے ہیں۔ یہ ننھی منی چیونٹیاں ان کے لیے ڈاکٹر کا کام کرتی ہیں۔ پرندے جن جراثیم سے بہت تنگ ہوں، یہ چیونٹیاں انھیں ہلاک کر دیتی ہیں۔ وہ ان پر فارمک ایسڈ کا سپرے کرتی ہیں۔ یہ فارمک ایسڈ پرندوں کے جراثیم مار کر انھیں تکلیف اور خارش سے نجات دلا دیتا ہے۔

ویسے تو پچھلے سو سال سے چیونٹیوں پر تحقیق جاری ہے۔ لیکن حال ہی میں ایک حیرت انگیز بات پتا چلی ہے۔ وہ یہ کہ چیونٹیاں اپنی کالونی میں غیر ضروری پھپھوندی روکنے کے لیے کئی طرح کے اینٹی بائیوٹک بناتی ہیں جن سے انسان میں پائی جانے والی نئی بیماریوں کا علاج ممکن ہو سکے گا۔ ●●●

شاہد احمد دہلوی

اُردو ادب کا چھلاوا

ممتاز مزاح نگار کی دلچسپ و سبق آموز یادیں جنھوں نے "قاضی جی" جیسا یادگار کردار تخلیق کیا تھا

اللہ بخشے شوکت تھانوی ان لوگوں میں سے تھے جو روتوں کو ہنساتے تھے۔ ان کی ہر بات ایک لطیفہ ہوتی۔ عجب زعفرانی شخصیت تھی مرحوم کی۔ چلبلے آدمی تھے، نچلے نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ رگوں میں خون کے بدلے پارہ دوڑتا تھا، ترت پھرت، یہ آئے وہ گئے۔ آدمی کیا تھا چھلاوا تھا۔ بڑی جان تھی مرنے والے میں۔

یقین نہیں آتا کہ وہ ہمیں چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے جا چکا۔ اب بھی وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ بھلا جس میں اتنی زندگی اور زندہ دلی ہو وہ کیسے مر سکتا ہے؟ مگر یقین کرو یا نہ کرو شوکت واقعی مر گیا۔ روتوں کو ہنسانے والا ہنستوں کو روتا چھوڑ گیا۔ میں اس کے حد سے بڑھے ہوئے خلوص کو دیکھ کر کہا کرتا تھا۔

"دیکھ لینا یہ شخص ایک نہ ایک دن ایسا دھوکا دے گا کہ بلبلاتے ہی رہ جاؤ گے۔" دیکھ لیا نا؟ بتیس سال کے تعلقات کا اتنا سا بھی خیال نہیں کیا اور اکیلا ہی سدھار گیا۔ ایسی بھی کیا جلدی تھی؟ ساتھ ہی چلتا۔ ہر کام میں جلدی، زندگی میں بھی جلدی، مرنے میں بھی جلدی۔

شوکت تھانوی کا نام پہلی بار اس وقت سنا جب ادھر کسی نے بتایا کہ "نیرنگ خیال" کے سالنامہ میں ان کا ایک مضمون "سودیشی ریل" پڑھنے کے لائق چھپا ہے۔ رسالہ منگا کر پڑھا، واقعی طبیعت پھڑک گئی۔ اب بھی جب کبھی وہ مضمون یاد آ جاتا ہے، تو ہنسی آ جاتی ہے۔ پیدا بنارس میں ہوئے، پلے بڑھے بھوپال اور لکھنؤ میں۔ اصلی نام تھا محمد عمر، تخلص شوکت اختیار کیا اور اپنے بزرگ بھائی کی دیکھا دیکھی تھانوی کا لاحقہ اس میں ٹانک لیا۔ اسی لاحقے کی وجہ سے پطرس کہا کرتے تھے کہ "اللہ جانے کس تھانہ سے ان کا تعلق ہے؟" بڑوں کی بھول چوک پر پردہ ڈال دینا عین سعادت مندی ہے۔ محمد عمر کو اب کوئی نہیں جانتا شوکت تھانوی کو سب جانتے ہیں۔

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

۱۹۳۲ء کے اوائل میں ایک دن صبح ہی صبح اطلاع ملی کہ دو صاحب ملنے آئے ہیں۔ نام پوچھے تو نہیں بتائے۔ ان کی یہ بداخلاقی طبیعت کو ناگوار گزری۔ میں نے کہا، مردانہ گھر کی بیٹھک میں انھیں بٹھاؤ۔ میں اسی وقت اُٹھا تھا۔ دل میں سوچا کہ انھیں اتنے سویرے آنے اور نام نہ بتانے کی سزا دینی چاہیے۔ چنانچہ منہ ہاتھ دھو کر ناشتا کیا اور آدھ گھنٹے بعد مردانے میں آیا۔ دونوں انتظار میں سوکھ گئے تھے۔ میرے داخل ہوتے ہی سروقد کھڑے ہو گئے۔ یہ دونوں جوان تھے جنھیں دیکھ کر ڈپٹی نذیر احمد کے مرزا ظاہر دار بیگ یاد آ گئے۔ دونوں چھیلا بنے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک جو زیادہ چرباک تھے، ذرا آگے بڑھ کر بولے۔ "ہمیں پہچانیے۔"

میں نے سر سے پاؤں تک انھیں دیکھا: آڑھی مانگ نکلی ہوئی، کسی قدر تنگ پیشانی، گول چہرہ، آنکھوں پر سنہرے فریم کا چشمہ، شریری بے قرار آنکھیں، لبوں پر پان کی سرخی، ترشی ہوئی مونچھیں، ڈاڑھی گھٹی ہوئی، بے شکن اچکن، چست پاجامہ، وارنش کا پمپ شو، داہنے ہاتھ میں پتلی سی چھڑی۔ ان کی تصویر میں دیکھ چکا تھا میں نے کہا "شوکت تھانوی"۔

مسکرا کر بولے۔ "آپ نے ٹھیک پہچانا۔" یہ کہہ کر معانقہ کیا پھر اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کر کے بولے۔ "اور یہ؟"

میں نے انھیں بھی سر سے پیر تک جانچا۔ تقریباً ایک ہی سا حلیہ تھا دونوں کا، سوائے یہ کہ ان کے چہرے پر عینک نہیں تھی۔ میں نے کہا۔ "آپ کے نفس ناطقہ نسیم انہونوی ہو سکتے ہیں۔" شوکت نے کہا "بھئی خوب اندازہ لگایا۔"

نسیم صاحب بھی آگے بڑھ کر گلے ملے۔ ان کا پرچہ "حریم" نکلتا تھا اور "ساقی" کے تبادلہ میں آتا۔ اب شوکت اور نسیم دونوں نے مل کر ایک مزاحیہ اخبار "سرپنچ" (ہفتہ وار) نکالنا شروع کیا تھا۔ نسیم صاحب بھی مضامین لکھتے تھے مگر کوئی مضمون ان کا مشہور نہیں ہوا تھا۔ محنتی آدمی تھے۔ ان کی محنت اور شوکت کی ذہانت نے مل کر بڑا کام کیا۔

جاڑوں کے دن تھے۔ میں نے ان حضرات سے کہا کہ آپ کل صبح ہمارے ساتھ نہاری کھائیے۔ یہ دلّی کی ایک خاص چیز ہے۔ دلّی والے ہی اس کا اہتمام کرتے ہیں مگر اس کے کھانے کا لطف علی الصبح ہے۔ اس لیے آپ حضرات چھ بجے آ جائیے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے اپنے ماموں چشتی صاحب سے کہا کہ کل صبح نہاری کا انتظام کر دیجیے۔ میں خود چونکہ رات کو دیر سے سوتا ہوں اس لیے صبح دیر سے اٹھتا ہوں۔ اس دن الارم لگا کر اٹھا۔

چشتی صاحب نہاری کا دیگچہ اور دوسرے لوازمات لیے چھ بجے سے پہلے پہنچ گئے۔ انگیٹھی دہکائی گئی۔ اس پر گھی کڑکڑایا گیا۔ نہاری پر سے تار اُتار کر الگ کر دیا گیا اور جب گھی میں پیاز سرخ ہو گئی تو پیاز ایک الگ پیالے میں نکال لی اور گھی سے نہاری کو داغ دیا۔ چھ بجے، ساڑھے چھ بجے، سات بجنے لگے۔ چشتی صاحب نے کہا۔ "بھئی تمہارے مہمان نہیں آئے۔"

میں نے کہا۔ "لکھنؤ والے ہیں۔ تکلف میں کہیں رہ گئے۔ بس آتے ہی ہوں گے۔"

لو صاحب، سات بھی بج لیے، ساڑھے سات ہونے کو آئے۔ اس انتظار میں طبیعت بڑی بدمزہ ہوئی۔ جوانی کی ترنگ تھی۔ اس زمانے میں میں ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ جب آٹھ بجے تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے چشتی صاحب سے کہا۔ "ماموں جان یہ سارا سامان زنانہ میں بھیج دیجیے۔"

وہ گھبرا کر بولے۔ "کیوں میاں کیوں؟ تھوڑا سا انتظار اور کر لو۔"

مگر میرا پارہ چڑھ چکا تھا۔ میں نے کہا۔ "اب اگر وہ

قاضی جی

شوکت تھانوی

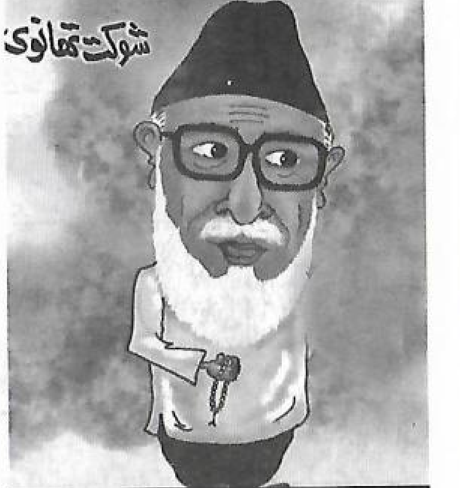

شوکت تھانوی کا مشہور کردار ''قاضی جی''

آئیں گے بھی تو میں نہیں کھلاؤں گا۔''

ماموں جان نے کہا۔ ''یہ بڑی نامناسب بات ہوگی۔''

مگر میں نے سارا سامان اُٹھوا کر اندر بھیج دیا اور خود بھی اندر چلا گیا۔ نو بجے دونوں حضرات تشریف لائے۔ مجھے اطلاع ہوئی کہ مہمان آگئے۔ میں نے بیوی سے کہا: ''چائے اور پان بھیج دینا۔''

انھوں نے پوچھا۔ ''اور نہاری؟''

میں نے کہا۔ ''اب وہ نہاری کہاں رہی، وہ تو باسی قورمہ ہوگیا۔ اسے مت بھیجنا۔''

انھوں نے سر کو حرکت دی جیسے کہہ رہی ہوں۔ ''عجب اوندھی مت کا آدمی ہے۔'' اور باورچی خانہ میں چلی گئیں۔

میں مردانے میں آیا تو شوکت صاحب نے کہا: ''ہمیں کچھ دیر ہوگئی''۔

میں نے کہا ''جی ہاں'' اب چڑیاں کھیت بھی چگ چکیں۔

بولے۔ ''کیا مطلب''؟

''مطلب یہ کہ آپ سے ملانے کے لیے جن احباب کو بلایا، انھوں نے دو گھنٹے تک آپ کا انتظار کیا۔ اس کے بعد کھا پی کر رخصت ہوگئے۔''

''یعنی نہاری ختم''؟

''جی ہاں۔ دلّی کے شرفا سورج نکلنے سے پہلے ہی نہاری کھا چکتے ہیں۔ ویسے بازاروں میں مزدوروں اور کام پیشہ لوگوں کے لیے دن چڑھے تک بکتی رہتی ہے''۔

''یہ تو برا ہوا''۔

''وقت کی پابندی نہ کرنے کا نتیجہ برا ہی ہوتا ہے۔ اب آپ کچھ اور باتیں کیجیے۔ کہیے کل کس کس سے ملے''؟

ہم پھر باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں چائے آگئی۔ شوکت صاحب نے بڑی سنجیدگی سے کہا ''تو کیا واقعی نہاری نہیں ملے گی۔''

میں نے کہا ''نہاری اب آئندہ کسی اور موقع پر۔ اب تو آپ چائے پیجیے اور پان کھائیے۔''

اس واقعے کے بعد شوکت صاحب میری طبیعت سے واقف ہوگئے۔ مجھ سے وہ عمر میں دو تین سال بڑے تھے مگر وہ مجھے ہمیشہ شاہد بھائی ہی کہتے رہے۔ بڑے بڑوں پر فقرے کس جاتے تھے مگر انھوں نے میرے ساتھ کبھی مسخرا پن نہیں کیا۔ مذاق البتہ ہوتا رہتا تھا۔

شوکت تھانوی سے میرے تعلقات بحیثیت ایڈیٹر اور مضمون نگار کے بھی تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ بلا معاوضہ نہیں لکھتے لہٰذا جب کبھی ان سے مضمون لکھوانا ہوتا تو انھیں معاوضہ منی آرڈر سے بھیج دیا جاتا۔ اس زمانے میں معاوضہ

ی کیا ہوتا تھا۔ منشی پریم چند پندرہ روپے فی افسانہ لیتے تھے اور سمجھتے کہ کسی نے پندرہ روپے انھیں دیے ہیں تو ان پر بڑا احسان کیا۔ سو دو سو روپے میں شوکت تھانوی اپنا ناول دینے پر تلے رہتے تھے۔

ایک دفعہ آغا سرخوش کو زبردستی اپنا مسودہ دے کر کچھ روپے لے گئے۔ دہلی کے مشہور ناشر، آغا صاحب نے پوچھا۔ ''اس کا نام کیا ہے''؟

کہا ''جو جی چاہے نام رکھ لو''

آغا صاحب کو شوخی سوجھی۔ کتاب کے ٹائٹل پر ایک گیڈر بنا دیا۔ اس گیڈر کا چہرہ شوکت تھانوی کا بنوایا۔ گیڈر کو پنجرے میں بند دکھایا اور کتاب کا نام رکھا ''مجھے خرید لو''۔ یہ ادب کے عروج اور ادیبوں کی پستی کا وہ زمانہ تھا کہ اچھے خاصے مشہور ادیب اپنے مسودے کے ساتھ دو دو سو روپے بھی دیتے تھے کہ للہ ہماری کتاب اپنے مکتبہ سے چھاپ دو۔

ان کے کسی کام میں استواری نہیں تھی۔ وہ اتنے بڑے آدمی تو تھے نہیں کہ زمانے کو اپنے ساتھ کر لیتے، اس لیے زمانے کے ساتھ ہو جایا کرتے۔ جب دلّی سے آل انڈیا ریڈیو کے پروگرام ہونے لگے تو ایک دفعہ شوکت صاحب کو بھی تقریر کرنے بلایا گیا۔ اسے انھوں نے اپنے لیے بہت بڑا اعزاز سمجھا۔ اس زمانے میں احمد شاہ بخاری (پطرس) اسٹیشن ڈائریکٹر تھے اور ذوالفقار بخاری ڈائریکٹر پروگرام۔

شوکت صاحب دونوں بھائیوں سے مرعوب ہوگئے۔ ایک ایک سے ان کی تعریف کرتے پھرتے تھے۔ لکھنؤ واپس پہنچ کے بعد انھوں نے ایک اردو اخبار میں (جس سے وہ وابستہ تھے) دونوں بھائیوں کا نثری قصیدہ لکھا اور اس کا تراشا انھیں بھیج دیا۔ صلہ میں انھیں دلّی مزید پروگراموں کے لیے بلایا گیا اور جب لکھنؤ میں ریڈیو اسٹیشن کھلا تو انھیں مسودہ نویس کی حیثیت سے رکھ لیا گیا۔

ریڈیو میں انھیں اخبار کے مقابلے میں دگنی بلکہ تگنی تنخواہ مل گئی اور ان کے دلدّر دور ہوگئے۔ اخبار نویسی نے انھیں زود نویس بنا دیا تھا۔ ذہین آدمی تھے، فیچر اور ریڈیو ڈرامے کی تکنیک سمجھ لینے کے بعد انھوں نے لکھ کر مسودوں کے ڈھیر لگا دیے۔ اس کے علاوہ ان کی ایک اور صلاحیت کا بھی انکشاف ہوا کہ ریڈیائی اداکاری اچھی کر سکتے تھے۔

نقالی کا مادہ تو ان میں شروع ہی سے تھا۔ کئی طرح کی آوازیں بنانے پر بھی قادر ہوگئے تھے۔ لکھنے میں انھیں کوئی تکلف نہ ہوتا تھا، قلم برداشتہ لکھتے۔ اچھا لکھتے اور خوش خط تھے۔ میں نے ان کے مسودے دیکھے ہیں۔ ایک لفظ بھی نہیں کاٹتے تھے اور سطر میں موتی کی لڑیاں دکھائی دیتی تھیں۔ لکھنو سے انھوں نے اپنا ایک ہفتہ وار فیچر ''منشی جی'' شروع کیا جس میں کسی معاشرتی خرابی یا وقت کے کسی اہم موضوع پر بڑی دلچسپ بحث ہوتی۔ کئی سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا اور نہایت کامیابی کے ساتھ۔ جب پاکستان بن گیا تو ''منشی جی'' نے ''قاضی جی'' کا روپ دھار لیا۔

یہ فیچر لاہور سے شروع ہوا۔ پھر شوکت صاحب کراچی آ گئے تو یہاں سے نشر ہونے لگا۔ اس ہفتہ وار فیچر کے روحِ رواں قاضی جی تھے جن کا پارٹ خود شوکت صاحب ادا کرتے۔ مدتوں تک اکثر سننے والوں کو معلوم نہیں ہوا کہ قاضی جی کی صداکاری کون کر رہا ہے۔ قاضی جی ایک کھوسٹ بڑے میاں تھے جو احمقوں کی جنت میں رہتے تھے مگر ہر معاملے میں اپنی رائے ضرور دیتے۔ ان کے پوپلے منہ سے جو باتیں نکلتی تھیں، بھولی بھالی اور مضحکہ خیز ہوتیں۔ شوکت صاحب کو قاضی جی کی آواز بنانے میں کمال حاصل تھا۔ ثبوت یہ ہے کہ اس کے نقال پیدا ہوگئے تھے۔ محفلوں میں جو مسخرے نقلیں پیش کرتے تھے، وہ قاضی جی کی نقلیں بھی بنانے اور سنانے لگے۔ شوکت صاحب نے منشی جی اور قاضی جی کے سینکڑوں

مسودے لکھے۔ میں نے بھی ان کے بیسیوں براڈ کاسٹ سنے۔ ان میں سے ایک کو بھی بھرتی کا فیچر نہیں پایا۔ سب میں ایک ہی جیسی شگفتگی اور تازگی پائی۔

یہی کیفیت ان کی کالم نویسی کی تھی۔ مجید لاہوری کے انتقال کے بعد شوکت صاحب اخبار ”جنگ“ سے وابستہ ہو گئے تھے۔ وہاں انھیں روزانہ ایک مزاحیہ ”کالم وغیرہ وغیرہ“ لکھنا ہوتا اور ہفتہ میں دو ایک اداریے بھی۔ نواب سعادت علی خاں نے انشاء اللہ خاں سے فرمائش کی تھی کہ دو لطیفے روز سنا دیا کرو۔ چند روز میں انشاء کا یہ عالم ہو گیا کہ ایک ایک سے کہتے ”کوئی نقل، کوئی چٹکلا یاد ہو تو بتاؤ۔ میں نمک مرچ لگا کر نواب کو خوش کر لوں گا۔“

شوکت کا شگفتہ رقم قلم روزانہ چلتا ظرافت کے پھول کھلاتا رہا۔ پنڈی جانے کے بعد پورے اخبار کی ذمہ داری بھی ان پر عائد ہو گئی تھی مگر وہ ”پہاڑ تلے“ کے عنوان سے کالم برابر لکھتے رہے۔ اداریہ کے علاوہ بھی کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے۔ مثلاً انھوں نے آپ بیتی لکھنی شروع کر دی تھی۔ افسوس کہ اس کی چند قسطیں ہی چھپنے پائی تھیں کہ وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

”یک در گیر و محکم گیر“ کے شوکت صاحب قائل نہیں تھے، جس کام میں پیسہ زیادہ ملتا یا دکھائی دیتا اسی کو اختیار کر لیتے۔ کالم نویسی سے ان کی عملی زندگی کا آغاز ہوا۔ وہاں سے ریڈیو میں آئے۔ ریڈیو چھوڑ کر پچھلی بڑی جنگ کے زمانے میں سانگ پبلسٹی کے محکمے میں چلے گئے۔ وہ محکمہ ختم ہوا تو پنچولی فلم کمپنی میں آ گئے۔ وہ بند ہوئی تو پھر ریڈیو میں آ گئے۔ پھر ”جنگ“ اخبار میں چلے گئے۔

پیسا انھوں نے خوب کمایا۔ مضامین، کتابوں، ریڈیو، اخباروں اور مشاعروں سے، مگر کبھی انھیں خرچ کرتے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ اپنے آپ کو تنگ دست ظاہر کرتے۔ پانوں کی ڈبیا تو وہ ضرور اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ

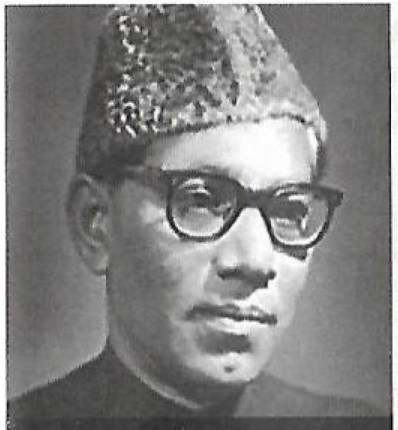

شاہد احمد دہلوی

سگریٹ تک نہ پیتے۔ سینما، تھیٹر، کلب، سیر سپاٹا، دعوتیں، ہوٹل بازی یا کوئی اور بازی، کچھ نہیں البتہ بڑے آدمیوں کے ساتھ لگے رہنے کا شوق تھا اور انہی کے ساتھ ان کے شوق پورے ہو جاتے۔

باتوں کے طوطا مینا بنانا یوں تو سبھی یوپی والوں کا شیوہ ہے مگر شوکت صاحب کو اس میں کمال حاصل تھا۔ انھوں نے اپنی اسی صلاحیت کے بل بوتے پر بڑے بڑے جنوں کو شیشے میں اُتار رکھا تھا اور ان سے کماحقہ فائدہ اٹھاتے۔ میں ان سے کہا کرتا تھا کہ تم بے ہڈی کے آدمی ہو۔ اپنے سے زبردست کے سامنے جاتے ہو تو سوائے جی ہاں جی ہاں کرنے کے اور کچھ کر نہیں سکتے۔ وہ کہتے تھے۔ ”نہیں، یہ بات تو نہیں ہے۔“

ایک دفعہ میں شوکت تھانوی کے پاس ریڈیو اسٹیشن پر بیٹھا ہوا تھا۔ باتیں کرتے کرتے شوکت صاحب ایک دم سے کھڑے ہو گئے اور بولے ”ایک لطیفہ یاد آ گیا، ذرا ناظمی صاحب (اسٹیشن ڈائریکٹر) کو سنا آؤں۔“ وہ لطیفہ سنانے چل دیے۔

میں نے ان کے دوست سے کہا۔ ”اس نے تو خوشامد

کرنے کی حد ہی نہیں رکھی۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی“؟

انھوں نے کہا۔ ”بھیا، یہاں اسی طرح کام چلتا ہے۔ یہ پول سٹنگ ہے۔“

”یعنی“؟

”ارے بھئی بٹرنگ۔“

بٹرنگ یعنی مکھن بازی کرنا۔ یہ سارے محاورے اسی زمانے میں وضع ہوئے تھے۔ ایک صاحب نے اسی زمانے میں کہا تھا ”آج بازار میں مکھن ہی غائب ہے۔“

”کیوں؟ کیا مکھن بھی چور بازار میں چلا گیا“؟

”نہیں، فلاں صاحب نے فلاں افسر کے لگا دیا سارا۔“

ایسی باتوں پر ہنسی آتی تھی جی بھی جلتا تھا۔ مگر یہ عام دستور تھا اور شوکت صاحب کے متعلق کہا جاتا تھا کہ انھوں نے اس کی تکنیک کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا بلکہ اس کے ایکسپرٹ ہو گئے تھے۔ جب عام مقولہ یہ ہو کہ سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے اللہ راضی ہے تو پھر کسی ایک کو ہدف ملامت کیوں بنایا جائے؟ ایسا ہی خودی اور خودداری کا اگر خیال ہے تو اپنے گھر بیٹھو یا دنیا چھوڑ دو۔

یہ آخر تک معلوم نہ ہو سکا کہ وہ اپنی کمائی خرچ کہاں کرتے تھے۔ صرف دو مدیں ایسی دکھائی دیں جن میں انھیں ضرور اپنی گرہ ڈھیلی کرنی پڑتی تھی: ایک پان اور دوسرے لباس۔ پان وہ کھاتے تو کم، کھلاتے زیادہ تھے۔ انھوں نے ایک بڑی ڈبیا کتاب کی شکل بنوائی تھی جس میں پان کا پورا لوازمہ ہوتا۔ یہ ڈبیا تقریب بہر ملاقات بطور بہت کامیاب تھی۔ جو اس سے بچ نکلتا اس پر بٹوے سے وار کیا جاتا۔ اس میں چھالیا، الائچی، لونگ، جاوتری، منتھال کی ننھی سی شیشی، سب کچھ ہوتا۔ کہاں تک کوئی بچتا، مارا ہی کھا جاتا۔ اس پر غضب ان کی سخن سازی۔ نووارد رام ہو کر ان کا کلمہ پڑھنے لگتا۔

شوکت صاحب بڑے فقرے باز تھے۔ ایک دفعہ ریڈیو اسٹیشن لاہور پر اپنے چپراسی کو آواز دی۔ وہ آیا تو اس کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کہنے لگے۔ ”آپ کو دیکھیے، نیوی کٹ سگریٹ پر آپ کی تصویر ہے“ اور واقعی اس غریب کی عین مین وہی شکل تھی جو نیوی کٹ کی ڈبیا پر ہوتی تھی۔ پھر اس سے کہا۔ ”جائیے، جا کر چائے لائیے۔“

اس کے چند روز بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ میں ان کے کمرے میں داخل ہوا تو سلام کے بعد شوکت صاحب نے پہلی بات یہ کہی۔ ”یہ جو بیٹھے ہوئے ہیں، میرے صاحبزادے ہیں۔“

اور ان صاحب سے کہا۔ ”انھیں تم جانتے ہی ہو گے، شاہد احمد دہلوی ہیں۔“ انھوں نے اٹھ کر سلام کیا۔ میں ”وعلیکم السلام“ کہہ کر بیٹھ گیا۔

وہ صاحب ”اچھا، میں چلتا ہوں“ کہہ کر چلے گئے تو میں نے ہنس کر کہا۔ ”جس بھلے آدمی کو دیکھتے ہو کسی کو اپنا بیٹا اور کسی کو اپنا باپ بنا لیتے ہو۔ تمھیں شرم نہیں آتی“؟

بڑی سنجیدگی سے بولے۔ ”نہیں یہ واقعی میرا بڑا لڑکا تھا۔ پی اے ایف“ میں نوکر ہے۔ مجھے پھر بھی یقین نہیں آیا۔

اتنے میں عشرت رحمانی آ گئے۔ میں نے ان سے پوچھا ”ان کا کوئی لڑکا ان سے بھی بڑا ہے“؟

انھوں نے کہا۔ ”قد میں بڑا ہے۔ آپ ان کی عمر کیا سمجھتے ہیں؟ یہ مجھ سے، آپ سے بڑے ہیں۔ یہ حضرت پچاس سے اُوپر ہیں۔ تیس بتیس کا تو لڑکا ہی ہے۔“

اس وقت شوکت صاحب کی صحت اتنی اچھی تھی کہ چالیس سے زیادہ کے نظر نہ آتے۔ بال خوب گھنے اور کالے تھے۔ سفید بال نہ تو سر میں تھے نہ مونچھوں میں۔ چہرے پر کوئی جھری نہیں تھی اور نہ آنکھوں کے کونوں میں ”کوے کے پاؤں۔“

دس بارہ سال بعد یعنی ۱۹۶۱ء میں بالکل ایسے ہی تھے۔ عمر کے ساتھ مزاج میں بردباری اور سنجیدگی آجایا کرتی ہے مگر شوکت صاحب کی بات چیت کا انداز بالکل نہیں بدلا تھا۔ جوانی کا وہی چلبلا پن قائم تھا، بلکہ مسخرا پن کچھ بڑھ ہی گیا۔ مارچ ۱۹۶۱ء کے آخر میں پاکستان سے بھارت جو خیر سگالی کا ثقافتی وفد گیا اس میں لاہور سے امرتسر اور امرتسر سے دلّی تک ذوالفقار بخاری، سید محمد جعفری، شوکت تھانوی اور میں، ہم چاروں ایک ہی ڈبے میں تھے۔ بالعموم بخاری صاحب اپنی بذلہ سنجی اور چرب زبانی سے سب کو دبالیا کرتے ہیں مگر اس سفر میں شوکت تھانوی نے سب کا ناطقہ بند کر دیا۔

پان خرچ کے علاوہ شوکت صاحب اپنے لباس پر بھی روپیہ صرف کرنے پر مجبور تھے وہ روزانہ ایک جوڑا بدلتے اور ٹیپ ٹاپ سے رہتے۔ بعد میں سوٹ بھی سلوا لیے تھے۔ وہ اس راز کو اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ آدمی کی عزت اس کے کپڑوں سے ہوتی ہے۔ بڑھیا لباس والا خواہ مخواہ معزز سمجھا جاتا ہے۔ مجھے اس کا بڑا تلخ تجربہ ہو چکا۔

ایک دفعہ میرے پرانے ہم جماعت اور بے تکلف دوست ممتاز حسن صاحب نے مجھے کہلوا بھیجا کہ کسی دن شام کو ۵ بجے میرے دفتر آجاؤ، ضروری باتیں کرنی ہیں۔ ممتاز صاحب اس وقت وفاقی سیکرٹری فنانس تھے۔ میں سیدھے سبھاؤ ان کے دفتر وقت مقررہ پر پہنچ گیا۔ ان کا چپراسی مرغ زریں بنا باہر کھڑا تھا۔ میں نے پرچے پر اپنا نام لکھ کر اسے دیا کہ صاحب کو دے آئے۔ اس نے بڑی بے مہری سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''بنچ پر بیٹھ جاؤ۔ صاحب کام کر رہے ہیں۔''

میں بیٹھ گیا۔ وہ بھی تھوڑی دیر بعد مجھ سے ذرا ہٹ کر اسی بنچ پر آبیٹھا۔ دس منٹ گزر گئے۔ اس نے مجھ سے بات کرنا بھی گوارا نہ کیا۔ میں نے کہا۔ ''آپ جا کر میرا پرچہ تو دے آیئے۔ مناسب سمجھیں گے تو بلا لیں گے''۔

بولا۔ ''اندر کسی بڑے افسر کے ساتھ ضروری کام کر رہے ہیں۔ ابھی ٹھہر جاؤ''۔

ہم ٹھہرے رہے۔ جب پھر کچھ وقت گزار لیا تو میں نے کہا۔ ''صاحب نے مجھے بلایا ہے، میں اپنے کسی ذاتی کام سے نہیں آیا۔ آپ اطلاع تو کر دیجیے۔''

وہ میری چٹ لے کر اندر چلا گیا اور وہاں سے چائے کے خالی برتن لے کر باہر نکلا۔ میری چٹ اس کے ہاتھ ہی میں تھی۔ برتن لیے چلا گیا مجھ سے کچھ نہ بولا۔ جب واپس آیا تو آ کر خاموشی سے بنچ پر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔ ''چٹ نہیں دی''؟

اس نے ''نہیں'' کہہ کر منہ پھیر لیا۔ میں جھلستا رہا۔ پون گھنٹے بعد جب ممتاز صاحب اپنے معزز مہمان کو رخصت کرنے دروازے پر آئے تو اچانک ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ چونک کر بولے۔ ''ارے! آپ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں''؟ میں نے کہا۔

''جی ہاں پون گھنٹے سے اور آئندہ آپ مجھے کبھی اپنے دفتر نہ بلائیں، میں آنے والے پر لعنت بھیجتا ہوں۔''

وہ آیئے آیئے کہہ کر گلے میں ہاتھ ڈال کر مجھے اپنے ساتھ کمرے میں لے گئے۔ بولے۔ ''آپ اندر کیوں نہ آ گئے''؟

میں نے کہا۔ ''وہ جو باہر ایک جانور کھڑا ہے، اسے میں نے چٹ دے دی تھی مگر اس نے اندر نہیں پہنچائی۔ کیا آپ کے ہاں بھی اندر اطلاع پہنچانے کے دس پانچ روپے دیے جاتے ہیں''؟

ہنس کر کہنے لگے ''نہیں، ایسا تو نہیں ہوتا۔'' پھر میرے بگڑے تیور دیکھ کر بولے۔ ''آپ چائے پئیں گے؟ کچھ کھائیں گے''؟ اور بغیر میرے جواب کا انتظار کیے گھنٹی بجا کر اپنے مرغِ زریں کو بلایا اور کہا۔ ''چائے لاؤ۔''

پھر خود ہی کہنے لگے۔ ''بھائی کیا پوچھتے ہو ان چپراسیوں کی حالت، بس کچھ کہنے کا مقام نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''جناب اس کی گرم شیروانی میری شیروانی سے دگنی قیمت کی ہے۔ میرے پاؤں میں چھ روپے کی جوتی ہے، وہ تیس روپے کا شو پہنے ہوئے ہے۔ بھلا وہ مجھے کیوں خاطر میں لاتا۔ سمجھا ہوگا کہ کوئی غرض مند مہاجر، صاحب سے کچھ مانگنے آیا ہوگا۔''

ممتاز صاحب شرمندہ ہو کر بولے ''نہیں بھائی نہیں، تم مجھے معاف کر دو۔''

شوکت صاحب ہمیشہ دیسی یا ولایتی عمدہ لباس پہنا کرتے ورنہ انھیں بھی ایسے ہی حادثات سے دوچار ہونا پڑتا۔ مثل مشہور ہے ''الناس باللباس''۔ یہ کوئی آج کا دستور نہیں قدامت سے یہی چلا آیا ہے۔

شیخ سعدیؒ کو دعوت میں داخل ہونے سے دربان نے روک دیا تھا۔ جب وہ جبہ قبہ پہن کر آئے تو عزت و تکریم کے ساتھ انھیں اندر پہنچایا گیا۔ جب کھانا سامنے آیا تو حضرت شیخ نے شوربے میں اپنی آستین ڈالتے ہوئے فرمایا ''اسی نے تو مجھے کھانے تک پہنچایا ہے۔'' سچ ہے لوگ ظاہر کو دیکھتے ہیں، باطن کو نہیں۔ لہٰذا مرزا ظاہر دار بیگ بننے میں ہی عزت ہے۔

شوکت صاحب میں ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ شاعروں کے ساتھ اور اُونچی سوسائٹی میں رہنے کے باوجود شراب نہیں پیتے تھے۔ آئے دن غیر ملکی سفارت خانوں میں کاک ٹیل پارٹیاں ہوتی رہتی تھیں۔ بلکہ ہمارے ''بڑے آدمیوں'' نے بھی اسے اپنی شان امارت میں داخل کر لیا۔ جب ان کے ہاں ''معزز مہمان'' آرہے ہوں تو ایک ''بار'' کا بھی اپنے ہاں اہتمام کر لیں۔ مفت کی تو قاضی کو بھی حلال ہے مگر ان ''قاضی جی'' نے اسے ہمیشہ حرام ہی سمجھا۔ ورنہ ایسے موقعوں پر میں نے ایسے ایسے ثقہ لوگوں کو چسکی لگاتے دیکھا ہے کہ بس دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔

شوکت صاحب خواتین سے ملنے میں بڑی احتیاط ملحوظ رکھتے۔ یہ نہیں کہ ہمارے بعض شاعروں کی طرح جس عورت سے بھی تعارف ہوا، چھوٹتے ہی سمجھ لیا کہ پہلی ہی نظر میں وہ ان پر عاشق ہو گئی اور لگے اس کی فرضی داستانیں سنانے۔ شاید اس وضع احتیاط کی وجہ یہ ہو کہ شوکت صاحب کی شادی نوجوانی ہی میں ہو گئی تھی۔ وہ ایک طرح دار جوان تھے۔ اگر بگڑنا چاہتے تو خوب پیٹ بھر کر بگڑتے، مگر اللہ نے انھیں اس خرابی سے محفوظ رکھا۔ ◆◆◆

''حیرت انگیز معلومات''

آپ نے مشاہدہ کیا ہوگا کہ جب چیونٹی بہت بلندی سے بھی زمین پر گرے تو فوراً سیدھی ہو کر چلنا شروع کر دیتی ہے۔ نہ تو اسے چوٹ لگتی ہے اور نہ ہی زخمی ہوتی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس کا وزن بہت کم ہوتا ہے۔ دوسرے اس کا جسم گرتے وقت پیرا شوٹ نما بن جاتا ہے جس سے یہ آسانی سے زمین پر گر پڑتی ہے۔

☆ چیونٹی اپنے وزن سے بیس گنا زیادہ وزن اٹھا سکتی ہے۔

☆ چیونٹی کے کان نہیں ہوتے، یہ سونگھ کر اور اپنے جسم کی مختلف حرکتوں سے دوسری چیونٹیوں تک اپنا پیغام پہنچاتی ہے۔

☆ چیونٹی کے پیٹ میں دو معدے ہوتے ہیں۔

☆ بڑی چیونٹیاں کوئی چیز نہیں کھا سکتیں بلکہ وہ چیزوں کا رس پی کر خشک خوراک پھینک دیتی ہیں۔

اُردو ڈائجسٹ کے سالانہ خریدار بن کر

560 روپے
کی غیر معمولی بچت پائیے
اس قیمت میں خصوصی نمبر
بھی حاصل کیجیے

0300-4005579
urdudigest.pk
www.urdudigest.pk
subscription@urdudigest.pk

اُردو سے محبت کریں......اُردو ڈائجسٹ پڑھیں

اُردو کے ہمہ رنگ، باوقار ڈائجسٹ کو اپنا دوست بناتے ہوئے

معلومات کی ایک نئی دنیا سے اپنے دامن کو بھریئے

دِلچسپ انٹرویوز، کہانیوں اور شگفتہ ادبی تحریروں سے اپنی زندگی کو پُرلطف بنائیے

قیمت فی پرچہ -/100روپے	12 شماروں کی قیمت	سالانہ رجسٹرڈ ڈاک خرچ	کل رقم سالانہ	سالانہ بدل اشتراک	بچت
سالانہ خریداری	1200 روپے	360روپے	1560روپے	1000روپے	560 روپے

سالانہ خریداری فارم

نام -- فون نمبر --

پتا -- ای میل --

میں ماہ------20ء سے اُردو ڈائجسٹ کا سالانہ خریدار بننا چاہتا ہوں۔ مجھے اُردو ڈائجسٹ ارسال کر دیجیے۔

1۔ بذریعہ وی پی میں سالانہ قیمت پوسٹ مین کو ادا کر دوں گا۔ یا

2۔ میں مطلوبہ رقم --------------- روپے کا بینک ڈرافٹ / منی آرڈر ارسال کر رہا ہوں۔ یا

3۔ میں نے -------- روپے اُردو ڈائجسٹ کے اکاؤنٹ نمبر **IBAN#-Pk18 BPUN 6010 0527 0140 0011** بینک آف پنجاب سمن آباد میں آن لائن جمع کروا دیے ہیں۔ یا

4۔ ہماری ویب سائٹ پر جا کر سبسکرپشن فارم پُر کریں اور ہمیں ای میل کر دیں۔ یا

5۔ سالانہ خریداری کے لیے اس نمبر پر رابطہ کریں **0333-4713631**۔

تاریخ ------------------------ دستخط ------------------------

اُردو ڈائجسٹ۔ سرکولیشن منیجر۔ 325,G-III جوہر ٹاؤن لاہور پاکستان
فون نمبر: +92-42-35290734-8,+92-42-35290707

شاکر لطیف

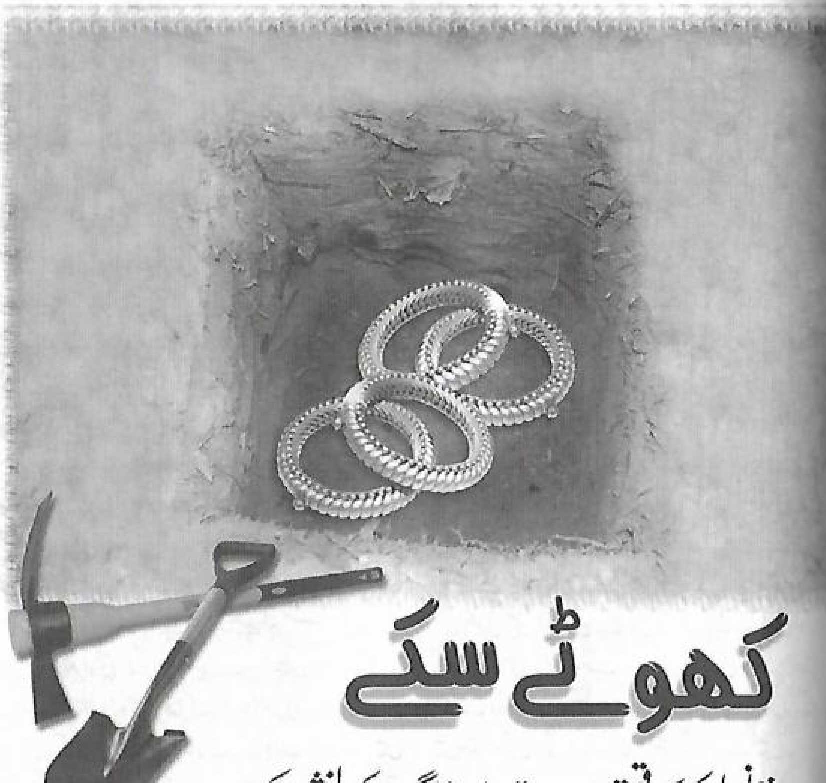

کھوٹے سکّے

نئی نسل کو ایک قیمتی درس دیتی پرانے لوگوں کی دلنشیں کتھا

میں تو کہتی ہوں کہ اپنی والدہ کو کسی اولڈ ہاؤس میں داخل کرا دو۔ مجھ سے نہیں ہوتی اب ان کی دیکھ بھال۔‘‘

زبیدہ بیگم اپنے کمرے میں لیٹیں بہو رخسانہ کے بولنے کی آواز با آسانی سن رہی تھیں۔

’’آہستہ بولو... امی جان سن لیں گی۔‘‘ انھیں اپنے بیٹے باسط کی آواز سنائی دی۔

’’سن لیں، مجھے کوئی پروا نہیں۔‘‘ رخسانہ کی جلی کٹی آواز سنائی دی۔ ’’ہمارے گھر کے حالات پہلے ہی خراب ہو رہے ہیں۔ پھر آپ نے ماہ نور کو اتنے بڑے اور مہنگے سکول میں داخل کروا رکھا ہے۔ اُوپر سے آپ کی ماں کی دوائیوں کا ماہانہ خرچ۔ اس طرح گھر کب تک چلے گا؟! اپنے کاروبار کا حال تو آپ خود بھی جانتے ہی ہیں۔‘‘

"میں جیسے تیسے کر کے گھر کے اخراجات پورے کر رہا ہوں پھر تمھیں کیا مسئلہ ہے جو ہر بات پر لڑنا شروع کر دیتی ہو۔" باسط کی بھنائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"بہر حال میں نے کہہ دیا ہے کہ اپنی ماں کا کوئی بندوبست کرلیں۔" رخسانہ کا لہجہ دوٹوک تھا۔ "میں اب اُن کی مزید دیکھ بھال نہیں کرسکتی۔"

"وہ تمہاری ساس ہونے کے ساتھ ساتھ اس گھر کی بزرگ بھی ہیں۔ ان کی دُعاؤں کی بدولت ہی ہمارا یہ خاندان قائم و دائم ہے۔ تمھیں اُن کی عزت کرنی چاہیے۔ باسط نے بیوی کو سمجھانے کی کوشش کی۔"

"اُن کا کوئی ایک فائدہ ہو تو بتاؤ۔" رخسانہ کی آواز پہلے سے بھی اُونچی ہوگئی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اُن کی حیثیت اب ایسے کھوٹے سکے کی سی ہے جو ہمارے کسی کام کا نہیں۔ پھر میں یہ تو نہیں کہہ رہی کہ آپ انھیں گھر سے نکال دیں۔ میں تو صرف اتنا چاہتی ہوں کہ اُنھیں بوڑھوں کے کسی ادارے میں داخل کروا دیں۔ وہاں اُن کی دیکھ بھال بھی زیادہ اچھے طریقے سے ہوسکے گی۔"

اپنے لیے کھوٹے سکے کا خطاب سُن کر زبیدہ بیگم کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو تیرنے لگے۔ ذہن ماضی کے دھندلکوں میں کہیں کھوسا گیا۔

زبیدہ بیگم کا خاندان ہندوستان کا رہنے والا تھا۔ پاکستان معرض وجود میں آیا تو ہندوستان میں فسادات پھوٹ پڑے۔ کسی مسلمان کی جان و مال آبرو محفوظ نہ رہی۔ زبیدہ بیگم کے شوہر جمشید خان نے اپنے دیگر رشتے داروں کے ہمراہ پاکستان ہجرت کا فیصلہ کیا۔ زبیدہ بیگم اپنے شوہر، میکے اور سسرالی رشتے داروں کے ہمراہ نئی زندگی کی اُمید لیے پاکستان روانہ ہوئیں۔ اُس وقت تک اندازہ نہیں تھا کہ یہ سفر کانٹوں پر طے ہوگا۔

اُن کے خاندان کا شمار بھارت کے نواب خاندانوں میں ہوتا تھا مگر پاکستان آتے وقت سب کچھ وہیں رہ گیا۔ جو قیمتی سامان ساتھ تھا، وہ بھی سکھوں نے لوٹ لیا۔ حتیٰ کہ سربراہ شوہر بھی لڑتے ہوئے شہید ہوگئے۔ غنیمت تھا کہ زبیدہ بیگم پڑھی لکھی خاتون تھیں ورنہ شاید مشکلات میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ انھوں نے ایک سرکاری سکول میں ملازمت کر لی اور اپنے بیٹے کی محبت میں سارے غم بھلا دیے۔ انھوں نے باسط کو پالا پوسا، اعلیٰ تعلیم دلوائی اور پھر بڑے مان سے شادی بھی کردی۔

بہو گھر میں آئی تو انھیں لگا کہ اب اُن کے آرام کرنے کے دن شروع ہو گئے مگر اس نے تو اُن کی بے آرامی میں اضافہ کر دیا۔ رخسانہ کو بات بے بات جھگڑا کرنے کی عادت تھی۔ وہ منہ پھٹ اور بدزبان واقع ہوئی تھی۔ جھگڑتے وقت اس بات کا بھی لحاظ نہ کرتی کہ زبیدہ بیگم رشتے میں ساس تھیں۔ بس جو منہ میں آتا بولے چلی جاتی۔

زبیدہ بیگم اپنی بہو کے اس ناروا سلوک پر دل ہی دل میں خاصی غمزدہ رہنے لگیں۔ انھیں سب سے زیادہ رنج اپنے بیٹے پر تھا جو جان بوجھ کر انجان بنا رہتا۔ کبھی کبھی بیوی کو دبے لفظوں میں سمجھانے کی کوشش کرتا مگر پھر رخسانہ کا کوئی سخت جواب اُسے خاموش ہونے پر مجبور کر دیتا۔ اُس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ بیوی کو سخت لہجے میں تنبیہہ ہی کر دیتا۔

جب اُن کی پوتی ماہ نور کی پیدائش ہوئی تو انھیں لگا کہ انھیں زندہ رہنے کی وجہ مل گئی۔ وہ ہر وقت اپنی پوتی کو گود میں اٹھائے رہتیں۔ اس بات پر رخسانہ کو بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ اُسے تو بچی کی دیکھ بھال کے لیے مفت کی آیا مل گئی تھی۔ زبیدہ بیگم نے اُن دنوں اپنی سرکاری نوکری سے بھی استعفا دے دیا۔ اب اُن کا زیادہ تر وقت اپنے گھر پر ہی گزرتا۔ وقت بیتنے لگا اور ماہ نور چودہ برس کی ہوگئی۔ وہ باسط اور رخسانہ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اُن کے ہاں ماہ نور کے بعد کوئی اور اولاد نہ ہوسکی۔ اس لیے وہ سب کی بے حد لاڈلی تھی۔ بڑھاپا اکثر تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے۔ زبیدہ بیگم بھی جوڑوں کے درد میں مبتلا ہوئیں اور زیادہ تر وقت بستر پر گزارنے لگیں۔

ماہ نور طبیعت اور مزاج میں اپنی ماں کے بالکل برعکس تھی۔ وہ اپنی دادی سے بہت پیار کرتی اور اُن کا بے حد خیال بھی رکھتی۔ روزانہ اسکول جانے سے پہلے دادی کو ناشتا کروا کر جاتی اور واپسی پر اُس وقت تک دوپہر کا کھانا نہ کھاتی جب تک دادی کو نہ کھلا لیتی۔ ماہ نور سمجھتی تھی کہ اس گھر میں سب سے زیادہ دیکھ بھال کی ضرورت اس کی دادی کو ہی ہے۔ وہ جوڑوں کے درد کی وجہ سے چل بھی نہ پاتیں۔

وہ بہت حساس اور زود رنج طبیعت کی مالک تھی، اس لیے زبیدہ بیگم کی حالت دیکھ کر آبدیدہ ہو جاتی۔ اُسے گھر میں دادی کے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک کا بہت دکھ تھا۔ جب اُس کی ماں زبیدہ بیگم کو اکثر اوقات کھوٹے سکے کے خطاب سے نوازتی تو اُس کے اندر شدتِ غم سے تلاطم سا برپا ہو جاتا۔ تاہم وہ ایک باادب بچی تھی اس لیے اپنی ماں کے آگے بول نہ پاتی۔ اُسے اپنے والد پر بھی بہت افسوس ہوتا۔ اُن کی خاطر زبیدہ بیگم نے دوسری شادی تک نہ کی تھی۔ نہ جانے کس قدر مشکلات و مصائب برداشت کیے مگر وہ اب بیوی کے ڈر سے ماں کے کمرے کا رخ کرنا بھی بھول گئے تھے۔ بس ہفتے میں ایک آدھ بار اُن کے کمرے میں آتے اور رسمی طور پر پوچھ لیتے کہ انھیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔

ماہ نور اکثر اوقات دادی سے ہندوستان سے پاکستان ہجرت کی سبق آموز داستان سنتی۔ وہ ان کی باتوں میں کھوسی جاتی۔ ایک بار اس نے پوچھا:

دادی آپ کا خاندان ہندوستان میں بہت امیر تھا۔ آپ کی شادی بھی امیر خاندان میں ہوئی۔ شادی کے دن دادا جان نے آپ کو سونے کے چار کڑے بھی تحفے کے طور پر دیے تھے۔ وہ کہاں گئے؟"

زبیدہ بیگم اس کا سوال سُن کر مسکرائیں اور بولیں "ہاں، وہ بہت وزنی کڑے تھے۔ ایک کڑا تقریباً ڈیڑھ دو پاؤ کا تھا۔ میرے لیے تو انھیں پہننا بھی مشکل تھا۔ اب تو اس طرح کے کڑے تیار ہی نہیں ہوتے۔ ہجرت کے وقت وہ کڑے میرے پاس ہی تھے مگر جب سکھوں نے حملہ کیا تو کہیں کھو گئے۔"

زبیدہ بیگم کے رشتے دار کبھی کبھی جب اُن سے ملنے آتے تب بھی کڑوں کا ذکر ضرور ہوتا۔ زبیدہ بیگم سب کو بڑے فخریہ لہجے میں بتاتیں کہ اُن کے مرحوم سُسر نے شادی پر کس قدر مہنگا تحفہ دیا تھا۔ وہ اُن کڑوں کے کھو جانے پر افسوس اور غم کا اظہار کیا کرتیں کہ تحفہ سنبھال کے نہ رکھ پائی۔ ایسے میں اُن کے رشتے دار اُنھیں تسلی دیتے کہ جو شے کھو گئی اس پر غم نہ کریں۔ جان بچ گئی اور ایک علیحدہ وطن مل گیا، کیا یہ کم ہے؟

زبیدہ بیگم جواباً بس مسکرا کر رہ جاتیں۔ اُن کی بہو رخسانہ ایسے وقت بھی طنز کے تیر برسانے سے باز نہ آتی اور اونچی آواز میں کہتی "سونے کے کڑے کھو گئے تو اُن کی حیثیت ہمارے نزدیک کھوٹے سکے کی مانند ہی ہے جو کسی کام کے نہیں۔"

زبیدہ بیگم کے عزیز و اقارب نہیں جانتے تھے کہ 'کھوٹے سکے' سے رخسانہ کا کیا مطلب ہے مگر ماہ نور، باسط اور زبیدہ بیگم اس کا مطلب بخوبی سمجھ جاتے۔ اُس وقت زبیدہ بیگم بڑی مشکل سے خود پر قابو رکھتیں۔ ورنہ عام طور پر رخسانہ کے طعنے سُن کر اُن کی آنکھیں چھلک پڑتیں تھیں۔ بہر حال رخسانہ کے طعنے سہتے ہوئے وہ اپنی زندگی کے دن کاٹ رہی تھیں۔

اگلے چند مہینوں میں گھر کی پریشانیاں مزید بڑھ گئیں۔ باسط کا کاروباری نقصان دوگنا ہو گیا۔ اُس نے بینک سے گھر کی ضمانت پر قرضہ لے کر کاروبار پر پیسا لگایا تھا مگر فائدے کے بجائے الٹا نقصان ہو رہا تھا۔ رخسانہ پہلے ہی خاصی منہ پھٹ تھی، اب معاشی تفکرات نے اُسے مزید چڑچڑا اور بدمزاج بنا دیا۔ وہ ہر وقت باسط سے لڑتی رہتی جبکہ زبیدہ بیگم اپنے بستر پر لیٹی جھگڑنے کی آوازیں سُن کر دل ہی دل میں کڑھتی رہتیں۔ ان کی جوڑوں کے درد کی دوا بھی ختم ہو چکی تھی۔ باسط باقاعدگی سے ہر مہینے دوائی لے کر آتا تھا۔ اس بار گھر کی پریشانیاں اور رخسانہ کے طنز کے تیر سہہ سہہ کر وہ بھی بھول بیٹھا کہ ماں کی دوا ختم ہو چکی۔

بیٹا شاید ماں کو بھول جائے مگر ماں بیٹے کو کبھی نہیں بھولتی۔ زبیدہ بیگم کو ماہ نور سے تمام باتوں کا علم ہو جاتا تھا۔ اُنھیں علم تھا کہ کاروبار کا دیوالیہ نکل چکا اور بینک نے

قرض کی وصولی کے لیے آخری نوٹس بھیج دیا ہے۔ بصورت دیگر بینک گھر کی نیلامی کے لیے قانونی چارہ جوئی کرسکتا تھا۔ اس گھر کے لیے پلاٹ زبیدہ بیگم نے ایک ایک پائی جوڑ کر خریدا تھا جبکہ مکان کی تعمیر بیٹے نے کی تھی۔ اس گھر کی نیلامی زبیدہ بیگم کو کسی صورت بھی گوارا نہیں تھی۔ انھوں نے گھر کو نیلامی سے بچانے کے لیے ایک فیصلہ کرلیا تھا۔ اگرچہ یہ فیصلہ اُن کے لیے بہت مشکل تھا۔

آج چھٹی کا دن تھا۔ ماہ نور کمرے میں ناشتا لے کر داخل ہوئی تو دادی کی آنکھیں بند دیکھ کر چونک پڑی۔ وہ جانتی تھی کہ دادی فجر کی نماز کے بعد جاگتی رہتی تھیں۔ جوڑوں میں درد کے باوجود زبیدہ بیگم کوئی نماز قضا نہیں کرتی تھیں۔ اگرچہ بستر سے اُٹھتے اور رکوع وسجود میں جاتے وقت انھیں خاصی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا۔ ماہ نور جب بھی ان کے کمرے میں داخل ہوتی تو وہ مسکراتی جاگ رہی ہوتیں۔ یہی وجہ تھی کہ آج خلاف توقع اپنی دادی کی آنکھیں بند دیکھ کر ماہ نور کو کچھ تشویش لاحق ہوئی۔

”دادی، آپ ابھی تک سو کیوں رہی ہیں؟؟ ماہ نور نے یہ کہہ کر ناشتے کے برتن ایک طرف رکھ زبیدہ بیگم کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو اُچھل پڑی۔ اُن کا جسم بخار سے تپ رہا تھا۔ دادی کیا ہوا ہے آپ کو؟ اس نے گھبرا کر زبیدہ بیگم کو ہلایا جلایا۔ آواز سُن کر زبیدہ بیگم نے آنکھیں کھول دیں اور پھر ماہ نور کو دیکھ کر اُن کے چہرے پر ایک محبت بھری مسکراہٹ بکھر گئی۔

”کچھ نہیں بس ذرا سا بخار ہو گیا ہے۔“ انھوں نے نقاہت زدہ لہجے میں کہا۔ ”تم ذرا الطاف اور بہو سے کہو کہ میں نے انھیں اپنے کمرے میں بلایا ہے۔ جاؤ فوراً انھیں میرا پیغام دو۔“

دادی کی بات سُن کر ماہ نور فوراً ہی اپنے امی ابو کے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ ”ابو جان، دادی نے آپ کو اپنے کمرے میں بلایا ہے اور امی جان آپ کو بھی۔“ داخل ہوتے ہی اُس نے والدین سے کہا۔

”کیوں کیا ہوا؟ باسط چونک کر بولا۔

”دادی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ آپ دونوں اُن کے کمرے میں آجائیں۔ انھیں کوئی بہت ضروری بات کرنی ہے۔“

”امی جان کی طبیعت ٹھیک نہیں؟“ یہ کہتے ہوئے باسط فوراً اپنی کرسی سے اٹھا اور ماہ نور کے ہمراہ زبیدہ بیگم کے کمرے میں آ گیا۔ رخسانہ نے بیٹی کی بات سُن کر کسی خاص ردعمل کا مظاہرہ نہیں کیا اور وہ خاموشی سے بستر پر لیٹی رہی۔

”امی جان کیا ہوا آپ کی طبیعت کو؟ کمرے میں داخل ہو کر باسط نے ماں کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔“

”بڑے دن بعد میرے کمرے میں آئے ہو اور وہ بھی میرے بُلانے پر!“ زبیدہ بیگم نے جواب دینے کی بجائے اُلٹا سوال کردیا۔

”بس آپ تو جانتی ہیں کہ کام کی مصروفیت ہی کچھ ایسی ہے۔ فرصت ہی نہیں مل پاتی۔“ باسط نے کھسیانے لہجے میں جواب دیا۔ ”آپ کو تو بہت تیز بخار ہے۔ میں ابھی ٹیکسی منگواتا ہوں تا کہ آپ کو اسپتال لے جایا جاسکے۔“

”نہیں میں بس یہ چاہتی ہوں کہ تم کچھ دیر میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ مجھے ضروری بات کرنی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میرا وقت ہی پورا ہو جائے۔“

”آپ مایوسی کی باتیں کیوں کررہی ہیں امی جان!“ باسط نے ماں کے سرہانے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو معمولی سا بخار ہے۔ دوائی کھانے سے ٹھیک ہو جائے گا۔ ویسے وہ کون سی ضروری بات ہے؟“

زبیدہ بیگم نے دوبارہ آنکھیں موندلیں۔ انھوں نے بیٹے کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ رخسانہ کمرے میں داخل ہوئی۔ ”کیا ہوا ہے امی جان کو؟“ اس نے رسمی سے لہجے میں پوچھا۔

اس کی آواز سُن کر زبیدہ بیگم نے آنکھیں کھول دیں۔ اُن کے چہرے پر ہلکی سی حیرت پھیل گئی۔ شاید انھیں توقع نہیں تھی کہ بلانے پر رخسانہ بھی کمرے میں آجائے گی۔ وہ اُن کی بات کو خاطر میں کہاں لاتی تھی۔

”رخسانہ دل کی بُری نہیں امی!“ باسط فوراً بیوی کی حمایت میں بول پڑا۔ ”بس آپ تو جانتی ہی ہیں کہ یہ بلند فشار خون کے مرض میں مبتلا ہے، اس لیے غصے میں آ کر جو منہ میں آئے بول دیتی ہے۔“

زبیدہ بیگم نے شکوہ بھری نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھا تو اُس نے بے اختیار ماں سے نظریں چُرالیں۔

”ابو جان، دادی کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا چاہیے۔“ ماہ نور نے کہا تو وہ چونک پڑا۔ زبیدہ بیگم نے دوبارہ آنکھیں بند کرلی تھیں۔ لگتا تھا کہ اُن کی حالت واقعی بہت خراب تھی۔ باسط نے فوراً موبائل فون نکالا اور ایک جاننے والے ٹیکسی ڈرائیور کو فون کر کے جلد از جلد اپنے گھر پہنچنے کا کہا۔ ”بیس پچیس منٹ میں ٹیکسی پہنچ جائے گی۔“ اس نے ماہ نور کی استفسار طلب نگاہوں کے جواب میں کہا۔

اسی لمحے زبیدہ بیگم نے آنکھیں کھول دیں اور پوچھا۔ ”باسط بیٹے، ماہ نور نے بتایا ہے کہ کاروبار بالکل ختم ہو گیا ہے۔“

”جی امی جان، کاروبار کا دیوالیہ نکل چکا۔“ اس نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ میں اب گھر کا خرچ چلانے کے لیے نوکری کر رہا ہوں۔ تنخواہ اچھی ہے، بس سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ گھر نیلامی سے کیسے بچاؤں۔“

”میری ایک خواہش پوری کرو گے؟“ زبیدہ بیگم نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے محبت سے کہا۔

”جی ضرور امی جان۔“ زبیدہ بیگم آخر اس کی ماں تھیں۔ ماں کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر اس کے اندر سوئی ہوئی محبت جاگ اٹھی تھی۔ آج اُسے سب کچھ یاد آرہا تھا۔ زبیدہ بیگم نے انتہائی نامساعد حالات میں بھی اُسے نہ صرف پال پوس کر بڑا کیا بلکہ اعلیٰ تعلیم بھی دلوائی تھی اور اُس کی خاطر دوسری شادی بھی نہ کی۔

”میں چاہتی ہوں کہ تم کمرے کے اس کونے کا فرش کھود ڈالو۔“ زبیدہ بیگم نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ماں کی عجیب وغریب فرمائش پر باسط نے حیرت بھرے انداز میں انھیں دیکھا۔ لمحہ بھر کے لیے اُسے لگا جیسے بیماری کی وجہ سے والدہ کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہو۔ ”مگر کیوں امی جان؟“ اس نے استفسار کیا۔

”جو میں کہہ رہی ہوں وہ کرو۔“ زبیدہ بیگم کی سانسیں بے ترتیب ہونے لگیں۔

”ابو جان! دادی کی طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے۔ ماہ نور نے بے چین لہجے میں کہا۔

”ہاں“ باسط نے فکرمندی سے ماں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”بس چند منٹ تک ٹیکسی پہنچ جائے گی۔“

رخسانہ بھی آگے بڑھ کر زبیدہ بیگم کی حالت کا جائزہ لے رہی تھی۔ ساس کی مخدوش حالت دیکھ کر اس کے چہرے پر بھی ہمدردی کے تاثرات اُمنڈ آئے۔ اگرچہ وہ خاصی بدمزاج تھی مگر انسانیت کے جذبے سے بالکل نابلد بھی نہیں تھی۔

”باسط، کیا تم اپنی ماں کی اتنی سی خواہش بھی پوری نہیں کر سکتے؟“ زبیدہ بیگم نے اُکھڑی سانسوں کے درمیان کہا۔

ماں کی بات سُن کر باسط کچھ دیر تذبذب کی کیفیت میں انھیں دیکھتا رہا پھر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس نے صحن میں پڑی ایک پرانی کُدال اُٹھائی اور واپس کمرے میں آ گیا۔ اس دوران زبیدہ بیگم کی اکھڑی سانسیں کچھ حد تک بحال ہو چکی تھیں۔

اس جگہ کا فرش توڑ ڈالو اور پھر زمین کھود دو۔“ زبیدہ بیگم نے دوبارہ کونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہاں تمھاری ایک امانت دفن ہے۔“ انھوں نے بڑی عجیب بات کی تھی۔

باسط نے اُلجھن آمیز نگاہوں سے ماں کو دیکھا۔ نہ جانے وہ کس امانت کا ذکر کر رہی تھیں۔ رخسانہ اور ماہ نور کے چہرے پر بھی حیرت کے تاثرات عود کر آئے۔ باسط نے مزید بحث مناسب نہ سمجھی اور کدال سے فرش کا وہ حصہ توڑ ڈالا جس طرف زبیدہ بیگم نے اشارہ کیا تھا۔ پکا فرش ٹوٹتے ہی کچی زمین نمودار ہو گئی۔ اس نے زمین کھودنا شروع کر دی تاہم چہرے سے عیاں تھا کہ اُسے اپنی ماں کی فرمائش پر

بہت حیرانی ہے۔ ایک فٹ کھدائی کے بعد کدال کسی سخت چیز سے ٹکرائی تو اُس نے اپنے ہاتھ روک دیے۔ پھر کدال ایک جانب رکھ کر ہاتھوں سے مٹی نکالنے لگا۔ اب اُس کے چہرے پر تجسّس کے تاثرات در آئے تھے۔ رخسانہ اور ماہ نور بھی مبہوت ہو کر یہ سارا منظر دیکھ رہی تھیں۔

مٹی نکالنے میں کچھ وقت لگا۔ پھر باسط زمین سے ایک چھوٹی سی فولادی صندوقچی برآمد کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اُس نے صندوقچی پر لگی مٹی صاف کی اور پھر اُسے لیے اپنی ماں کے پاس آ گیا۔

''اسے کھولو'' زبیدہ بیگم نے عجیب نگاہوں سے صندوقچی دیکھتے ہوئے کہا۔ باسط نے وہ صندوقچی کھول دی۔

''ارے اس میں تو چار وزنی کڑے ہیں۔ غالباً یہ سونے کے ہیں۔ اُس کے حلق سے تحیر خیز آواز برآمد ہوئی۔ کڑے دیکھ کر ماہ نور اور رخسانہ بھی ششدر رہ گئیں۔

ہاں، یہ سونے کے وہی کڑے ہیں جو میرے مرحوم شوہر اور تمہارے والد نے شادی کے وقت مجھے تحفے میں دیے تھے۔'' زبیدہ بیگم نے جواب دیا۔

''مگر امی جان وہ سونے کے کڑے تو ہجرت کے دوران کہیں کھو گئے تھے۔'' باسط نے حیرت سے سوال کیا۔

''نہیں بیٹا یہ ہمیشہ سے میرے پاس تھے۔ جب سکھوں نے ہم پر حملہ کیا تھا تو انھیں میں نے اپنے لباس میں ایک تھیلی کے اندر چھپا رکھا تھا۔ قسمت اچھی تھی جو یہ قیمتی کڑے بچ گئے۔ میں نے پھر یہ سوچ کر انھیں محفوظ کر دیا کہ بُرے وقت میں کام آئیں گے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں کڑے ہمیشہ اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی۔ شاید میں اپنے مرحوم شوہر کی اس نشانی کے بارے میں بہت حساس ہو گئی تھی۔ مجھے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا کہ کہیں کوئی مجھ سے انھیں چھین نہ لے۔ اس لیے میں نے انھیں صندوقچی میں بند کر کے زمین میں دبا دیا۔

''تمھیں یاد ہو گا کہ جب ہم اس گھر میں منتقل ہوئے تھے تو اس کا فرش کچا تھا۔ بعد میں تم نے اسے پکا کروایا۔ اس طرح یہ سونا زمین میں دفن ہو کر خوب محفوظ ہو گیا مگر رات میں نے بہت سوچا۔ مجھے لگا کہ میں اپنے مرحوم شوہر کی نشانی کے بارے میں خاصی خود غرض ہو گئی ہوں۔ اس پر تمہارا بھی حق بنتا ہے۔ ویسے بھی میرے مرحوم شوہر کی اصل نشانی تو تم ہو اور تمھیں ان دنوں پیسوں کی بھی سخت ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے سینے میں برسوں سے مدفون اس راز کو تم پر آشکارا کر دیا کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ یہ گھر نیلام ہو۔ اب یہ کڑے بیچ کر تم اس گھر پر واجب قرض اُتار سکتے ہو۔ آئندہ کوئی بھی کاروبار اچھی طرح سوچ سمجھ کر کرنا اور ہاں کچھ پیسے ماہ نور کی شادی کے لیے بھی بچا رکھنا۔'' بات کرتے ہوئے زبیدہ بیگم کی سانسیں اُکھڑنے لگیں تو وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئیں۔

''امی جان! آپ نے آج ہمیں یہ سونا دے کر ہمارے گھر کو بکھرنے سے بچا لیا۔ میں نے ہمیشہ آپ کے ساتھ اہانت آمیز رویہ اپنائے رکھا۔ مجھے معاف کر دیں۔'' رخسانہ نے بے اختیار ساس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ شاید اُسے بھی اپنی غلطی کا کچھ نہ کچھ احساس ہو گیا تھا۔

رخسانہ کے معافی مانگنے پر زبیدہ بیگم کے چہرے پر گہرے اطمینان کے تاثرات دکھائی دینے لگے۔ وہ اُکھڑی سانسوں کے درمیان بولیں ''بہو شاید نئے زمانے کے باسیوں کے لیے ہم بوڑھے واقعی کھوٹے سکے کی حیثیت اختیار کر چکے مگر یاد رکھنا کبھی کبھی کھوٹے سکے بھی کام آ جاتے ہیں۔'' یہ سُن کر رخسانہ کے چہرے پر شرمندگی کے تاثرات عود کر آئے۔ زبیدہ بیگم نے ایک بار پھر آنکھیں موند لیں۔ اُن کے سینے کا اُتار چڑھاؤ یکلخت تھم سا گیا تھا۔ ''امی جان کیا ہوا آپ کو؟'' رخسانہ اُن کی حالت دیکھ کر گھبرا گئی۔ باسط بھی والدہ کے قریب آیا اور اُن کے منہ پر ہاتھ رکھ سانسوں کی گرماہٹ محسوس کرنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔

''دادی کیا ہو گیا ہے آپ کو؟'' ماہ نور نے زبیدہ بیگم کو روتے ہوئے کہا۔ مگر دادی نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ اس بار انھوں نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند لی تھیں۔ ◆◆◆

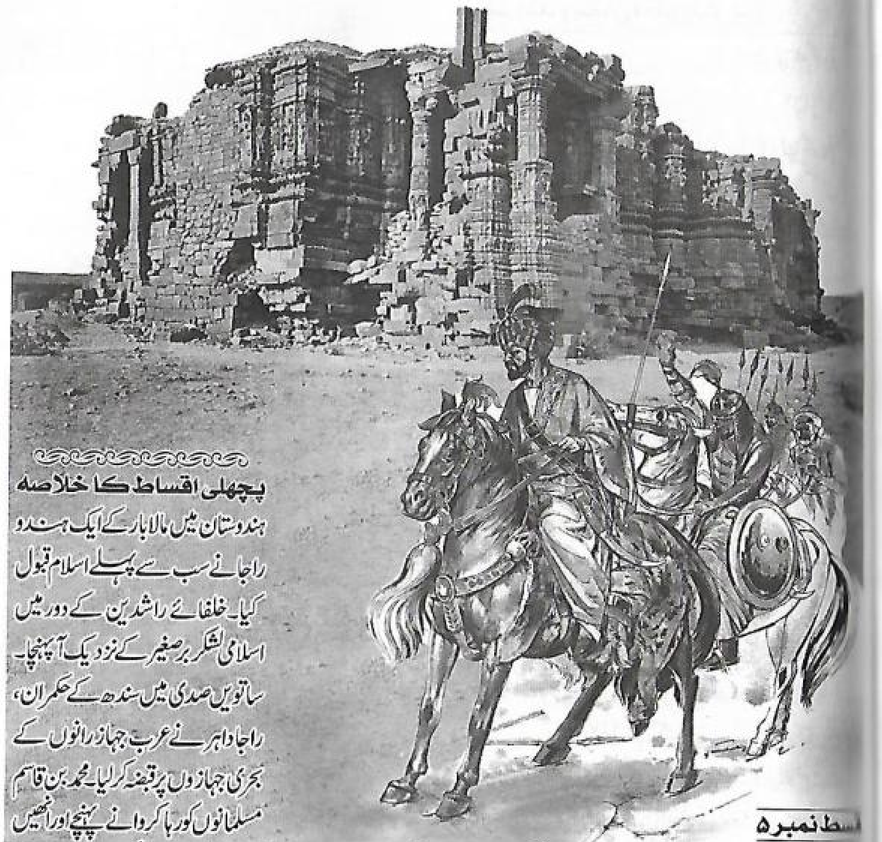

پچھلی اقساط کا خلاصہ

ہندوستان میں مالابار کے ایک ہندو راجا نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا۔ خلفائے راشدین کے دور میں اسلامی لشکر برصغیر کے نزدیک آ پہنچا۔ ساتویں صدی میں سندھ کے حکمران، راجا داہر نے عرب جہاز رانوں کے بحری جہازوں پر قبضہ کر لیا۔ محمد بن قاسم مسلمانوں کو رہا کروانے پہنچے اور انھیں کامیابی نصیب ہوئی۔ اسی طرح جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کے قدم جم گئے اور دینِ اسلام کی اشاعت ہونے لگی۔ محمد بن قاسم کے بعد ہندو راجاؤں اور محمود غزنوی کی جنگ ہونے لگی۔ راجاؤں کو سبق سکھانے کی خاطر پھر محمود غزنوی ہندوستان پر حملے کرنے لگے۔

اب آگے پڑھیے۔

قسط نمبر ۵

سومناتھ کی فتح

ہندوؤں کا مقدس ترین مندر گرا کر جب محمود غزنوی نے بُت پرستوں کی اکڑفوں کافور کر ڈالی

مسلم ہندوستان کی تاریخ

سیّد قاسم محمود

چھٹا حملہ۔ ۱۰۰۸ء

باپ جے پال کی طرح آنند پال نے بھی دہلی، گوالیار، اجمیر، کالنجر، اجین اور قنوج وغیرہ کے راجاؤں اور وحشی کھوکھروں (گکھڑوں) کو ساتھ ملا کر زبردست فوج محمود غزنوی کے خلاف تیار کرلی۔ اس کے ساتھ مقابلے کی خاطر محمود نے چھٹا حملہ کیا۔ سب راجاؤں کو یہ فکر دامن گیر تھی کہ اگر محمود آنند پال کے استحصال میں کامیاب ہوگیا تو پھر پورے ہندوستان یعنی دہلی اور موجودہ یوپی، بہار اور دکن کے درمیان کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے گی۔

اسی لیے پورا ہندوستان متحد ہوکر اپنے تمام وسائل اور مذہبی و عوامی جوش و خروش کے ساتھ محمود کے خلاف صف آرا ہو گیا۔ بالخصوص کھوکھروں میں شدید جذبہ مخالفت تھا۔ ان کی عورتوں نے زیور بیچ کر لشکریوں کی مدد کی اور جو غریب تھیں، انھوں نے چرخہ کات اور مزدوری کر کے پیسے بچائے اور ان سے چیزیں خرید لشکریوں کو روانہ کیں۔

اٹک کے قریب جنگ ہوئی۔ ہفتوں گھمسان کی لڑائی ہوتی رہی۔ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ لڑائی کے آغاز میں کھوکھروں نے سخت حملہ کیا اور محمود کے خیمے تک پہنچ گئے، لیکن جلد ہی لڑائی کا نقشہ بدل گیا۔ آنند پال کا ہاتھی بگڑ کر بھاگا۔ دوسرے راجاؤں نے یہ سمجھا کہ آنند پال نے ان کے ساتھ دغابازی کی ہے۔ وہ سب بددل ہوگئے۔ فوج میں افراتفری پھیل گئی۔ یوں میدان محمود کے ہاتھ رہا۔ اس شاندار فتح کا ہندوستان پر غیر معمولی اثر پڑا۔ تنہا محمود نے کئی بڑے بڑے راجاؤں کے قدم اُکھاڑ دیے۔ ہندوستان بھر میں محمود کی دھاک بیٹھ گئی۔ یہ خیال عام ہوگیا کہ محمود کا مقابلہ بے سود اور اسے شکست دینا محال ہے۔

اس بڑے معرکے سے فارغ ہوکر محمود نے نگرکوٹ (کانگڑہ) کا رخ کیا۔ یہ اس زمانے کا اہم تیرتھ تھا اور اسے ہندوستان میں وہی حیثیت حاصل تھی جو قدیم یونان میں ڈیلفی کی تھی۔ مؤرخ فرشتہ لکھتا ہے کہ ہندو بڑے اور کٹھن کام شروع کرنے سے پہلے نگرکوٹ کے بت سے مشورہ لیتے تھے۔ اگر اجازت ملتی تو اس کام کو شروع کرتے، ورنہ اس سے دست کش ہوجاتے۔ فرشتہ تو یہاں تک لکھتا ہے کہ اس زمانے میں بعض لوگ، جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے تھے، وہ بھی اس بت سے مشورہ کرتے۔ بت خانے میں ثواب کی غرض سے بڑے چڑھاوے اور نذرانے پیش کرتے۔ بہرحال تین دن کے محاصرے کے بعد نگرکوٹ کا مضبوط پہاڑی قلعہ فتح ہوگیا۔ یہاں کے بت خانے سے بے شمار مال غنیمت محمود کے ہاتھ آیا۔

ساتواں حملہ۔ ۱۰۰۹ء

محمود نے ساتواں حملہ نارائن یا ناردین نام کے مقام پر کیا، جس کے بارے میں بعض مورخین کے درمیان اختلاف ہے اور بعض نے اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ یہ بھی تحقیق نہیں کی جا سکی کہ آج کے جغرافیائی نقشے میں اس مقام کا کیا نام ہے۔ لیکن یہ جگہ حملے کے وقت سیاسی اور فوجی نقطہ نظر سے اتنی اہم تھی کہ اس کے فتح ہونے سے ایسا معاہدہ امن ہوا جس کے نتیجے میں ہندوستان خراسان تک کے تجارتی راستے کھل گئے۔ بعض مورخین کا یہ خیال ہے کہ نارائن پور ریاست الور میں ہے۔ اسی سال محمود نے غزنی واپس جا کر ایک خاص عسکری چال سے غور پر بھی قبضہ کرلیا۔

آٹھواں حملہ۔ ۱۰۱۰ء

محمود نے ہندوستان میں آٹھویں مہم ملتان کے شرپسند اور بدعقیدہ قرامطہ کے خلاف انجام دی اور ان کی فساد انگیز روش کو دیکھتے ہوئے ان کا قلع قمع کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ وہاں کے

حکمران ابوالفتح داؤد کو گرفتار کر کے عمر قید کی سزا دی اور دوسرے قرامطیوں کو بھی سخت سزائیں دیں۔ ملتان کو سلطنت غزنی میں شامل کرلیا، تاکہ مسلم حکومت کے علاقے میں مسلسل فتنہ پردازیوں کا مکمل سدباب ہوجائے۔ ملتان میں اپنا گورنر مقرر کیا۔ محمود غزنوی نے محمد بن قاسم کی بنوائی ہوئی جامع مسجد از سر نو آباد کی، جس کو قرامطی حکمرانوں نے مسمار کر دیا تھا۔

نواں حملہ۔ ۱۰۱۱ء

نواں حملہ تھانیسر پر ہوا جو ہندوؤں کی ایک بہت بڑی زیارت گاہ تھی۔ وہاں کے مندر کا بت قدیم ترین تصور کیا جاتا تھا۔ مندروں میں دولت کے انبار لگ گئے تھے۔ ہندوؤں کا خیال تھا کہ تھانیسر کا بت ہمیشہ ان کی پشت پناہی کرتا رہے گا۔ راجاؤں کی شرارت رک نہیں رہی تھی اور وہ اپنی بدعہدیوں اور جنگ بازیوں سے بار بار محمود کو پریشان کر رہے تھے۔ چنانچہ محمود نے ایک بڑے لشکر کے ساتھ اس مقام کی طرف رخ کیا۔ لشکر میں کثیر تعداد میں ہندو سپاہی بھی تھے، اس لیے کہ راجا آنند پال نے نہ صرف کوئی مزاحمت نہ کی بلکہ سامان رسد بہم پہنچایا اور فوج بھی فراہم کی۔ اس نے یہ استدعا کی کہ اگر تھانیسر کے مندروں کو سالم چھوڑ دیا جائے تو وہ اس کے عوض خطیر رقم پیش کرے گا۔ محمود نے یہ پیشکش نامنظور کردی۔ تھانیسر کے راجا نے دوسرے راجاؤں کو اپنے ساتھ ملانا چاہا، لیکن اس نے یہ کوشش اس وقت کی جب محمود کی فوجیں سر پر آ چکی تھیں۔

راجا نے محمود کو دولت کی رشوت پیش کی، مگر محمود کا مقصد ہر قسم کے سیاسی فتنے کو دبانا تھا۔ خاص کر وہ جو مذہبی جذبات ابھار کر پیدا کیے جاتے، زیادہ خطرناک معلوم ہوتے تھے۔ راجا نے مایوس ہوکر راہ فرار اختیار کی۔ بت خانوں، مندروں اور شہروں سے بے شمار مال غنیمت حاصل ہوا۔ ۱۰۱۲ء میں غزنی واپس آ کر محمود نے خلیفہ بغداد کو دبا دھمکا کر سمرقند پر قبضہ کرلیا۔

دسواں حملہ۔ ۱۰۱۳ء

یہ حملہ شوالک کے علاقے پر ہوا، جہاں آنند پال کے جانشین ترلوچن پال نے حاکم کشمیر کے ساتھ مل کر بڑا زور باندھا تھا۔ یہ علاقہ محمود کے ان عزائم کی راہ میں حائل ہو رہا تھا، جو ہندوستان کے شورش پسندوں اور باغیوں کی سرکوبی کے لیے سلطان کے ذہن میں تھے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ جب تک تمام فتنوں کا سدباب نہ کیا جائے، سلطنت غزنی کو ہندوستان سے لاحق ہونے والا خطرہ دور نہیں ہوگا۔ ہندوشاہی کا آخری تاجدار ترلوچن پال کا لڑکا بھیم پال تھا جو "نڈر بھیم" کے نام سے مشہور تھا۔ بھیم نے اپنے دادا آنند پال کی راہ اطاعت چھوڑ کر شدید مخالفت پر کمر باندھی۔ محمود فوج لے کر بڑھا تو بھیم پال نے جہلم کے مقام پر اس کا راستہ روکا۔ سخت لڑائی ہوئی۔ بھیم کو شکست ہوئی اور محمود نے اس علاقے کو بھی سلطنت غزنہ میں شامل کرلیا۔

گیارھواں حملہ ۱۰۱۵ء

یہ حملہ کشمیر پر کیا گیا جہاں کی سرحدوں تک، دو سال پہلے محمود آ کر لوٹ چکا تھا، لیکن ترلوچن کی شکست کے بعد جب دشمن نے کشمیر میں پناہ لی اور وہاں بیٹھ کر سازشیں کرنے لگا تو محمود کو اس کی طرف رُخ کرنا پڑا۔ راستہ بہت دشوار گزار تھا اور غزنوی فوج علاقے کے اندر دور تک نہیں جا سکی۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان کئی ماہ تک قلعہ لوہ کوٹ کا محاصرہ کیے رہا مگر جب موسم خراب ہونے لگا اور ناقابل برداشت ہوگیا تو وہ اپنا لشکر لے کر واپس ہوگیا اور واپسی میں اس نے قدرتی مشکلات کے سبب بہت نقصانات اٹھائے۔

یہ ہندوستان میں محمود کی پہلی ناکامی تھی۔ اس کے باوجود کشمیر کی بڑی مہم کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ وہاں کے امن پسند، سادہ لوح مظلوم عوام نے جب مسلمانوں کے حسن کردار اور اسلام کی برکتوں کو دیکھا تو وہ نہایت متاثر ہوئے اور فطری طور پر دین حق کی طرف راغب ہوگئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کشمیری بکثرت مسلمان ہوئے اور وہاں تیزی سے اسلام پھیلنے لگا۔

غزنی واپس جا کر محمود نے خوارزم کا علاقہ اپنی وسیع سلطنت میں شامل کرلیا۔

بارھواں حملہ۔ ۱۰۱۸ء

اب قنوج کی باری تھی، اس لیے کہ یہ شمالی ہندوستان کی مرکزی ریاست تھی اور تب سب سے بڑی طاقت سمجھی جاتی۔ محمود غزنوی نے ارادہ کیا کہ ایک فیصلہ کن حملہ کر کے ہندوستان میں بار بار برپا ہونے والی شورشوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کردیا جائے، تاکہ ہندوستان اور سلطنت غزنہ میں مکمل امن وامان قائم ہوجائے۔ اس مقصد کے لیے محمود نے ایک زبردست فوج کے ساتھ نئی حکمت عملی ترتیب دی اور پیش قدمی کا وہ پرانا راستہ بھی بدل دیا جس میں قدم قدم پر خون ریز مقابلے کرنے پڑتے تھے۔

اس سلسلے میں ہندوستان کے بعض راجاؤں نے بھی اس کی مدد کی، خاص طور پر راجا کشمیر نے راہنمائی کی۔ غزنوی کی فوج انتہائی شمالی علاقوں میں کوہستان ہمالیہ سے نکلنے اور دامنِ ہمالیہ میں بہنے والے دریاؤں کے کنارے کنارے چل کر یکایک قنوج پہنچ گئی۔ وہاں پہنچتے ہی اس کی فتوحات کا آغاز ہو گیا۔ اس کے گزشتہ عسکری کارناموں کا دبدبہ اس درجہ طاری تھا کہ نہ تو قنوج کے راجا کو جنگ کرنے کا حوصلہ ہوا اور نہ دوسرے راجے اس کی مدد کے لیے آنے کی ہمت کرسکے۔ راجا نے ہتھیار ڈال دیے۔

محمود نے بڑی فیاضی سے کام لے کر اسے نہ صرف امان دی بلکہ معاہدہ امن پر قائم رہنے کی صورت میں اپنی جانب سے پورے تحفظ کی یقین دہانی بھی کروائی۔ قنوج کی مہم کے دوران متھرا، میرٹھ اور بلند شہر وغیرہ میں بھی محمود غزنوی کو فتوحات حاصل ہوئیں۔ لگتا ہے، پورا شمالی مغربی ہندوستان (موجودہ پاکستان) اُس کا اطاعت گزار ہوگیا۔ اس مہم میں مال غنیمت اور اسیران جنگ تو بہت ہاتھ آئے، مگر خون ریزی نہیں ہوئی۔ متھرا کے مندروں کی طرز تعمیر محمود کو اس قدر پسند آئی کہ اس نے ان کی تعریف اپنے ''فتح نامہ'' میں بھی کی۔ اس حملے اور کامیابی کی خبر سارے عالم اسلام میں پہنچی۔ خلیفہ بغداد نے محمود کا ''فتح نامہ'' وصول کرنے کے لیے خصوصی دربار منعقد کیا۔

تیرھواں حملہ۔ ۱۰۱۸ء

یہ حملہ کالنجر پر اس لیے ہوا کہ وہاں کے راجا نندرائے نے محمود کے خلاف ہندوشاہی خاندان کے راجا ترلوچن پال اور دوسرے راجاؤں کو ملا کر زبردست متحدہ لشکر ترتیب دیا تاکہ محمود سے پچھلی شکستوں کا انتقام لیا جائے۔ اس سازش میں وفاداری کے عہد کے باوجود پنجاب کا راجا جے پال دوم بھی شریک ہوگیا۔ البتہ قنوج کا راجہ سازش سے الگ رہا، جس کی سزا اسے یہ دی گئی کہ دوسرے راجاؤں نے اس کے خلاف بھی محاذ بنالیا۔ ان واقعات کی اطلاع راجا قنوج نے محمود غزنوی کو بھیجی۔

وہ فوراً اپنی فوج لے کر باغی راجاؤں کو ایک بار پھر ان کی شورش پسندی کا مزا چکھانے کے لیے روانہ ہوگیا۔ پنجاب کے بے وفا راجا نے اس کا راستہ روکنا چاہا، جس کے سبب محمود کو منزل تک پہنچنے میں اتنی دیر ہوگئی کہ فتنہ پرور راجاؤں نے قنوج کے راجا کا کام تمام کردیا۔ جب محمود کالنجر پہنچا تو تقریباً ایک لاکھ کے عظیم الشان لشکر دیکھ کر ہندو متحدہ لشکر کالنجر کے میر لشکر راجا پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ محمود نے اتنے دور دراز علاقے میں مزید قیام یا لشکر کشی محفوظ نہ سمجھی، کیونکہ پنجاب ابھی تک اس کے زیر نگیں نہ تھا، اس لیے کسی مزید فوجی کارروائی کے بغیر وہ واپس آگیا۔

چودھواں حملہ۔ ۱۰۲۱ء

محمود غزنوی کو پنجاب پر مکمل قبضہ کرنے کی ضرورت و اہمیت کا احساس پہلے کئی بار ہوچکا تھا، لیکن اس مرتبہ شدت سے ہوا۔ پنجاب کے بغیر اس کی دور دراز کی مہمیں خطرے سے خالی نہ تھیں، اس لیے اس مرتبہ محمود اُسے مکمل فتح کرنے کے ارادے سے روانہ ہوا۔ اس مرتبہ معیت میں صرف فوج ہی نہیں، بلکہ ساتھ انجینئر، بڑھئی، لوہار اور سنگ تراش بھی

۔ یہ اس لیے کہ اس بار وہ صرف حملہ کرنے نہیں آیا تھا، اس کا مقصد پنجاب کو فتح کر کے وہاں منظم حکومت قائم کرنا ۔ چنانچہ اس نے پنجاب کے خاندانی غدار جے پال دوم کو ت ناک شکست دی۔ وہ فرار ہوگیا۔ محمود غزنوی نے لات کو صاف کروا کر مشہور سردار خواجہ ایاز کو پنجاب کا گورنر رکیا۔ پنجاب کے مختلف حصے اپنے افسروں کے سپرد کیے اہم مقامات پر چھاؤنیاں مقرر کیں۔ پنجاب زیر نگیں کر محمود کو اپنی آئندہ مہمات کے بارے میں ذرا اطمینان ہوا۔ نچہ اس کی اگلی دو مہمیں دور دراز علاقوں میں ہوئیں۔

پندرھواں حملہ۔ ۱۰۲۲ء

کالنجر کا راجا نندرائے اب بھی محمود کے خلاف مسلسل زشیں کررہا تھا۔ چنانچہ محمود ایک بار پھر کالنجر روانہ ہوا۔ راستے گوالیار کا شہر آتا تھا جہاں کے راجا نے نند پال کی مدد کی تھی۔ ود کے حملے سے گوالیار کا راجا خوفزدہ ہوگیا۔ اس نے ہاتھی نے کی پیش کش کی۔ محمود نے قبول کی اور محاصرہ اٹھالیا۔ اب محمود آگے بڑھ کر کالنجر کے مضبوط قلعے کا محاصرہ کرلیا اور رسد کے ستے بند کردیے۔ آخر راجا نندرائے نے صلح کی درخواست کی۔ ن سو ہاتھی پیش کیے اور سالانہ خراج دینے کا یقین دلایا اور محمود کی ان میں ہندی زبان میں قصیدہ لکھ کر پیش کیا۔

محمود نے ایک بار پھر عالی ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اجا کو معاف کردیا۔ کانجر کا راجا محمود کی بلند سیرت سے اس جہ متاثر ہوا کہ اس نے محمود کے انتقال کے بعد بھی سرکشی یں کی اور کالنجر کا قلعہ کئی سال تک غزنی کی حکومت کے زیر تعمال رہا۔

سولھواں حملہ۔ ۱۰۲۵ء

سومناتھ اور کچھ کے شہر بحری بیڑوں کے اڈے تھے۔ زمانے میں وہاں اکثر عرب جہازوں کو لوٹ لیا جاتا تھا۔ امطہ بھی اسی علاقے میں آکر زیادہ سرگرم ہوگئے تھے۔ رات میں مسلمانوں کے ساتھ بڑی زیادتیاں کی جارہی تھیں۔ سومناتھ میں مسلمان تاجروں کی ایک بستی تھی، جہاں ایک بڑے متقی بزرگ محمد بن حسن عراقی مقیم تھے۔ وہ محمود شاہ سنگرولی کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ ان سے مسلمانوں کی حالت زار دیکھی نہ گئی اور انھوں نے محمود غزنوی کو خط لکھا کہ وہ آکر مسلمانوں کو مصیبتوں سے نجات دلائیں۔

تاریخ کی کتابوں میں یوں بھی آیا ہے کہ ایک نئے مہنت کی جانشینی کے جھگڑے میں کسی فریق نے سلطان محمود سے مدد مانگی اور اس کو اپنی فوج کے ساتھ آنے کی دعوت دی۔ اس کے علاوہ عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان میں مندر ایک طرف مال و دولت اور عیش و عشرت کے مراکز بن گئے تھے، دوسری طرف مظلوم عوام کے مقابلے میں ہمیشہ ظالم راجاؤں اور سرداروں کی حمایت کرتے تھے، نیز اصحاب اقتدار مندروں کو اپنے اقتدار کے لیے بے دریغ استعمال کرتے۔ چنانچہ عبادت گاہوں کو ہر قسم کی سازشوں کا اڈہ اور فتنوں کا سرچشمہ بنادیا گیا۔

سومناتھ کے متعلق مافوق الفطرت کرامات کے اوہام و خرافات نے اس کو ان عقائد کا سب سے بڑا مرکز بنادیا جن کا سہارا لے کر اور ان کی دہائی دے کر ہندوستان کے راجے، مہاراجے عوامی جذبات مشتعل کرتے تھے۔ ان کی اس اشتعال انگیزی کے نتیجے میں بار بار سلطنت غزنی کے خلاف شورشیں برپا ہوتی تھیں۔ جنگوں میں ہارے ہوئے راجے، مہاراجے، جن کو محمود معاف کردیا کرتا تھا اور وہ اس کی اطاعت کا بھی عہد کرلیتے تھے، بہت جلد بغاوت پر آمادہ ہوجاتے۔ یہ خیال عام تھا کہ سومناتھ ناقابل شکست ہے اور جب تک وہ باقی ہے، محمود ہندوستان فتح نہیں کرسکتا۔ سومناتھ کو سومنات بھی لکھا جاتا ہے، لیکن بیشتر مؤرخین کا یہ خیال درست معلوم ہوتا ہے کہ سومناتھ ہی صحیح ہے۔ یہ دو الفاظ کا مرکب ہے، سوم یعنی چاند اور ناتھ یعنی دیوتا۔

محمود غزنوی تمام حالات کا گہری نظر سے مشاہدہ کررہا تھا۔ اس کو یہ اطلاع بھی مل گئی تھی کہ سومناتھ کے مندر

میں مسلمانوں کے خلاف بڑے پیمانے پر عالمی سازشیں ہو رہی ہیں۔ سومناتھ پر حملے کی غرض سے محمود نے راجپوتانے کا راستہ اختیار کیا تاکہ گجرات کے راجا کو اس کی آمد کا پہلے سے علم نہ ہوسکے۔

۲۲ شعبان ۴۱۶ھ یعنی ۱۸/اکتوبر ۱۰۲۵ء کو محمود اپنے دارالحکومت غزنی سے روانہ ہوا۔ ملتان میں قیام کیا، جس کے دوران صحرائی سفر کی تیاریاں کیں۔ ہر سپاہی کو صرف پانی لے جانے کے لیے دو اونٹ دیے۔ دیگر سامان کے لیے الگ اونٹ تھے۔ اس کے علاوہ ہنگامی ضرورت کے لیے مزید بیس ہزار اونٹوں پر پانی کا ذخیرہ جمع کیا۔ فوج میں تیس ہزار باقاعدہ سپاہی موجود تھے۔ ۲۶/نومبر ۱۰۲۵ء کو محمود کی فوج نے ملتان سے کوچ کیا اور راجستھان کا صحرا عبور کر کے وہ لاروہ پہنچے جو اس زمانے میں جیسلمیر کا دارالحکومت تھا۔ لاروہ کا قلعہ فتح کر کے وہ انہلواڑہ جا پہنچے (دریائے سرسوتی کے کنارے یہ شہر اب پٹن کہلاتا ہے) جہاں کا راجا بھاگ گیا۔

محمود یہاں سے مندھیر فتح کرتے دیلوڑہ کے راستے ۶/جنوری ۱۰۲۶ء کو سومناتھ پہنچ گیا، جہاں کے مضبوط مندر میں بیٹھے پجاری مسلمانوں پر ہنس رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی موت انھیں یہاں کھینچ لائی ہے اور سومناتھ کا دیوتا ان سب کو برباد کردے گا۔

محمود کی فوج نے شہر کا محاصرہ کرلیا۔ مندر میں موجود ہندوؤں کی فوج بڑی بہادری سے لڑی، لیکن شام کے سائے دراز ہوگئے اور جنگ کا کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔ دوسرے دن جمعہ تھا۔ اسلامی فوج کی جانب سے تیروں کی زبردست بارش کے آگے ہندو سینا جم نہ سکی اور قلعے کی فصیل سے ہٹ گئی۔ مسلمان سپاہی فصیل پر چڑھ گئے اور ان کے دل ہلا دینے والے نعرہ ہائے تکبیر سنائی دینے لگے۔ ہندوؤں نے اپنی پوری قوت مجتمع کر کے حملہ کیا اور مسلمانوں کو فصیل چھوڑنے پر مجبور کردیا۔ تیسرے دن پھر مسلمانوں نے قلعے کی فصیل پر قبضہ کرلیا اور گھمسان کی جنگ شروع ہوگئی۔ ہندو پجاریوں کی حالت دیدنی تھی۔ اب انھوں نے طرح طرح کے شعبدے دکھا کر، کبھی لالچ، کبھی خوف دے کر محمود کو بڑے مندر پر حملہ کیے بغیر لوٹ جانے کی کوشش کی، لیکن جب وہ اپنے فتح سومناتھ کے ارادے پر قائم رہا تو تشویش بڑھی۔ وہ بھاگ بھاگ کر مندر جاتے اور دیوتاؤں کے آگے گڑگڑاتے۔ پھر لوٹ کر مسلمانوں کے خلاف لڑنے لگتے۔ پروہتوں نے بڑی

سومناتھ مندر کی پرانی تصویر جب وہ کھنڈر تھا

کوشش کی کہ محمود کو زیادہ سے زیادہ دولت دے کر بت توڑنے سے باز رکھا جائے، خصوصاً اس بڑے بت کو بچا لیا جائے جس کے اندر زر و جواہر کا ایک خزانہ محفوظ تھا۔ اسی موقع محمود غزنوی نے یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا: ''میں بت فروش نہیں بت شکن کہلانا چاہتا ہوں۔''

اس اعلان کے ساتھ محمود نے ہندوستان کے سب سے بڑے بت کو توڑ ڈالا۔ یوں اس نے بت پرستی کی شہ پر ہونے والی تمام سیاسی فتنہ پردازیوں کا خاتمہ کردیا۔ اب ملک میں کوئی ایسا باقی بت نہ رہا جس کے بل پر ہندوستان کا کوئی راجا اور سردار سلطنت غزنی کے خلاف محمود کی زندگی میں کوئی سازش یا شورش برپا کرنے کی ہمت کرتا۔ اس کے ٹوٹ جانے سے سارا ہندوستان محمود کے ہاتھوں مفتوح ہوگیا۔ فتح سومناتھ ہندوستان کی تاریخ کا وہ اہم ترین سنگ میل ہے جس نے اسے عہد قدیم کی تاریکیوں سے نکال کر دورِ جدید کی روشنی کی طرف مائل کردیا۔

محمود کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے ہندوستان پر حملے دولت کے لالچ میں کیے۔ لیکن یہ سراسر غلط الزام اور تہمت ہے۔ اگر یہ بات درست ہوتی تو محمود سومناتھ کے بڑے بت کو نہ توڑتا، کیونکہ اسے بت نہ توڑنے کے بدلے میں بڑی رقم کی پیشکش کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ سومناتھ فتح کرنے کے بعد محمود کھمبایت اور بھڑوچ جیسے دولت مند شہروں کی طرف بھی نہیں گیا، حالانکہ وہ چاہتا تو وہاں پہنچ کر بے تحاشا دولت اکٹھی کرسکتا تھا۔ محمود نے سومناتھ میں رکنا تک گوارا نہیں کیا۔ وہ کچھ اور منصورہ کے راستے ملتان پہنچا اور واپس غزنی پہنچ گیا۔

سومناتھ کی فتح ایسا واقعہ تھا جس نے دنیا بھر میں دھوم مچا دی۔ خلیفہ بغداد نے محمود کو علم اور خط بھیجا جس میں اُسے

سومناتھ مندر از سرِنو تعمیر کے بعد

خراسان، ہندوستان، نیم روز اور خوارزم کا گورنر مقرر کیا گیا تھا اور اسے ''کہف الدولہ'' اور ''جمال الملت'' کے خطابات دیئے گئے۔ اس وقت سلطنت غزنویہ بے حد وسیع اور مستحکم ہو چکی تھی۔ اس میں خراسان، طبرستان، پورا پنجاب، موجودہ افغانستان، اصفہان، عراق، ہمدان، مشرق میں گنگا کا کنارہ، شمال میں دریائے آموتک اور جنوب میں بلوچستان کے ساحل تک کے علاقے شامل تھے۔

جدید بھارت مورخ، رومیلا تھاپر نے حال ہی میں سومناتھ کی تاریخ لکھی ہے، جس میں محمود غزنوی کے حملے کو تاریخ کے مختلف ادوار کے تناظر میں دیکھا ہے، اور یہ کہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے بارے میں لوگوں کی یادداشت کیا رہی ہے۔ سومناتھ مندر گجرات کے صوبے میں واقع ہے۔ زمانہ قدیم میں گجرات کی اہمیت یہ تھی کہ اس کی بندر گاہیں بیرونی تجارت کے لیے کھلی تھیں۔ آٹھویں عیسوی میں یہاں عرب تاجر آنا شروع ہو گئے تھے، سومناتھ کے مندر کی حیثیت اس وجہ سے زیادہ اہم تھی کہ اس کے قریب ورول کی بندرگاہ واقع تھی۔ اس وجہ سے مندر اور تاجروں کا ایک تعلق تھا۔ مندر کی دولت کو تجارت میں لگایا جاتا تھا اور تاجر عقیدت کے طور پر مندر کو چڑھاوے اور نذرانے دیتے، جس کی وجہ سے مندر میں دولت اکٹھی ہو گئی تھی۔

رومیلا تھاپر نے فارسی اور عربی ماخذوں کے علاوہ انگریز مورخوں کی تالیفات سے بھی مدد لی ہے۔ انگریزوں کے وقت میں سومناتھ کے واقعے کو کس زاویے سے پیش کیا گیا، مصنف نے لکھا ہے کہ ۱۸۴۲ء میں گورنر جنرل ایلن برو نے افغانستان پر حملے کے وقت یہ اعلان جاری کیا کہ برطانوی حکومت یہ تہیہ کر چکی کہ وہ سومناتھ کے وہ دروازے غزنی سے واپس ہندوستان لانا چاہتی ہے جو محمود حملے کے بعد اپنے ساتھ لے گیا تھا اور جو اَب اُس کے مقبرے میں لگے ہوئے ہیں۔ اس اعلان کا مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات کو ہوا دینا تھا۔ بہرحال دروازے واپس آئے، مگر جلد ہی یہ ثابت ہو گیا کہ یہ ہندوستانی دستکاروں کے بنائے ہوئے نہیں تھے، اس لیے انھیں آگرہ کے ایک گودام میں رکھ کر فراموش کر دیا گیا۔

اٹھارویں صدی میں یورپی مورخوں نے محمود کے حملوں کو خراسان اور وسط ایشیا کے تناظر میں دیکھا تو ہندوستان کے سترہ حملے تاریخی طور پر زیادہ اہم نہ رہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے دوران ہندوستان میں محمود کے حملوں کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جنگوں کے نقطہ نظر سے دیکھا گیا۔ ایک نقطہ نظر یہ تھا کہ یہ جنگیں مذہبی نہیں تھیں، بلکہ محض لوٹ مار، ہوس، زر اور مال غنیمت کے حصول کے لیے کی گئیں۔

۱۹۲۰ء کی دہائی میں جب ہندوستان میں ہندو مسلم فرقہ آرائی زوروں پر تھی، اُس وقت مسلمانوں نے محمود کو اپنا ہیرو بتایا، جبکہ ہندوؤں نے اُسے لٹیرا اور ڈاکو قرار دیا۔ نتیجے میں ہندو قوم پرستوں نے تمام مسلمانوں کو غیر ملکی قرار دیا اور اُن کے حملوں کو ہندوؤں کے لیے باعث ذلت۔ اس ماحول میں سومناتھ کا مندر ہندو قوم پرستوں کے لیے مذہبی علامت کے طور پر اُبھرا۔ چنانچہ اسی مذہبی جذبے کے تحت ۱۹۵۱ء میں آزادی کے بعد دوبارہ تعمیر کروائی گئی تاکہ شکست کے داغ کو دُور کیا جائے جو اُن کی تباہی سے لگا تھا۔

سترھواں حملہ۔ ۱۰۲۷ء

آخری حملہ سلطان محمود نے ہندوستان کے ان جاٹوں پر کیا، جنھوں نے سومناتھ سے واپسی میں بلاوجہ اس کی مزاحمت کی تھی۔ محمود نے اسی وقت اپنے دل میں مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ کسی وقت وہ سندھ کے ان جاٹوں کا قلع قمع ضرور کرے گا، تاکہ سندھ میں پھر کسی مخالف طاقت کے سر اٹھانے کا موقع باقی نہ رہے۔ چنانچہ ۱۰۲۷ء میں محمود ایک کثیر لشکر لے کر ملتان پہنچا اور اس نے حکم دیا کہ ایک ہزار چار سو کشتیاں اس قسم کی تیار کی جائیں کہ ہر ایک کشتی میں تین تین لوہے کے بڑے برچھے ہوں۔ ہر ایک کے اگلے حصے میں ایک برچھا اور

دائیں بائیں ایک برچھا لگایا جائے اور وہ اس قدر تیز ہوں کہ اگر سخت سے سخت چیز بھی ماری جائے تو وہ اس کو چیر دیں۔

جب وہ کشتیاں تیار ہو گئیں تو محمود نے انھیں دریائے سندھ میں ڈال کر حکم دیا کہ ہر ایک کشتی پر بیس بیس سپاہی سوار ہوں جو تیر و کمان، ڈھال اور نفط اندازی کے تمام سامان سے مسلح ہوں۔ اس طرح اس نے اٹھائیس ہزار فوج کو ان کشتیوں میں سوار کر دیا اور باقی فوج کو دریائے سندھ کے دونوں بازوؤں سے پیدل روانہ ہونے کا حکم دیا۔

سندھی جاٹوں کو جب یہ معلوم ہوا تو انھوں نے اپنے بال بچوں کو کشتیوں میں بٹھا کر کسی جزیرے میں محفوظ کر دیا اور خود چار ہزار یا آٹھ ہزار کشتیاں لے کر محمود کے مقابل ہوئے۔ جیسے ہی ان کی کشتیاں محمود کی کشتیوں کے مقابل ہوئیں تو سلطان محمود کی بحری فوج نے ان پر تیروں کی بارش شروع کر دی اور مٹی کے تیل سے ان کی کشتیوں میں آگ لگا دی۔ اس پر بھی جو آگے بڑھے، ان کی کشتیوں کو تیز آہنی شاخوں نے چیر کر دریا میں غرق کر دیا۔

سندھی جاٹ بہادری کے باوجود کثرت سے مارے گئے۔ ان کی کشتیاں غرق کر دی گئیں۔ جو بھاگ کر دریا کے کنارے پر اُترے، محمود کی بری فوج نے ان کا صفایا کر دیا۔ محمود کی فوج ان جاٹوں سے لڑتی بھڑتی اس جزیرے میں پہنچ گئی جہاں انھوں نے اپنے بال بچوں کو محفوظ کر رکھا تھا۔ محمود کی فوجوں نے جزیرے میں داخل ہو کر سندھی جاٹوں کے اہل و عیال کو گرفتار کر لیا۔ بہت سا مال غنیمت لے کر سلطان محمود اس جزیرے سے ملتان واپس آیا اور ۱۰۲۸ء میں غزنی واپس چلا گیا۔

محمود کی وفات

جاٹوں کی اس مہم کے دوران محمود کو ملیریا ہو گیا، جس نے رفتہ رفتہ دق کی شکل اختیار کر لی۔ محمود نے بیماری کا مقابلہ بہادری سے کیا اور اپنے شاہی فرائض میں خلل نہ آنے دیا۔ حتیٰ کہ اپنی سلطنت کا دورہ بھی ترک نہ کیا مگر اس کی صحت خراب ہوتی چلی گئی۔ جب اسے محسوس ہوا کہ اس کا آخری وقت آن پہنچا تو اس نے شاہی خزانے کے تمام ہیرے جواہرات، قیمتی اشیاء یہاں تک کہ گھوڑے اور ہاتھی بھی نکلوا کر دیکھے۔ جب ساری اشیاء اس کے سامنے سجادی گئیں تو انھیں دیکھ کر محمود غزنوی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بقول مورخین، شاید انھیں دیکھ کر لڑائیوں کے ہولناک منظر، زندگی اور موت کی کشمکش، عورتوں اور بچوں کی چیخ و پکار کے نقشے، جو اس کے ذہن پر نقش تھے، اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے۔ اس نے یہ قیمتی اشیاء کچھ تو لوگوں میں تقسیم کروا دیں اور باقی بیت المال میں جمع کروا دیں۔ اس موقع پر محمود آب دیدہ ہو گیا اور رقت کی حالت میں یہ عبرت انگیز اشعار اس کی زبان پر آ گئے:

ہزار قلعه کشادم به یک اشارت دست
بسے مصاف شکستم به یک اشارت پائے
چومرگ تاختن آورد، ہیچ سود نه داشت
بقا بقائے خدا است و ملک ملک خدائے

(''میں نے ہاتھ کے ایک اشارے سے ہزار قلعے فتح کیے اور پاؤں کے ایک اشارے سے بہت سے محاذ جنگ جیت لیے لیکن جب موت نے مجھ پر حملہ کیا تو کچھ بھی کام نہ آیا۔ بے شک بقا صرف اللہ کی ذات کو ہے اور تمام ملک اسی کا ہے''۔)

رفتہ رفتہ مرض نے شدت اختیار کر لی۔ ایک ہفتے تک بستر علالت پر رہنے کے بعد اس عظیم سپہ سالار نے ۲۳ ربیع الثانی ۴۲۱ھ یعنی ۳۰ اپریل ۱۰۳۰ء کو اپنے رب کے بلاوے پر لبیک کہا۔ انتقال کے وقت اس کی عمر ۶۳ سال کی تھی۔ اسی شام کو نماز عشاء کے وقت اسے اپنی پسندیدہ تفریح گاہ ''فیروزی باغ'' میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ اس کا مزار موجودہ غزنی شہر سے دو میل شمال کی جانب ہے۔ آج کل اسے ''روضہ'' کہتے ہیں۔ اس کے فرزند سلطان مسعود نے اپنے نامور والد کی قبر پر شاندار مقبرہ تعمیر کروایا جو جلد ہی خاص و عام کی زیارت گاہ بن گیا۔ ◆◆◆

میری نماز کا وقت ہو گیا

حبیبہ انجم

معمول کا جملہ اس کی سماعت سے ٹکرا کر اسے کوفت میں مبتلا کر گیا۔ وہ ابھی کلاس ختم کر کے اسٹاف روم میں آئی تھی۔ بریک ختم ہونے کو تھی۔ وہ چونکہ فیل ہو جانے والے طلبا کی اضافی کلاس لیا کرتی تھی اس لیے جب تک وہ اسٹاف روم میں پہنچتی، بریک کا وقت تقریباً ختم ہو چکا ہوتا۔ دس منٹ نماز کے لیے مختص تھے۔ اس سمیت زیادہ تر لوگ بیٹھے رہتے اور پھر اگلی کلاس کے دس منٹ میں نماز پڑھتے۔ مس فہمیدہ یہ جملہ باقاعدگی سے ادا کرتیں۔ وہ چالیس بیالیس سال کی غیر شادی شدہ اور نماز روزے کی پابند انتہائی امانت دار خاتون تھیں۔ کبھی اسٹاف کہیں مل کر چلا جاتا تو وہ یہی راگ الاپتی رہتیں۔ نجانے کیوں اُسے ہمیشہ لگتا جیسے وہ اپنی عبادت کی نمائش کرنا چاہتی ہوں۔ وہ کئی بار اس سوچ پر اپنے آپ کو سرزنش بھی کرتی کہ کسی کی نیت کا حال ہم کیسے جان سکتے ہیں؟ پر بُرا ہو شیطان کا جو کبھی اچھی سمت چلنے نہیں دیتا۔ آج اس کا دماغ اتنا گرم تھا کہ اس جملے پر تو جیسے پھٹ ہی پڑی۔

"مس فہمیدہ اس اسکول میں کیا صرف آپ مسلمان ہیں یا صرف آپ کو ہی اپنی نماز کی فکر رہتی ہے۔ باقی بھی تو پڑھتے ہیں، لیکن آپ ہر وقت "میری نماز کا وقت ہو گیا" کا راگ آلاپتی رہتی ہیں۔ ایک لمحے کو ان کا چہرہ جیسے پھیکا پڑا لیکن پھر فوراً ہی انھوں نے خود پر قابو پا لیا "آپ ٹھیک کہتی ہیں روشانے۔ سب مجھ سے زیادہ اچھے مسلمان اور پابند صلوٰۃ ہیں۔ بس میں اپنی نماز کی حفاظت کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ اس سے پہلے کہ وہ دن آئے کہ جب کوئی دوسرا کہے مس فہمیدہ کی نماز کا وقت ہو گیا۔ تب میں ادا کرنے کے قابل نہیں ہوں گی۔" اپنی بات مکمل کر کے ایک نرم مسکراہٹ کے ساتھ وہاں سے چلی گئیں۔

"پتہ نہیں کیا فلاسفی جھاڑ کر گئی ہیں۔" روشانے بڑبڑاتے ہوئے اپنا لنچ کرنے لگی۔ باقی سب بھی اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔

موسم بدل رہا تھا۔ سردی کا زور ٹوٹتے ہی اسکول کے اوقات کار بھی تبدیل ہو گئے۔ اب کسی کو بھی اسکول میں نماز ادا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ آج صبح روشانے کو اسکول پہنچتے ہوئے دیر ہو گئی۔ اس لیے وہ اسٹاف روم جانے کے بجائے سیدھی جماعت میں چلی گئی۔ بریک ہونے پر اسٹاف روم آئی تو پتہ چلا کہ آج خلاف معمول مس فہمیدہ چھٹی پر ہیں۔ ابھی وہ وجہ پوچھنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ آپا جی نے آ کر ان کے انتقال کی خبر دی اور کہا کہ پرنسپل نے چھٹی کے بعد سب کو جانے کے لیے کہا ہے۔ سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ کسی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہیں۔ خاموشی اور بوجھل دل کے ساتھ سب کلاس کی طرف چل پڑے۔ چھٹی کے بعد سب جب ان کے گھر پہنچے تو ظہر کا وقت ہو چکا تھا۔ مس فہمیدہ کو غسل دیا جا چکا تھا۔ سفید کفن میں خاموش پُرسکون چہرہ۔ وہ کتنی دیر تک ان کے چہرے کو خاموشی سے دیکھے گئی۔

"سب آخری دیدار کر لیں۔ نماز جنازہ کا وقت ہو گیا۔" کسی نے آواز لگائی۔

"اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جب کوئی دوسرا کہے گا مس فہمیدہ کی نماز کا وقت ہو گیا اور میں ادا کرنے کے قابل نہیں ہوں گی۔" آگاہی کا در وا ہوا اور ساتھ ہی روشانے کو یاد آیا

"میری نماز کا وقت ہو گیا۔"

ڈاکٹر فیاض ہرل
fayyazherl24@gmail.com
nafsiyatkainaat.com

لے پالک بچوں کا المیہ

گود لینا بچوں کا کھیل نہیں

بعض اوقات اولاد ہی نہیں، والدین کو بھی شدید ذہنی تناؤ کا سامنا کرنا پڑتا ہے

سوال: مجھے نفسیات کے مختلف موضوعات پر آپ کے مضامین پڑھنے کا اتفاق ہوتا رہا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ میرا مسئلہ سمجھ کر کوئی مفید مشورہ دے سکیں گے۔ میں سوچتی ہوں کہ اپنی کہانی کا آغاز کہاں سے کروں کیونکہ میری زندگی کا المیہ میری پیدائش کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا۔ میرے والد اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ دادا کی وفات کے بعد انھوں نے اپنے بہن بھائیوں کو پالا۔ سب اُن کا احترام کرتے اور گھر میں اُن کا حکم والد کی طرح ہی چلتا تھا۔ میرے چھوٹے چچا اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ اولاد کی کمی کی وجہ سے بہت دلگرفتہ اور اُداس رہتے تھے۔ جب میں نے پانچ بہن بھائیوں کے بعد دُنیا میں آنکھ کھولی تو والد صاحب نے فوراً چچا کی محرومی کا ازالہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

میری حقیقی والدہ اور میری چچی دونوں اِس فیصلے کے حق میں نہیں تھیں۔ چچی کا ارادہ تھا کہ اگر گود لینا ہی ہے تو کسی یتیم بچے کو لیا جائے۔ ان کا کمزور احتجاج کسی نے نہ سُنا۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو چچا کے گھر میں اُن کی بیٹی کی حیثیت سے پرورش پا رہی تھی۔

بچپن کے چند برس پر مشتمل وقت میری زندگی کا سنہرا دور تھا۔ میں چچا چچی کو ابّو امی کہتی اور حقیقی ماں باپ ہی سمجھتی۔ چچا مجھے دل و جان سے چاہتے اور میری ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کرتے۔ چچی نے بھی یہ فیصلہ ناچار قبول کر لیا۔ اُن کا عمومی رویہ خاصا مناسب تھا۔

چچا ایک سرکاری محکمے میں ملازم تھے اور اُن کی پوسٹنگ دور دراز علاقوں میں رہی۔ قریبی رشتہ داروں سے ملنے کا اتفاق سال میں ایک دو دفعہ عیدوں اور تقریبات پر ہی ہوتا۔ بارہ برس کی عمر تک میں چچا چچی کو ہی اپنے حقیقی والدین سمجھتی رہی۔ پھر ایک روز یہ انکشاف میرے سر پر کسی ایٹم بم کی مانند گرا کہ میرے حقیقی والدین کون ہیں؟ مجھ سے تین چار برس بڑی ایک کزن سے میری ہر وقت ٹھنی رہتی تھی۔ مجھے یہ لگتا تھا کہ وہ مجھ سے اِس لیے حسد کرتی ہے کیونکہ میں والدین کی اکلوتی اولاد اور اُن کی آنکھ کا تارا ہوں۔ ایک روز اُس کے سامنے جب میں نے بچکانہ انداز میں شیخی ماری کہ والدین میری کوئی فرمائش نہیں ٹالتے تو اُس نے یہ کہہ کر میرے ہوش اُڑا دیے کہ تمہارے اصل والدین تو وہ ہیں جنھیں تم تایا ابّو اور تائی اماں کہتی ہو۔

شروع میں، میں نے اُس کی بات کو جھوٹ سمجھا حتیٰ کہ جب میرے بار بار اصرار پر چچی نے اِس بات کی تصدیق کر دی، تب بھی مجھ پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ اصل مسئلہ تب شروع ہوا جب اگلے چند برس میں معجزانہ طور پر چچا کے ہاں یکے بعد دیگرے بیٹا اور بیٹی کی پیدائش ہوئی۔ بس اِس کے بعد گھر کے حالات بدل گئے۔ چچی کا رویہ آہستہ آہستہ میرے ساتھ تلخ اور توہین آمیز ہوتا گیا۔ چچا یہ سب دیکھ کر کڑھتے لیکن اپنی نرم طبیعت کے باعث گھر کے ماحول پر زیادہ اثر انداز نہیں ہو سکتے تھے۔

چچی نے پھر مجھے اپنے حقیقی والدین کے ہاں بھجوانے کے لیے چچا پر دباؤ ڈالا۔ آخر چچا بھی مجبور ہو گئے۔ انھوں نے پہلے مجھ سے اور پھر ابا سے بات کی۔ سو اِدھر میں نے گریجوایشن مکمل کی، اُدھر میں کسی کٹی پتنگ کی طرح اپنے حقیقی والدین کے گھر واپس آ گئی۔

جب سے مجھ پر اپنے حقیقی والدین کا انکشاف ہوا تھا میرے اندر ہر وقت کسک اور ایک خلش کی لہر سی چلتی رہتی۔ کبھی مجھے یہ خیال بھی آتا کہ شاید اپنے خونی رشتوں میں آ کر میرے اندر کا خلا بھر جائے اور میری بے قرار روح کو سکون آ جائے۔ البتہ یہاں آنے کے بعد مجھے لگتا ہے کہ یہ میری خام خیالی تھی۔

آپ یقین کیجیے مجھے اپنے حقیقی والدین کے گھر میں اجنبیت محسوس ہوتی ہے۔ والدین کا مجھ سے اور دوسرے بچوں سے لگاؤ میں واضح فرق محسوس ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ کوشش کرتے ہیں کہ میری دلجوئی کریں لیکن مجھے اُن کی یہ کوششیں مصنوعی لگتی ہیں۔ میں اکثر اپنی والدہ سے جھگڑتی ہوں کہ اُنھوں نے مجھے دوسروں کے سپرد کیوں کیا؟ وہ اپنی بے چارگی کا اظہار کر دیتی ہیں۔

مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے میری شخصیت دو حصّوں میں تقسیم ہو گئی ہے اور یہ دونوں حصّے ہی مجھے اجنبی لگتے ہیں۔ کبھی ایسا لگتا ہے، جیسے پوری دنیا میں کوئی جگہ ایسی نہیں جسے میں اپنا گھر کہہ سکوں۔ رشتوں پر سے میرا اعتبار اُٹھ گیا ہے۔ جنھوں نے مجھے پالا، اُنھوں نے مجھے چھوڑ دیا اور جنھوں نے جنم دیا، وہ پوری طرح قبول نہیں کر پا رہے۔

ڈاکٹر صاحب، کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ مجھے کب اور کیسے سکون ملے گا؟

خالدہ جمیل

جواب: خالدہ بی بی، آپ کا طویل خط مِن و عَن اِس لیے شائع کیا گیا تاکہ تمام قارئین یہ اندازہ کر سکیں کہ بعض دفعہ خاندان کے بزرگ حضرات مناسب سوچ بچار اور مشورے کے بغیر جو فیصلے کر لیتے ہیں، ان کی وجہ سے کس قدر تکلیف دہ نتائج جنم لے سکتے ہیں۔

بظاہر ایسے حالات میں بزرگوں کی طرف سے یہ جواز سننے کو ملتا ہے کہ فیصلہ کرتے ہوئے اُن کی نیت اچھی تھی۔ غور طلب نکتہ یہ ہے کہ کوئی بھی فیصلہ کرتے ہوئے فقط نیت کا اچھا ہونا کافی نہیں، ضروری تحقیق، سوچ بچار اور مشورہ لینا بھی اتنا ہی اہم ہے۔ ضروری تحقیق و تفتیش کے بغیر کیا گیا فیصلہ اچھی نیت کے باوجود غلط ثابت ہو سکتا ہے۔

آپ نے بڑی ہمت کی کہ اپنے خیالات و احساسات

منظرِ عام پر لائیں۔ میں سمجھ سکتا ہوں کہ یہ کام کرنے سے پہلے آپ کو اپنے آپ سے جنگ لڑنا پڑی ہو گی۔ ممکن ہے آپ کی اِس کوشش سے شاید چند لوگوں کی زندگی المیہ بننے سے بچ جائے۔ میں اِس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے چند باتیں قارئین کے گوش گزار کرنا چاہوں گا۔

۱۔ بچّہ گود لینا بظاہر اچھا عمل ہے اور اِس سے کسی انسان کے احساسِ محرومی کی تشفی ہو سکتی ہے لیکن پہلے اِس کے نتائج و عواقب ضرور مدِّنظر رکھنے چاہئیں۔

۲۔ ایسا فیصلہ کرنے والے دونوں میاں بیوی کا اِس فیصلے

پر دل سے مطمئن ہونا ضروری ہے۔ مجبوری کے عالم میں کیا گیا فیصلہ بعد میں نبھانا مشکل ہو جاتا ہے۔

۳۔ ایسا بچّہ گود لینا جس کے والدین نہ صرف حیات بلکہ صاحبِ استطاعت بھی ہوں اور آس پاس بھی زندگی گزار رہے ہوں، بچے کی زندگی پر گہرے منفی اثرات مرتب کر سکتا ہے۔

بچے کو اپنے حقیقی ماں باپ میں بھی قدرتی کشش محسوس ہو سکتی ہے جبکہ جن لوگوں نے اُس کی پرورش کی ہو اُن سے بھی لگاؤ ہو سکتا ہے۔ سو اِس صورتِ حال میں بچے میں تقسیم شدہ شخصیت (Split personality) یا متضاد رجحانات پر مبنی اُلجھی شخصیت (Complexed personality) پیدا ہونے کے قوی امکانات ہیں جو ساری عمر کے لیے روگ بن سکتے ہیں۔

۴۔ نفسیاتی تحقیقات میں دیکھا گیا ہے کہ بچہ گود لینے کے عمل کو خفیہ رکھنے کی کوشش کرنا اور تمام عمر یہ ثابت کرتے رہنا کہ "بچہ ہمارا ہے" مختلف نفسیاتی پیچیدگیاں پروان چڑھا سکتا ہے۔ اگر صورتِ حال کو واضح اور صاف انداز میں قبول کیا جائے تو اِس سے بچے کے اپنے سوتیلے والدین (Adoptive parents) اور دوسرے لوگوں سے تعلقات میں ابہام (Confusion) پیدا نہیں ہوتا۔ بچے کو واضح انداز میں معلوم ہونا چاہیے کہ اس کے حقیقی والدین کون تھے یا ہیں۔ اس نکتے

کو محبت آمیز انداز میں اُجاگر کیا جائے۔ اِس نکتے کو کسی دانا نے بہت خوبصورت انداز میں اِس طرح پیش کیا ہے کہ

''Family Is Made By Love.... Not DNA.''

۵۔ بچہ گود لینے کو چند والدین اِس لیے بھی چھپائے رکھتے ہیں کیونکہ انھیں یہ خوف ہوتا ہے کہ اگر بچے کو حقیقت معلوم ہو گئی تو وہ انھیں چھوڑ کر اپنے حیاتیاتی والدین (Biological Parents) کے پاس چلا جائے گا۔ سائنسی تحقیقات کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ خوف بے بنیاد ہے کیونکہ بچوں میں اپنے حیاتیاتی والدین کے بارے میں معلومات حاصل کرنے یا انھیں ملنے کا تجسس تو ضرور ہوتا ہے لیکن ایسی مثالیں بہت کم ہیں کہ بالغ ہونے پر وہ اُن کے پاس مستقل رہنے کو ترجیح دیں۔

۶۔ گود لیے گئے بچے کا اپنے حیاتیاتی والدین کے بارے میں متجسس ہونا فطری عمل ہے۔ بسا اوقات اِس فطری تجسس کے نتیجے میں پوچھے گئے سوالات پر والدین غلط فہمی کا شکار ہو کر اِسے ناشکر گزاری پر مبنی رویّہ سمجھ سکتے ہیں۔ اگر والدین منفی ردِعمل کا شکار ہو جائیں تو وہ بچے سے ایسی ناگوار باتیں کر سکتے ہیں جیسے ''تمھیں اُن کو یاد کرنے کی کیا ضرورت ہے جبکہ تمہاری پرورش اِس سے بہت بہتر انداز میں ہو رہی ہے جیسی وہ تمہاری کر سکتے تھے''۔

اگر اِس کے برعکس والدین اِس موضوع سے گریز کرنے کے بجائے خود اُسے ضروری معلومات فراہم کر دیں (جو اُن کے علم میں ہوں) یا اگر بچہ اپنے حیاتیاتی والدین کو ڈھونڈنے یا ملنے کی خواہش کا اظہار کرے تو خود اُس کی حوصلہ افزائی کریں۔ بچہ کچھ عرصے کی تلاش و تجسس کے بعد اِس مرحلے سے خود بخود ہی باہر نکل آتا ہے۔

خالدہ بی بی، آپ سمجھ گئی ہوں گی کہ ایسے حالات میں انسان کی طبیعت میں کس طرح کے منفی رجحانات پیدا ہو سکتے ہیں۔ شخصیت کی اِن پیچیدگیوں کو حل کرنے کی کوشش کرنا بلاشبہ طویل عمل ہے لیکن اِن رجحانات کو درست طریقے سے پہچان لینا بھی حل کی طرف ایک مثبت اور بڑا قدم ہے۔ اِس حوالے سے درج ذیل نکات ذہن نشین کر لیجیے۔

(الف) آپ کی کہانی سے عیاں ہے کہ آپ بیشتر وقت شدید احساسِ محرومی میں مبتلا رہی ہیں۔ اِس وجہ سے آپ کے اندر خود ترسی (Self Pity) کا جذبہ جڑ پکڑ چکا۔ یہی وہ منفی جذبہ ہے جو آپ کی شخصیت اور صلاحیتوں کو گھن کی طرح کھا رہا ہے۔ ایک صحت مند زندگی گزارنے کے لیے سب سے پہلے آپ کو زندگی کے بارے میں اپنا زاویہ نظر تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔

(ب) بہترین لائحہ عمل یہ ہے کہ آئندہ زندگی میں ہمدردی اور توجہ حاصل کرنے کے لیے دوسروں کی طرف دیکھنا چھوڑ دیں۔ اپنے آپ کو دوسروں کی ذہنی اور جسمانی محتاجی سے نکالیں۔ مسلسل شکوہ و شکایت کرتے رہنے سے شاید انسان کو کچھ ہمدردی اور توجہ مل جائے مگر اِس سے تسلی و تشفی ملتی ہے اور نہ ہی شخصیت کا خلا پُر ہوتا ہے۔

(ج) حد سے زیادہ توجہ کی خواہش بیمار ذہن کی علامت ہے۔ آپ خود کو مظلومیت اور خود ترسی کی منفی لذت سے نکال کر اپنی زندگی کے لیے کوئی مثبت لائحہ عمل تیار کیجیے۔

(د) آپ ہر وقت سوچتی رہتی ہیں کہ دوسروں نے آپ کے لیے کیا کیا۔ اِس سوچ سے نکل کر اپنے آپ سے پوچھیے کہ آپ خود زندگی میں اپنے لیے کیا کرنا چاہتی ہیں۔ گزرے وقت کا ماتم کرنے کے بجائے سوچیے کہ آپ آنے والے وقت سے کیا خوشیاں اور کامیابیاں کشید کر سکتی ہیں۔

(ہ) آپ جن حالات سے گزری ہیں اُن میں طبیعت میں مختلف طرح کے منفی جذبات مثلاً رد کیے جانے کا احساس، احساسِ کمتری، احساسِ محرومی، غم و غصہ وغیرہ پیدا ہونے کا قوی امکان ہوتا ہے۔ یہ سب منفی جذبات آپ کی زندگی کے راستے کی اصل رکاوٹ ہیں۔ اِن سے نجات کے لیے اپنا ارادہ مضبوط کرنا چاہیے۔

(و) درجِ بالا مقاصد حاصل کرنے کے لیے آپ کسی

کلینیکل سائیکالوجسٹ سے سائیکوتھراپی کے سیشنز کروائیے۔ اِس طریقہ علاج میں بات چیت کے ذریعے انسان کی شخصیت کے منفی اور اُلجھے پہلوؤں کا تعین کیا جاتا اور مختلف ذہنی و جسمانی ورزشوں سے اُن کے اثرات کم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ علاج اگرچہ طویل بھی ہو سکتا ہے جس میں چند ماہ سے لے کر ایک دو برس کا عرصہ لگ سکتا ہے لیکن آپ ماضی کے غبار سے چھٹکارا پا کر اپنی زندگی کو نئی بنیادوں پر شروع کرنے کے قابل ہو سکیں گی۔

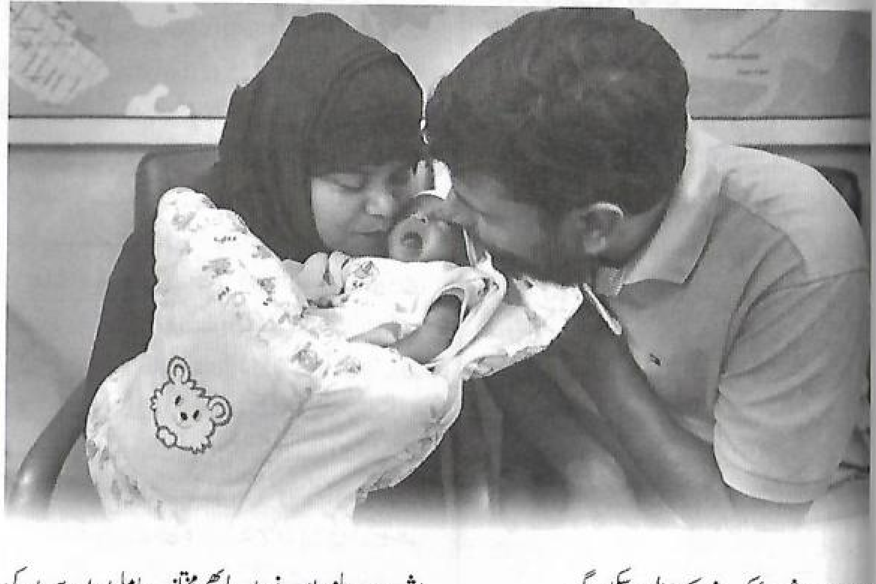

سوال: ڈاکٹر صاحب، میں پنجاب کے ایک پسماندہ دیہاتی علاقے سے تعلق رکھتا ہوں۔ اپنے خاندان میں پہلا فرد ہوں جس نے بی اے تک تعلیم حاصل کی۔ ہمارے علاقے میں قابل ماہرین نفسیات کی شدید کمی ہے۔ اِس لیے اپنی بہن کا مسئلہ ای میل کے ذریعے آپ تک پہنچا رہا ہوں۔

میری بہن کی عمر ۲۸ سال ہے۔ اُسے گزشتہ دو برس سے وقتاً فوقتاً بے ہوشی کے دورے پڑتے رہتے ہیں۔ بے ہوشی کے دوران پورے جسم کو جھٹکے لگتے ہیں جو اکثر ۱۰ سے ۱۵ منٹ تک جاری رہتے ہیں۔ اِس دوران اُس کی سانس کی رفتار تیز ہو جاتی ہے، منہ سے طرح طرح کی آوازیں نکلتی ہیں، لیکن پوچھنے پر کسی بات کا جواب نہیں دیتی۔ کبھی کبھی تو یہ اتنے شدید ہوتے ہیں کہ اُس کا جسم چارپائی پر دو فٹ تک اُچھلتا ہے اور تین چار لوگ بھی بمشکل اُسے کنٹرول کر پاتے ہیں۔

میرے گھر والوں کا خیال ہے کہ بہن پر جنات و اشرار کا اثر ہے۔ ملنے ملانے والے بھی مختلف عاملوں اور پیروں کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ گھر والے چند عاملوں کے پاس لے کر بھی گئے، جنھوں نے کافی خرچہ کروانے کے بعد دوروں کو شیاطین کی کارستانی ہی قرار دیا۔ اُن کے عمل کے بعد اگر وقتی طور پر دورے رُک بھی جاتے تو چند دن بعد پھر شروع ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب، میں نے بی اے میں نفسیات کا مضمون پڑھا۔ میرا خیال ہے کہ اُس کے دوروں کی نوعیت ذہنی دباؤ

سے متعلق ہے۔ اصل میں دو برس قبل میرے والدین نے بہن کا رشتہ اُس سے چودہ برس چھوٹے ایک کزن سے ٹھہرا دیا۔ بہن نے اِس رشتے پر ظاہری طور پر تو کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا، البتہ میرا اندازہ یہی ہے کہ وہ اِس رشتے کی وجہ سے ناخوش ہے۔ آپ ہماری راہنمائی کیجیے کہ کیا میرا اندازہ درست ہے؟ اگر ایسا ہے تو ہمیں اُس کے علاج کے لیے کیا کرنا چاہیے۔

محمد عبدالسلام

جواب: آپ نے اپنی بہن کے دوروں کی جو تفصیلات لکھی ہیں وہ نفسیاتی دورے (Psychogenic fits) کی طرف ہی اشارہ کرتی ہیں۔ اِن دوروں کو کسی زمانے میں ہسٹیریا (Hysteria) کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ موجودہ نفسیاتی سائنس میں اِس کا نام ''اضطرابِ تعارفی'' (Dissociative disorder) ہے۔ اِن دوروں کا علاج کیسے کیا جائے؟ اس پر بات کرنے سے پہلے اِن کی وجوہ وضاحت سے سمجھ لیجیے۔

(۱) نفسیاتی دورے مرگی (Epileps) کے دوروں سے الگ بیماری ہے۔ مرگی کے دورے کے دوران مریض مکمل طور پر ہوش وحواس سے بیگانہ ہو جاتا اور آس پاس کی آوازیں سننے اور اُن پر ردِعمل دینے کے قابل نہیں رہتا۔ اِس کے برعکس نفسیاتی دوروں میں مریض گہری بے ہوشی میں نہیں جاتا اور آوازیں بھی سُن سکتا ہے۔

(۲) نفسیاتی دوروں کا علاج عام طور پر مرگی کی نسبت آسان اور مختصر ہے۔ اگر درست طریقے سے علاج کیا جائے تو چند ہفتوں میں ہی مکمل صحت یابی کا امکان ہوتا ہے۔ البتہ اگر علاج معالجے میں غلط طریقے استعمال کیے جائیں تو مرض طوالت کا شکار ہو سکتا ہے۔

(۳) نفسیاتی دوروں کو بیماری سمجھنے کے بجائے جنات و اشرار کا اثر سمجھنا ہمارے معاشرے کا جاہلانہ توہم ہے۔ ایک اہم سوال یہ ہے کہ آخر جنات و شیاطین کا اثر فقط کم تعلیم یافتہ اور غریب طبقوں پر ہی کیوں ہوتا ہے؟ معاشرے کے اعلیٰ

محاصرہ

مرے غنیم نے مجھ کو پیام بھیجا ہے
کہ حلقہ زن ہیں مرے گرد لشکری اُس کے

فصیلِ شہر کے ہر برج، ہر منارے پر
کماں بدست ستادہ ہیں عسکری اُس کے

وہ برق لہر بجھا دی گئی ہے جس کی تپش
وجودِ خاک میں آتش فشاں جگاتی تھی

بچھا دیا گیا بارود اس کے پانی میں
وہ جوئے آب جو میری گلی کو آتی تھی

سبھی دریدہ دہن اب بدن دریدہ ہوئے
سپردِ دار و رسن سارے سر کشیدہ ہوئے

تمام صوفی و سالک، سبھی شیوخ و امام
امیدِ لطف پہ ایوانِ کج کلاہ میں ہیں

معززینِ عدالت حلف اٹھانے کو
مثالِ سائلِ مبرم نشستہ راہ میں ہیں

اسی لیے تو جو لکھا تپاکِ جاں سے لکھا
جبھی تو لوچ کماں کا، زباں تیری کی ہے

میں کٹ گروں یا سلامت رہوں، یقیں ہے مجھے
کہ یہ حصارِ ستم کوئی تو گرائے گا

تمام عمر کی ایذا نصیبوں کی قسم
مرے قلم کا سفر رائگاں نہ جائے گا

احمد فراز

تعلیم یافتہ طبقات اِس اثر سے محفوظ کیوں رہتے ہیں؟

(۴) ماضی میں چھوت کی بیماریوں (Communicable Diseases) مثلاً طاعون، چیچک، تپ دق وغیرہ کی وجوہ معلوم نہیں تھیں، لہٰذا انھیں بھی بدروحوں اور شیاطین کے اثرات کا نتیجہ سمجھا گیا۔ البتہ جب جراثیم دریافت ہوئے تو تصور یکسر بدل گیا۔ آج ایک عام دیہاتی بھی ٹی بی کو بدروحوں کی کارستانی کے بجائے بیماری ہی سمجھتا ہے۔

(۵) نفسیاتی دورے جنم لینے کا بنیادی سبب حد سے بڑھا ہوا ذہنی دباؤ ہے۔ ذہنی دباؤ جب انسان کی قوتِ برداشت سے بڑھ جائے اور وہ اپنے اظہار کے لیے کوئی مناسب راستہ نہیں پائے تو مختلف جسمانی علامتوں کے ذریعے اپنے اظہار کا راستہ تلاش کر لیتا ہے۔

(۶) اپنے خیالات و جذبات کا مناسب اظہار نہ کر پانا ہمارے دیہی اور کم تعلیم یافتہ علاقوں کے رہائشی افراد میں نمایاں ہے، خصوصاً خواتین کے طبقے میں۔ اِس لیے نفسیاتی دوروں کی بیماری معاشرے کے اِس طبقے میں نظر آتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے میں یہ بیماری خال خال ہی نظر آئے گی اور وہ بھی فقط کچھ مخصوص حالات کے زیرِ اثر۔

(۷) نفسیاتی دباؤ مختلف جسمانی علامتوں کے ذریعے اپنا اظہار کرتا ہے، مثلاً جسم کا ایک حصّہ اچانک مفلوج ہو جانا، مریض کی بینائی یا حسِ سماعت کا اچانک کھو جانا، بے ہوشی کے دورے، جسم کو شدید جھٹکے لگنا، رعشہ یا قوتِ گویائی متاثر ہونا وغیرہ۔

(۸) نفسیاتی علامات کے بارے میں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ انھیں مریض خود اپنے ارادے سے پیدا نہیں کرتا بلکہ یہ لاشعور کی سطح پر خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں۔ اِس لیے ایسے مریض کے بارے میں یہ تصور کرنا کہ وہ جان بوجھ کر اپنے آپ کو بیمار کے طور پر پیش کر رہا ہے، لاعلمی پر مبنی روّیہ ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ آپ اِس بیماری کی نوعیت کافی حد تک سمجھ گئے ہوں گے۔ اب ایسے چند اقدامات ہیں جن سے اِس بیماری کے علاج میں مدد ملے گی۔

۱۔ دورے کے دوران مریضہ کے گرد زیادہ لوگوں کا مجمع نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ایسا کرنے سے نفسیاتی دوروں کی شدت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ مریضہ کے گرد فقط ایک یا دو لوگوں کا بیٹھنا کافی ہے۔

۲۔ دورے کے دوران مریضہ کو جوتا سنگھانا، ناک دبانا، یا منہ میں پانی، دودھ، شہد وغیرہ ڈالنا مُضر اثرات پیدا کر سکتا ہے اور اِس سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔

۳۔ نفسیاتی دورے کا دورانیہ عام طور پر چند منٹ سے چند گھنٹوں تک بھی ہو سکتا ہے۔ اِس دوران مریضہ کو بار بار ایمرجنسی لے جانا یا ڈاکٹروں کے پاس لے جا کر انجکشن یا ڈرپ وغیرہ لگوانا بے فائدہ عمل ہے۔ اِس سے اس مرض کے علاج میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ دورہ اپنا دورانیہ پورا کر کے خود بخود ختم ہو جاتا ہے، اِس لیے اِس دوران بے فائدہ بھاگ دوڑ کے بجائے دورہ ختم ہونے کا انتظار کرنا چاہیے۔

۴۔ آپ نے جس خاندانی مسئلے کا ذکر کیا ہے، اُس حوالے سے مریضہ کو اعتماد میں لے کر علیحدہ گفتگو کیجیے اور اُس کے خدشات پر تفصیلاً بات کیجیے۔ اگر اِس عمل سے بظاہر کوئی حل نہ بھی نکلے تو اُس کے ذہنی دباؤ میں کمی آ سکتی ہے۔ اُس کے لیے یہ احساس ہی کافی تسلی بخش ہو سکتا ہے کہ گھر کے کسی فرد کو اُس کی پروا ہے۔ اِس سے بیماری میں بہتری کا امکان پیدا ہو سکتا ہے۔

۵۔ آپ نے ای میل میں ذکر کیا کہ دورے دو برس سے جاری ہیں۔ لمبی مدت کے دوروں کی وجوہ میں ذہنی دباؤ کے علاوہ ڈپریشن کی بیماری کا امکان بھی ہو سکتا ہے۔ اس کا علاج بھی ضروری ہے۔

۶۔ اگر مریضہ کے دوروں یا ڈپریشن میں کوئی افاقہ نہ ہو تو بہتر ہے کہ اُسے کسی بڑے شہر کے اسپتال میں، جہاں نفسیاتی شعبے کی سہولت موجود ہو، چند دن کے لیے داخل کروا دیں تا کہ مکمل نفسیاتی علاج ہو سکے۔ ●●●

وزن گھٹانے کی قدرتی دوا

انسان کو تندرست رکھنے والے ہرفن مولا کا مفید تذکرہ

حکیم سید مجاہد محمود برکاتی

''امی آج کیا پکایا ہے؟'' فرہاد نے کالج سے آتے ہی ہانک لگائی۔

''آج زیرے والے آلو پکائے ہیں۔'' امّی نے بتایا، تو فرہاد کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے فوراً ہاتھ دھوئے اور کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ اُسے زیرے والے آلو بہت پسند تھے، خاص طور پر جب وہ مسالے دار بھی ہوں۔

زیرہ خوشبو و ذائقے کے علاوہ بے شمار فوائد کا حامل ہے۔ زیرہ سفید و سیاہ سونف کے مشابہ بیج ہیں لیکن اس سے قدرے چھوٹے ہوتے ہیں۔ یہ جہاں کھانا پکانے میں بکثرت استعمال کیا جاتا ہے وہاں اس کے دیگر فائدے بھی بے شمار ہیں۔ یہ خوشبودار مسالا اپنی ادویاتی صلاحیتوں سے مالا مال ہے۔

سفید زیرے کا پودا تقریباً ۳۰ سینٹی میٹر بلند ہوتا ہے۔ پتوں کا رنگ نیلگوں ہوتا ہے۔ شاخیں بے شمار ہوتی ہیں جن میں سفید یا گلابی پھول چھتر بنائے نظر آتے ہیں۔ زیرہ سیاہ کا پودا ایک سے تین میٹر تک بلند ہوتا ہے۔ جڑ موٹی ہوتی اور سفید رنگ کے پھول آتے ہیں۔ دونوں زیروں کا جب کیمیاوی جائزہ لیا گیا تو ان میں ضروری روغنیات پائے گئے جن پر ان کی خوشبو کا انحصار ہوتا ہے۔

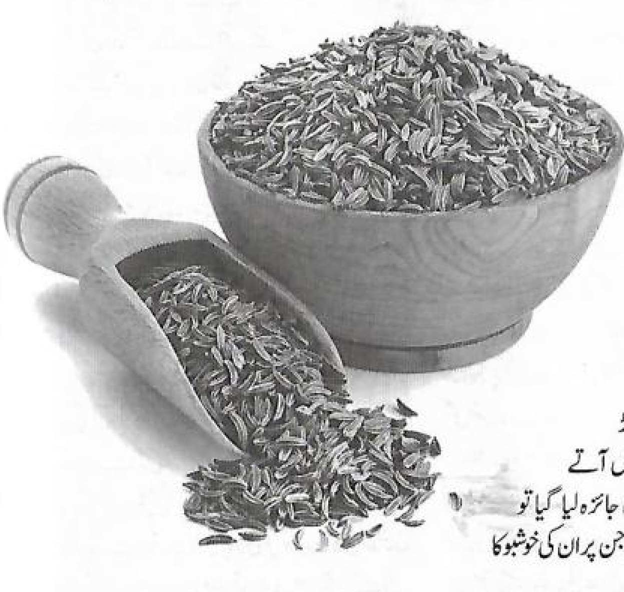

سفید زیرے میں دو سے چار فیصد تک ہلکے سبز اور زرد رنگ کا خوشبو دار اُڑنے والا تیل پایا جاتا ہے۔ اسی لیے سفید زیرے میں خاص ذائقہ اور خوشبو ہوتی ہے۔ اس تیل میں ۵۰

فیصد کیومک ایلڈی ہائیڈ (Cumic Hldehyde) ہوتا ہے، اور دوسرے کیمیائی عناصر ہوتے ہیں۔ اس تیل کو مصنوعی طور پر تھائی مل (Thympl) یعنی اجوائن کے ست میں تبدیل کیا جا سکتا ہے جو جراثیم کش اور کیڑے مار شے ہے۔ سفید زیرے میں ۱۰ فیصد تک اُڑنے والا تیل اور ۶.۷ فیصد پنیٹوسان نامی مادہ پایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں سفید زیرے میں تقریباً ۱۲ فیصد رطوبت، ۶.۵، ۳ فیصد کاربوہائیڈریٹ، ۱۸.۷ فیصد پروٹین، ۱۲ فیصد ریشہ اور ۴.۸ فیصد معدنیاتی مادہ ہوتا ہے۔ معدنیاتی عناصر میں خاص طور پر کیلشیم، فاسفورس اور فولاد اہم ہے۔ ان کے علاوہ وٹامن اے اور سی ہوتے ہیں۔

زیرے میں اینٹی آکسیڈینٹ پائے جاتے ہیں۔ یہ مادہ جسم میں لیسٹرول کم کرنے میں مددگار ہے۔ زیرے کا استعمال کینسر میں بھی بہت فائدہ مند ہے۔ اس کے علاوہ یہ فولاد کی کمی دور کر کے انسانی مدافعتی نظام مضبوط بناتا ہے۔

زیرے میں فولاد کی اچھی خاصی مقدار پائی جاتی ہے، اس لیے یہ نظام ہاضمہ بہتر بناتا، مدافعتی نظام کی قوت بڑھاتا اور شمسی شعاع ریزی کے مضر اثرات دور کرتا ہے۔ سفید زیرے میں تانبا، کیلشیم، پوٹاشیم، میگنیشیم زنک، سیلینیم پائے جاتے ہیں۔ تانبا خون میں سرخ خلیات بنانے میں مدد دیتا ہے۔

اس کے علاوہ زیرے میں وٹامن بی کامپلیکس کی بھی اچھی مقدار پائی جاتی ہے جیسے کہ (Thiamin)۔ وٹامن نائسین بی ۲ (Niacin) اور دوسرے اینٹی آکسیڈینٹس وٹامن جیسے وٹامن سی، اے، ایف بھی موجود ہوتے ہیں۔ کالا زیرہ میں ۱۰۰ قسم کے کیمیکل کمپاونڈ ملتے ہیں جن میں وٹامن، پروٹین، کاربوہائیڈریٹ، معدنیات اور فیٹی ایسڈ شامل ہیں۔

آپ چاہیں تو زیرے کو مختلف طریقوں سے استعمال کر سکتے ہیں جیسے دہی میں ڈال کر یا سبزیوں کے اوپر چھڑک کر! چاہیں تو کھانا بناتے ہوئے زیرے کا وافر استعمال کر سکتے ہیں۔ چاولوں میں زیرہ ڈال کر کھایا جائے تو کھانے کا ذائقہ لاجواب ہو جاتا ہے۔

ایک ایرانی یونیورسٹی میں کی گئی تحقیق میں یہ بات سامنے آئی کہ زیرہ جسم کی چربی پگھلانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ تحقیق میں زائد وزن والی ۸۸ خواتین کو دو گروہوں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک گروہ کو تین گرام زیرہ (تقریباً ایک چمچی) ملا کر دہی میں دی گئی جبکہ دوسرے گروہ کو صرف دہی کھانے کا کہا گیا۔ دونوں گروہ کی خواتین نے ایک دن میں ۵۰۰ حرارے کھائے۔ تین مہینے بعد تحقیق کار یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ جو تین خواتین زیرہ کھا رہی تھیں، انھوں نے تین پاؤنڈ وزن کم کیا جبکہ دوسرے گروہ کا وزن زیادہ کم نہ ہوا۔ ماہرین کا کہنا تھا کہ زیرہ کھانے والی خواتین نے نہ کھانے والوں کی نسبت تین گنا زیادہ وزن کم کیا۔ یہ بات بھی دیکھنے کو ملی کہ زیرہ کھانے والی خواتین میں کولیسٹرول کی مقدار بھی کافی کم ہو چکی تھی اور ان کا باڈی ماس انڈیکس (BMI) بھی کم تھا۔

زیرہ چہرے پر پڑنے والی جھریاں اور لکیریں بھی کم کرتا ہے، کیونکہ اس میں وٹامن ای پایا جاتا ہے جو صحت مند جلد کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ زیرے میں اینٹی آکسیڈنٹ اور اینٹی بیکٹیریل صلاحیت پائی جاتی ہے جس سے جلد خوبصورت، تازہ اور جوان نظر آتی ہے۔

ہتھیلیوں اور پاؤں کے تلوے میں ہونے والی جلن کے خاتمے کی خاطر ایک چمچی زیرہ چار لیٹر پانی میں ابال لیں اور ٹھنڈا کر کے پئیں۔ کھانے کے بعد اگر آپ کو بہت زیادہ پیاس محسوس ہو رہی ہے تو تب بھی زیرے ملے پانی کا استعمال کیجیے۔

چہرے کی جلد چمکدار اور خوبصورت بنانے کے لیے زیرے کا فیس ماسک بنائیے۔ ہلدی ایک چمچہ اور زیرہ پاؤڈر تین چمچے شہد اور پانی کے ساتھ ملا کر پیسٹ بنا لیں۔ خشک ہونے تک چہرے پر لگا رہنے دیں اور پھر دھو لیں۔ اس ماسک سے آپ کی جلد ہموار اور چمکدار ہو جائے گی۔ اگر سن برن یا ایکنی کی شکایت ہے تو خالص دہی زیرہ پاؤڈر میں ملا کر چہرے پر لگائیں۔ خشک ہونے کے بعد دھو لیں۔ دھونے کے بعد چہرے پر موئسچرائزر کا استعمال کریں۔

بالوں کی نشو ونما اور نگہداشت کے لیے پروٹین، چکنائی، پانی اور کاربوہائیڈریٹ انتہائی ضروری ہیں۔ سیاہ زیرے میں سو سے زیادہ غذائی عناصر (Nutrients) اور پروٹین پائے جاتے ہیں۔ اس لیے کالے زیرے کا سفوف کسی بھی بہترین تیل کے ساتھ ملا کر بالوں کی جڑوں میں لگائیں اور اچھی طرح مساج کریں۔ (نیز اس کا استعمال اپنے کھانوں میں مستقل رکھیں)۔

اگر بال تیزی سے گر رہے ہیں اور پتلے یا باریک ہو چکے ہیں تو سیاہ زیرہ پاؤڈر اور زیتون کا تیل ہم وزن ملا کر بالوں میں لگائیں۔ یہ تیل غسل کرنے کے بعد لگائیے۔ ہفتے میں تین بار اس تیل کا استعمال بہت جلد بال گرنا روک دے گا۔

لمبے، گھنے اور چمکدار بال یقیناً ہر خاتون کی خواہش ہوتی ہے۔ اس کے لیے کالا زیرہ ڈیڑھ چمچ ۴/۳ کپ پانی میں دس منٹ تک اُبال لیں۔ ٹھنڈا ہونے پر اسے چھان لیں۔ اب اس پانی میں انڈے کی زردی اچھی طرح سے ملائیے۔ چاہیں تو اس میں زیتون کا تیل بھی شامل کر سکتے ہیں۔

اس مکسچر سے بالوں میں مساج کریں اور آدھے سے ایک گھنٹے تک بالوں میں لگا رہنے دیں، پھر دھو لیں، بہترین نتائج کے لیے یہ عمل ہر ہفتے کر سکتے ہیں۔

ذیابیطس کے مریضوں میں زیرے کا استعمال انتہائی مفید ہے۔ اس سے شوگر لیول کنٹرول رکھنے میں مدد ملتی ہے، یعنی یہ خون میں شکر کی سطح متوازن رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

زیرہ میں فولاد بھرپور مقدار میں پایا جاتا ہے جس سے انیمیا یعنی خون کی کمی کے شکار افراد کو مدد ملتی ہے۔ یہ خون میں ہیموگلوبن کی مقدار بڑھانے میں بھی اہم کردار ادا کرتا اور جسم میں آکسیجن کے خلیات کی عمر بڑھاتا ہے۔ زیرہ کا استعمال ہر دو طرح سے انسانی صحت کے لیے مفید ہے۔ زیرہ نظام ہاضمہ درست اور پیٹ سے متعلق بیماریاں دور کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

نزلہ، زکام دور کرنے میں بھی زیرہ سے مدد لی جا سکتی ہے۔ گلے کی خراش سے نجات کے لیے زیرے کی چائے میں برائے نام سونٹھ شامل کر کے استعمال کیجیے۔ زیرے میں جراثیم کش خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ سیاہ زیرہ پیس کر اس کا لیپ زخم اور پھوڑوں پر لگانے سے مرہم جیسے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

اگر کوئی بیماری نہ ہو تو بھی زیرے کا عرق جسمانی طاقت کی بحالی میں ٹانک کا کردار ادا کرتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ زیرے کے استعمال سے جسم کی گرمی بڑھتی ہے، جس سے جسم میں غذا کے انجذاب کا عمل بہتر ہوتا ہے۔ اس جڑی بوٹی سے گردے اور جگر کے افعال بہتر ہوتے ہیں اور بیماری کے خلاف جسم کی مدافعتی قوت بڑھ جاتی ہے۔

سیاہ زیرے کے بارے میں اطبا کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ اس سے دمے اور جوڑوں کے درد کا علاج بھی ممکن ہے۔ زیرے کے دانوں پر تحقیق سے یہ بات بھی معلوم ہوئی ہے کہ اس میں دافع سرطان کی خوبیاں پائی جاتی ہیں جس سے معدے اور جگر میں رسولی بننے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔

زیرہ، سونف، دھنیا، تینوں کا ایک ایک چمچ بھر لیں اور ان کو ایک گلاس پانی میں ابال لیں۔ آدھا پانی رہنے پر چھان کر ایک چمچ دیسی گھی ملا کر صبح و شام پینے سے بواسیر سے خون گرنا بند ہو جاتا ہے۔ یہ حاملہ عورتوں کی بواسیر میں زیادہ مفید ہے۔

زیرہ اور مصری ہم وزن پیس کر ایک چمچ دن میں تین بار ٹھنڈے پانی سے پھانک لیں اور زیرہ پانی میں پیس کر مقعد پر لیپ کریں۔ اس سے بواسیر کی سوجن اور درد میں آرام ملے گا۔

کچا پسا ہوا زیرہ ایک گرام اتنے ہی گڑ میں ملا کر تین بار روزانہ لیتے رہنے سے پرانا بخار ٹھیک ہو جاتا ہے۔

زیرے سے ہاضمے کا چورن بنتا ہے۔ زیرہ، سونٹھ، سوندھا نمک، پیپل دراز، سیاہ مرچ یہ سب اشیاء ہم وزن مقدار میں پیس کر ایک چمچ کھانے کے بعد پانی کے ساتھ لینے سے کھانا جلد ہضم ہوتا ہے۔ ◆◆◆

سلمان بٹ

اللہ کے بعد اس سے ڈریئے!

جو لوگ اِسے تعظیم نہ دیں، یہ اُن سے خوفناک انتقام لیتی ہے

کرسی کا لفظ کان میں پڑتے ہی بے شمار اقسام کی کرسیاں ذہن میں آتی ہیں لیکن فوری طور پر ذہن میں وہی آتی ہے جس سے اس کا قریبی واسطہ ہے۔ مثال کے طور پر نائی کے ذہن میں وہ کرسی آتی ہے جس پر بیٹھ کر وہ لوگوں کی حجامت بناتا ہے۔ سیاسی لیڈر کے ذہن میں وہ کرسی آتی ہے جس پر صرف ایک بار ہی بیٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ افسر کے ذہن میں جو کرسی آئے وہ انتہائی آرام دہ، قیمتی اور گھومنے والی ہوتی ہے۔ یعنی جب افسر گھومتا ہے تو ساتھ کرسی بھی گھومتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں جدھر افسر کا رخ ہو، ادھر ہی کرسی کا رخ ہو جاتا ہے۔

کلرک کے ذہن میں اگرچہ معمولی سی لکڑی کی کرسی آئے گی لیکن کارکردگی، طاقت اور دبدبے کے اعتبار سے وہ افسروں کی کرسی پر بھی بھاری ہوتی ہے۔ کلرک کی کرسی اگرچہ خود نہیں گھومتی لیکن زمانے بھر کو گھما سکتی ہے۔ وہ کام جو افسروں کی کرسی کے بس میں نہیں ہوتے، کلرک کی کرسی کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتے ہیں۔

اسکول اور کالج کے اساتذہ کے ذہن میں اولاً تو کرسی کا لفظ سُن کر کوئی خاص تصور نہیں آتا۔ یہ لفظ ان کے سامنے دو چار بار دہرایا جائے تو ایک قسم کی کرسی ان کے ذہن میں آتی ہے۔ اس کی تین یا ساڑھے تین ٹانگیں ہوتی ہیں اور جو کبھی کبھار ہی دکھائی دیتی ہیں۔ اس پر بیٹھنے کے لیے استاد کو نیچے اینٹیں، ڈکشنری یا انسائیکلوپیڈیا قسم کی کوئی چیز رکھنی پڑتی ہے یا پھر یوں بیٹھنا پڑتا ہے کہ جسم کا بوجھ ٹوٹی ہوئی ٹانگ پر نہ پڑے۔ اگر خدانخواستہ استاد نے بے خبری میں کرسی کی ٹوٹی ٹانگ پر بوجھ ڈال دیا تو استاد کی اپنی ٹانگ کے ٹوٹنے کے امکانات روشن ہو گئے۔

دندان ساز کے ذہن میں اس کرسی کا تصور ہے جس پر بٹھا کر وہ بڑے بڑوں کے دانت نکال دیتا ہے۔ جو شخص اس کرسی پر بیٹھ کر ایک بار دندان شکنی کروا لے، وہ عمر بھر اس کرسی سے خائف رہتا ہے۔ قیمت کے اعتبار سے دندان

سازی کرسی باقی تمام کرسیوں سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے لیکن اس سے بھی زیادہ خطرناک ایک اور کرسی ہے جسے الیکٹرک چیئر یعنی بجلی کی کرسی کہتے ہیں۔

یوں تو تھوڑی بہت بجلی ہر کرسی میں ہوتی ہے لیکن الیکٹرک چیئر کی بات ہی اور ہے۔ اس کرسی سے ہر شخص حتیٰ کہ سیاسی لیڈر بھی ڈرتے ہیں اور اس کے تصور سے ہی ان کا دم نکلنے لگتا ہے۔ عام کرسیوں میں جو ہلکی سی برقی رو ہوتی ہے، وہ بیٹھنے والوں کے جسم میں نشے اور سرور کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے اور ان کی گردن خود بخود اکڑ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر بیوروکریٹ کی کرسی، لیکن الیکٹرک چیئر پر بیٹھنے والوں کی گردن نہیں بلکہ سارا جسم اکڑ جاتا ہے۔ وہ کرسی سے اُترنے کے قابل بھی نہیں رہتے بلکہ انھیں اتارنا پڑتا ہے جس طرح سیاستدان کو کھینچ کر کرسی سے نیچے لانا پڑتا ہے۔

چند ایک کرسیاں ایسی ہیں جن کی ایک یا ایک سے زیادہ چولیں ڈھیلی ہوتی ہیں۔ ان کی خاصیت یہ ہے کہ بیٹھنے والوں کی اپنی چولیں ڈھیلی ہو جاتی ہیں۔ اگر کرسی جسم کے بوجھ سے زمین بوس ہو جائے تو ساتھ ہی اُوپر بیٹھنے والا سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔

ڈھیلی چولوں والی کرسیاں عموماً دفتروں میں ملاقاتیوں کے لیے یا تیسرے درجے کے ریستورانوں میں استعمال کی جاتی ہیں۔ مزدور پیشہ لوگوں کے گھروں میں اول تو کرسی ہوتی نہیں اور اگر ہو بھی تو ڈھیلی چولوں والی ہوتی ہے۔ مزے کی بات یہ کہ ہمارے معاشرے میں صحیح الدماغ لوگوں کے حصے میں عموماً ڈھیلی چولوں والی کرسیاں آتی ہیں جب کہ مضبوط کرسیاں عموماً انھیں ملتی ہیں جن کے دماغ کی چولیں ڈھیلی ہوتی ہیں۔

کرسیوں سے بیٹھنے کے علاوہ اور بھی کئی کام لیے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر بعض ممالک کی قانون ساز اسمبلیوں میں کرسی کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ کسی اسپیکر یا ڈپٹی اسپیکر وغیرہ کو جان سے مارنے کے لیے کرسی بہت ہی مفید ثابت ہوتی ہے۔

بعض اوقات دشمن کے وار سے بچنے کے لیے کرسی کو بطور ڈھال بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ بعض کرسیاں لوگوں کو آپس میں لڑوانے کے کام آتی ہیں۔ ایسی کرسی عموماً چند امیدواروں کے درمیان رکھ دی جاتی ہے۔ امیدوار کرسی دیکھتے ہی دیوانہ وار اس کی طرف دوڑتے ہیں۔ ہر کوئی کرسی پر بیٹھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک کرسی پر دو امیدوار نہیں بیٹھ سکتے، چنانچہ امیدواروں کے درمیان جنگ شروع ہو جاتی ہے۔

ایک ایک کر کے امیدوار زمین پر گرنے لگتے ہیں۔ آخر میں زندہ بچ جانے والا اُمیدوار تھکن سے بے حال ہو کر گر پڑتا ہے۔ یوں وہ کرسی خالی ہی اٹھا کر آئندہ کسی موقع کے لیے سنبھال لی جاتی ہے۔

بڑے بڑے بنگلوں میں چند ایسی کرسیاں بھی ملتی ہیں جن کا مقصد امارت کا اظہار کرنا ہے۔ مہمان ان کرسیوں پر اس خیال سے نہیں بیٹھتے کہ کہیں میلی نہ ہو جائیں چنانچہ مہمانوں کو اصرار کر کے ایسی کرسیوں پر بٹھایا جاتا ہے، لیکن انسان جب تک ایسی کرسی پر بیٹھا رہے، خود کو مجرم سمجھتا ہے کہ اتنی اعلیٰ کرسی کی بے ادبی کا مرتکب ہو رہا ہے۔

کرسی دراصل اقتدار کی علامت ہے۔ ہر کرسی کسی نہ کسی درجے کا اقتدار ظاہر کرتی ہے۔ کرسی طاقت کا دوسرا نام ہے۔ جو لوگ کرسی کی طاقت سے واقف ہیں، وہ اس کا بے حد احترام کرتے اور اُسے وقتاً فوقتاً سلام کرتے رہتے ہیں۔ کرسی کو سلام کرنے والے عقل مند اور پروا نہ کرنے والے احمق اور بے وقوف ہوتے ہیں۔ جو لوگ اس کی مناسب تعظیم نہ کریں یہ ان سے بڑا خوفناک انتقام لیتی ہے۔ لہٰذا آج کل کی دنیا میں اللہ کے بعد کرسی سے ڈرنا چاہیے۔ ♦♦♦

پردیس میں دیسی کھانے

روکھے پھیکے کھانوں سے خوفزدہ جب
ایک ممتاز پاکستانی اداکارہ کینیڈا پہنچیں،
تو وہاں ایک غذائی انقلاب
ان کا منتظر تھا

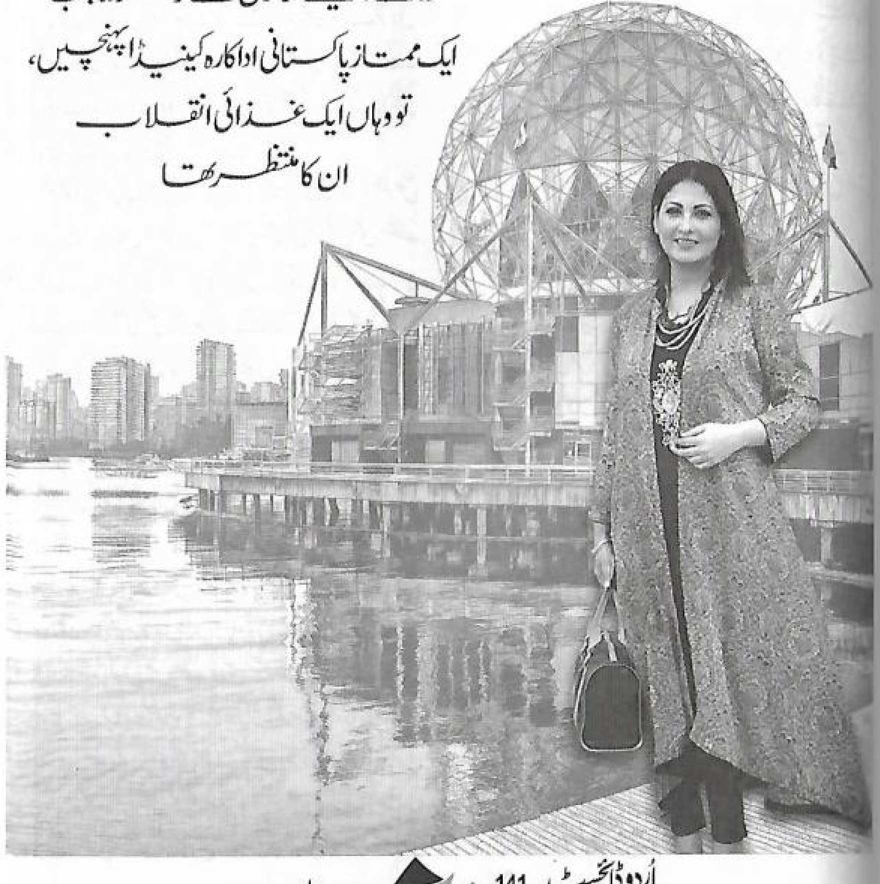

گوشۂ خواتین

ڈاکٹر ہما میر

کینیڈا سرد ملک ہے جہاں زیادہ تر ٹھنڈ رہتی ہے لیکن یہاں کی خزاں کا موسم دنیا بھر میں مشہور ہے۔ سیاح برفباری کے بجائے خزاں دیکھنے کینیڈا آتے ہیں۔ خزاں ہمیں بھی بہت پسند ہے۔ ہمارا تعلق اُسی طبقۂ فکر سے ہے جو موسم خزاں کو بہار پہ فوقیت دیتے، اس کے حسین رنگوں میں کھو جاتے اور اسے بہترین موسم گردانتے ہیں۔ تاہم جب سورج کی تمازت کم ہو جائے، آسماں ہمہ وقت سیاہ بادلوں سے ڈھکا رہے، سرمئی شاموں میں سرسراتی ہوا سوکھے پتے ہر سُو بکھیر دے تو دل اداس بھی ہو ہی جاتا ہے۔ جانے یہ اثر موسم کی یک لخت تبدیلی کا ہے یا گھر سے دوری کا لیکن اتنا ضرور ہے کہ پردیس میں تنہائی کلیجے پر کٹار کی طرح لگتی ہے۔

ہم خوش نصیب ہیں کہ ہمیں کینیڈا میں اچھے اور پُرخلوص دوست ملے۔ یہاں اکثر و بیشتر ادبی و ثقافتی محافل بھی منعقد ہوتی ہیں۔ ہمارا ٹی وی شو بھی کامیابی سے چل رہا ہے۔ اس سب کے باوجود کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر واپس پاکستان چلے جائیں۔ اپنوں سے لاکھوں میل دور، سات سمندر پار، دیارِ غیر میں شدت سے یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم ایک اجنبی سرزمین پر ہیں۔ وطن عزیز کی یاد ہمہ وقت دل میں چٹکیاں لیتی رہتی ہے۔ کچھ بھی ہو، اپنا وطن اپنا ہی ہوتا ہے۔

کینیڈا میں لوگ سال کے بارہ مہینے کافی پیتے ہیں اور وہ بھی نہار منہ، تاہم سردیوں میں زیادہ پی جاتی ہے۔ ویک اینڈ پر دیسی ریستورانوں میں حلوہ پوری کے ساتھ پائے کا بھی ناشتا ہوتا ہے۔ نہایت عمدہ پائے اور گرما گرم نان، واہ! مزہ ہی آجاتا ہے۔ حلوہ پوری کا بھی جواب نہیں، کڑاہی سے نکلی پھولی پوری، چنے کا سالن جس کے اوپر ہری مرچیں اور ہرا دھنیا پڑا ہوتا ہے، آلو کی خشک ترکاری، اور ساتھ سوجی کا حلوہ جس میں اصلی زردے کا رنگ اور یہ سب اصلی گھی میں بنا ہوتا ہے۔ دہی، کٹی پیاز اور اچار بھی ملتا ہے۔ اس مزیدار ناشتے کے ساتھ لسی پیجیے، نمکین یا میٹھی اور بعدازاں چائے۔

کینیڈا میں سب سے اچھی بات یہ ہے کہ بازار کا کھانا ناقص نہیں ہوتا۔ یہاں ہوٹلوں میں حفظانِ صحت کے اصولوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ سموسے، پکوڑے یا جلیبیاں گندی کڑاہی کے پرانے کالے تیل میں نہیں تلی جاتیں۔ دوپٹا رنگنے کے کلر کے بجائے مٹھائیوں میں کھانے کا ہی رنگ استعمال ہوتا ہے۔ تیل بھی معیاری ہے، کیونکہ دو نمبر یا تین نمبر چیزیں نہ بنتی ہیں نہ بکتی ہیں۔ نہ جانوروں کے سینگوں اور ہڈیوں سے جعلی تیل بنتا ہے نہ غیر قانونی کارخانے ہیں۔

کھانا پکانے کے لیے سب سے اہم چیز تیل یا گھی ہوتا ہے اور کینیڈا میں یہ دونوں ہی عمدہ ملتے ہیں۔ مسالاجات کی بات کریں تو لال مرچ پسی ہوئی واقعی لال مرچ ہی ہوتی ہے، پسی ہوئی اینٹیں نہیں۔ اسی طرح چائے کی پتی بھی چائے ہی ہوتی ہے چنے کے چھلکے نہیں۔ ویسے تو یہاں کھلی پتی کا رواج نہیں زیادہ تر ٹی بیگ ہی استعمال ہوتے ہیں۔

ایک بات ہم فخریہ بتانا چاہتے ہیں کہ کینیڈا کی مارکیٹ میں مسالوں، اچار اور پاکستانی چاول کے علاوہ پاکستانی چائے کی بھی بہت مانگ ہے۔ پاکستانی چاول دیگر چاولوں کے مقابلے میں دو یا تین گنا مہنگا ضرور ہے مگر معیاری ہونے کے باعث لوگ اسے فوقیت دیتے ہیں۔ باسمتی چاول کے لمبے دانے اور پکتے وقت ان سے اٹھتی مہک انھیں سب سے ممتاز بناتی ہے۔ اسی طرح پاکستانی اچار اور مسالے بھی خوب بکتے ہیں۔

عجیب بات ہے کہ یہی اچار جب پاکستان میں کھائیں تو ذائقہ الگ اور یہاں کھائیں تو بالکل جدا۔ معلوم نہیں کوالٹی کنٹرول اس کی وجہ ہے یا کوئی اور بات، تاہم یہ تو طے ہے ہمارے باورچی خانے میں پاکستانی مصنوعات ہی اپنی بہار دکھاتی ہیں۔ کینیڈا میں گوشت اچھا اور تازہ ملتا ہے۔ حلال گوشت نسبتاً مہنگا ہے۔ یہاں قصاب کی دکانوں میں گوشت نفیس انداز سے رکھا ہوتا ہے۔ اوّل تو ٹرکوں پر کھلا گوشت لے جانے کا کوئی تصور نہیں پھر بکرے کے گوشت کے نام پر بکرا ہی ملتا ہے کوئی اور جانور نہیں۔ جانور کی بھی بڑی توقیر کی جاتی ہے۔ نسوں میں پانی ڈال کر وزن نہیں بڑھایا جاتا، نہ ہی بیمار جانور کا گوشت فروخت ہوتا ہے۔ اسی لیے بیف، چکن یا مٹن، سب کا ذائقہ ہی الگ ہوتا ہے یا ہمیں الگ شاید اس لیے بھی لگتا ہے کہ ہمیں تازہ گوشت کھانے کی عادت جو نہیں ماسوائے قربانی کے دنوں میں۔ نہاری کے لیے جو گوشت ملے، نہایت ملائم ہوتا ہے۔ ہم حیران ہی رہ گئے۔ کراچی میں نہاری کا گوشت ایسا ہوتا ہے کہ ہم تو خالی شوربہ ہی کھاتے تھے مگر یہاں صورت حال مختلف ہے۔ واقعی کھانے کا مزہ ملتا ہے۔ دیکھا جائے تو اصولاً یہ خوبی مسلمان ملک ہونے کے ناتے پاکستان میں ہونی چاہیے اور دوسرے غیر مسلم ممالک میں اس خوبی کا فقدان ہو، اُلٹی ہی گنگا بہتی ہے۔ کاش کبھی پاکستانی بھی، بیرونِ ملک جاکر فخریہ کہہ سکیں کہ جو بات پاکستان میں خوراک کے حوالے سے ہے وہ کہیں نہیں۔

کینیڈا میں ہر چیز عمدہ اور معیاری ہے۔ چاندی کا ورق جو کھیر یا دیگر میٹھے پکوان پر لگاتے ہیں وہ بھی پنی کے بجائے اصلی چاندی کا ملتا ہے۔ اسی طرح دودھ تو اتنا خالص ہے کہ دنیا کا یہ بہترین مائع کینیڈا میں ملتا ہے۔ ان بیچاروں کو علم ہی نہیں کہ دودھ میں ٹیلکم پاؤڈر اور کیمیکل یا دیگر زہر ملا کے بھی فروخت کرسکتے ہیں۔ ان کو یہ بھی نہیں معلوم کہ گائے کو ہارمون کے انجکشن لگا لگا کے زیادہ دودھ نکال سکتے ہیں، پھر یہ لوگ دودھ بھی گائے بھینسوں کا ہی پیتے ہیں خود فیکٹری میں دودھ بنانے نہیں بیٹھ جاتے۔ یہاں گائے بھی تو سرسبز و شاداب کھلیانوں میں چارہ کھاتی ہے۔ ہماری گائے کی طرح کچرے کے ڈھیر پر تو منہ نہیں مارتی۔ باڑے جاکے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ مویشی کیسی شاہانہ زندگی بسر کررہے ہیں۔ ہمارے غریب مویشی تو سڑکوں پر آوارہ پھرتے ہیں۔ بڑی شاہراہوں پر جہاں ہیوی ٹریفک ہو، وہاں بھی ادھر اُدھر سے گائے بکریاں آجاتی ہیں۔ مختصراً جن جانوروں سے خوراک حاصل ہوتی ہے، چاہے گوشت یا مائع، ان جانوروں کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔

کینیڈا میں انسانی زندگی کی قدر و منزلت تو ہے ہی لیکن جس طرح یہاں جانوروں، پھولوں، پودوں کی قدر ہے، وہ قابل تعریف ہے۔ درخت کاٹنا سنگین جرم ہے۔ یہاں ٹمبر مافیا کا کوئی وجود نہیں حالانکہ لکڑی درختوں سے ہی حاصل کی جاتی ہے۔ درخت کٹتے بھی ہیں لیکن سارا کام قانون کے دائرے میں رہ کر ہوتا ہے۔ درختوں کی کٹائی کے لیے انتظامیہ سے اجازت لینا ضروری ہے۔

ویسے یہ بھی خوب ہے کہ کینیڈا میں ہر کام کے لیے لائسنس یا اجازت نامہ لینا ضروری ہے۔ اجازت نامہ حاصل کرنے کے لیے اُس کام کی تربیت لینی ضروری ہے جس کے لیے لائسنس لیا جارہا ہے۔ کسی میلے میں پکوڑے بیچنے ہیں تو اس کے لیے بھی یہی قانون لاگو ہوگا۔ میلے کا لفظ اس لیے برتا کہ یہاں سڑک پر چھابڑی یا ٹھیلا لگا کر کوئی چیز فروخت نہیں کی جاسکتی۔ فٹ پاتھ پر ریڑھی والوں اور

سڑک کنارے چھابڑی والوں کو دیکھنے کے لیے آنکھیں ترس گئیں۔ ''اینٹی انکروچمنٹ'' کا محکمہ غالباً یہاں نہیں ہوگا کیونکہ ضرورت ہی نہیں پڑتی یا اگر ہوگا بھی تو ہر وقت فارغ ہی رہتا ہوگا۔ سنا ہے پاکستان میں سب سے زیادہ کمائی اسی محکمے کی ہے۔

کینیڈا میں اکثر پاکستانی خواتین کیٹرنگ کا کام کرتی ہیں۔ یہ کام وہ گھروں میں انجام دیتی ہیں۔ یعنی اگر آپ کو گھر پر دوست احباب کی دعوت کرنی ہے اور بریانی، قورمہ، نان، نہاری یا کباب وغیرہ بنوانے ہیں تو فون پر آرڈر کر سکتے ہیں۔ اگر یہ چیزیں بازار سے خریدیں تو مہنگی ہوں گی اور وہ ذائقہ بھی نہ ہوگا جو گھر کا ہوتا ہے۔ چھوٹی موٹی دعوتوں کے لیے یہ انتظام بہتر ہے تاہم بڑی دعوتوں اور پارٹیوں کے لیے ہوٹل والے کیٹرنگ کرتے ہیں۔ دعوت کے علاوہ بھی آپ اپنے لیے کیٹرنگ کروا سکتے ہیں، مثلاً درجن بھر نان یا پراٹھے بنوالیں اور فریزر میں رکھ کے روزانہ ایک ایک نکال کر کھاتے جائیں۔

جو لوگ زیادہ مصروف ہوتے ہیں اور باقاعدگی سے کھانا نہیں پکا سکتے وہ ماہانہ رقم دے کر روزانہ دو وقت کے کھانے کا پیکج لے سکتے ہیں۔ ہمیں تو لگتا ہے دنیا کا بہترین کھانا اپنا دیسی کھانا ہے، برگر اور پیزا سے ہمارا گزارہ نہیں ہوتا۔ جانے دنیا یہ فاسٹ فوڈ کیوں اتنا پسند کرتی ہے؟ خیر پسند اپنی اپنی۔ ہمیں تو ناشتے میں پراٹھے ہی پسند ہیں۔

ہمیں یہی فکر تھی کہ کینیڈا میں پراٹھوں کا کیا ہوگا؟ والدہ کے ہاتھ کے بنے پراٹھے کھانے کو تو ہم ترس جائیں گے مگر وینکوور آ کر پتا چلا کہ یہاں ہر قسم کے پراٹھے مل جاتے ہیں۔ ہم نے اپنے فریزر میں خوب پراٹھے بھر رکھے ہیں جو ہم گرم کر کے کھاتے ہیں۔ تاہم فریزر سے نکلے پراٹھوں میں وہ بات کہاں جو ماں کے ہاتھ کے گرم گرم، تازہ، لچھے دار پراٹھوں میں ہے؟

کھانے پینے کی کچھ چیزیں ایسی ہیں جو ہم نے کینیڈا آ کر استعمال کرنی شروع کیں۔ مثلاً گڑ، شکر کی چائے، مسالا چائے، گھر کی دہی یعنی گھر میں دہی جمائی اور کھائی۔ پراٹھے کے ساتھ دہی اور اچار ایک ساتھ، نہاری کا گوشت (پہلے ہم صرف شوربہ کھاتے تھے) سبزی کی ترکاری میں اجوائن اور السی، بادام مکھن، سبزی منچورین اور اصلی شہد۔ ایسا نہیں کہ پاکستان میں یہ چیزیں میسر نہیں دراصل کراچی کی تیز رفتار زندگی میں کھانے کا اسٹائل ہی الگ ہے۔

ہمیں تو اصلی شہد ملنے کی بہت خوشی ہے۔ ایک تو وہ شہد ہے جو اسٹور سے ملتا ہے۔ وہ بھی اصلی ہوتا ہے مگر پاسچرائز! ہم ایسی خاص دکان سے لاتے ہیں جو شہد کے لیے مخصوص ہے۔ یہاں شہد کی مختلف ورائٹی ہے، یہ شہد مختلف پھولوں سے حاصل ہوتا ہے۔ ہر شیشی پر اس کے پھول کا نام لکھا ہوتا ہے۔ چونکہ یہ پاسچرائز نہیں ہوتا یعنی کسی خاص درجے پر گرم نہیں کیا جاتا لہٰذا ذرا مہنگا ہے مگر بے مثال ہے۔ یہ دکان بی سینٹر (Bee Center) کہلاتی ہے۔ وہاں ایسا شہد بھی ملتا ہے جسے براہ راست چھتے سے نکالا جاتا ہے۔ اس شہد کو چھانا نہیں جاتا، یعنی انتہائی خالص شہد، واہ، واہ بھئی کیا کہنے!

شہد ایک تو صحت کے لیے بہت مفید ہے پھر اسلامی نقطۂ نظر سے بھی اس کی اہمیت مسلم ہے۔ گڑ اور شہد کھانے کے باعث اب چینی کا استعمال نہ ہونے کے برابر ہے۔ حیرت انگیز طور پر ہمارے کھانے پینے کا انداز تبدیل ہو چکا۔ ہم سوچتے تھے کینیڈا میں ڈبل روٹی انڈے ملیں گے۔ مغربی انداز کے پھیکے کھانوں کے تصور سے ہماری جان نکلتی تھی مگر کمال یہ ہے کہ اب ہم مکمل دیسی کھانا کھا رہے ہیں۔ اتنا دیسی تو کراچی میں بھی نہ تھا جو یہاں وینکوور میں ہے۔

علامہ اقبالؒ
واقعات کے آئینے میں

شاعرِ مشرق کی غیر معمولی شخصیت عیاں کرنے والے سبق آموز واقعات

ڈاکٹر جاوید اقبال

ہمارے خاندان میں مشہور ہے کہ اقبال چھوٹی عمر ہی سے بے حد ذہین تھے۔ پڑھائی کا بڑا شوق تھا اور سخت محنت کرتے تھے، یہاں تک کہ رات گئے تک پڑھتے رہتے۔ ایک دفعہ نصف شب کے قریب بے جی (والدہ) کی آنکھ کھل گئی۔ دیکھا کہ اقبال لیمپ کے پاس بیٹھے اسکول کا کام کر رہے ہیں۔ بے جی نے اُنھیں دو تین مرتبہ پکارا لیکن کوئی جواب نہ پایا۔ پھر اُنھوں نے اُٹھ کر بیٹے کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا کہ اس وقت آدھی رات کو کیا پڑھ رہے ہو؟ سو جاؤ۔ اقبال نے اونگھتے ہوئے جواب دیا، بے جی، سویا ہوا ہی تو ہوں۔ وہ پڑھتے پڑھتے سو گئے تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کی خوشبو

ایک دفعہ کوئی سائل بھیک مانگتا ہوا اُن کے گھر کے دروازے پر آ کھڑا ہوا۔ اُسے کئی بار جانے کے لیے کہا گیا، وہ اڑیل فقیر ٹلنے کا نام نہ لیتا تھا۔ اقبال ابھی عنفوانِ شباب میں تھے۔ اس کے بار بار صدا لگانے پر اُنھیں طیش آ گیا اور اسے دو تین تھپڑ دے مارے، جس کی وجہ سے جو کچھ اس کی جھولی میں تھا، زمین پر گر کر منتشر ہو گیا۔ والد اُن کی اس حرکت پر بے حد آزردہ ہوئے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ کہنے لگے:

''قیامت کے دن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد غازیانِ اسلام، حکماء، شہداء، زہداء، صوفیہ، علماء اور عاصیانِ شرمسار جمع ہوں گے تو اس مجمع میں اس مظلوم گدا کی فریاد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ مبارک کو اپنی طرف مرتکز کر لے گی اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے پوچھیں گے کہ تیرے سپرد ایک

مسلم نوجوان کیا گیا تھا تاکہ تو اس کی تربیت ہمارے وضع کردہ اُصولوں کے مطابق کرے۔ لیکن یہ آسان کام بھی تجھ سے نہ ہوسکا کہ اس خاک کے تودے کو انسان بنا دیتا، تو تب میں اپنے آقا و مولا کو کیا جواب دوں گا؟ بیٹا! اس مجمع کا خیال کر اور میری سفید ڈاڑھی کی طرف دیکھ۔ یہ بھی دیکھ کہ میں خوف اور اُمید سے کس طرح کانپ رہا ہوں۔ باپ پر اتنا ظلم نہ کر اور میرے اللہ میرے مولا کے سامنے مجھے یوں ذلیل نہ کر۔ تو تو چمن محمد ﷺ کی ایک کلی ہے۔ اس لیے اُسی چمن کی نسیم سے پھول بن کر کھل اور اسی چمن کی بہار سے رنگ و بو پکڑ، تاکہ آنحضور ﷺ کے اخلاق کی خوشبو تجھ سے آسکے۔

یہودی کی خامی

کیمبرج میں رہائش کے سلسلے میں اقبال کا ایک بڑا مسئلہ ذبیحہ گوشت کا انتظام تھا۔ اس معاملے میں ان کے محبوب استاد، آرنلڈ نے اُن کی مدد کی۔ اقبال بیان کرتے ہیں: ''جب میں انگلستان گیا تو میں نے ڈاکٹر آرنلڈ صاحب سے یہ خواہش ظاہر کی کہ میرے قیام کا انتظام ایسے گھر میں کروا دیا جائے جہاں ذبیحہ کا خاص انتظام ہو۔ یورپ میں محض یہودی اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں کہ صرف اپنا ذبیحہ کھائیں۔ چنانچہ ایک اچھے یہودی کے گھر میں میری رہائش کا انتظام کروا دیا گیا۔

ان لوگوں میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ اپنی نماز باقاعدہ پڑھتے۔ جب میں گھر میں ہوتا تو میں بھی شریک ہو جاتا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ مسلم ہونے کی وجہ سے حضرت موسیٰ میرے بھی پیغمبر ہیں اور میں اُن کی روش پر چل سکتا ہوں۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد میرا دل اُن کی طرف سے کھٹا ہو گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ ہر اس چیز میں، جس کی مجھے ضرورت ہوتی تھی اور جس کو میں اُن کے ذریعے منگواتا تھا، یہ لوگ دکانداروں سے کمیشن لیا کرتے تھے۔ اُن کی اسی ایک عادت نے اُن کی تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیا۔''

بس یہی مذہب ہے

لندن میں اقبال کا معمول تھا کہ وہ شہر سے رہائش گاہ تک پہنچنے کے لیے ریل استعمال کرتے۔ اس قسم کے ایک سفر کے متعلق وہ بیان کرتے ہیں: ''انگلستان میں طالب علمی کے زمانے میں مجھے ہر روز شام کے وقت اپنی قیام گاہ کی طرف ریل گاڑی میں سفر کرنا پڑتا تھا۔ یہ گاڑی ایک جگہ ختم ہوتی تھی اور سب مسافروں کو سامنے والے پلیٹ فارم پر دوسری گاڑی میں سوار ہونا پڑتا۔ گاڑی جب اسٹیشن پر پہنچتی تو گارڈ بلند آواز سے پکارتا ''آل چینج'' یعنی سب ریل بدل لو۔

''ایک روز میں حسب معمول گاڑی میں بیٹھا تھا کہ میرے اردگرد اخبار بین مسافر آپس میں بدھ مذہب کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ ایک صاحب نے میری طرف اشارہ کرکے کہا کہ یہ صاحب غالباً ایشیائی ہیں، ان سے بدھ مذہب کے متعلق پوچھنا چاہیے۔ چنانچہ مجھ سے پوچھا گیا میں نے کہا، ابھی جواب دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر میں چپ رہا۔ چند منٹوں کے بعد اُنھوں نے مجھ سے دوبارہ پوچھا۔ میں نے پھر کہا، ابھی جواب دیتا ہوں، وہ کہنے لگے، شاید آپ جواب سوچ رہے ہیں۔ میں نے کہا، ہاں۔ اس دوران میں اسٹیشن آ گیا اور گارڈ ''آل چینج'' پکارنے لگا۔ میں نے کہا، بس یہی مذہب ہے۔''

باما سے ملاقات

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی پوتی راجکماری صوفیہ جنداں باما اقبال سے ملنے کی بڑی خواہشمند تھیں۔ وہ جیل روڈ کی ایک کوٹھی میں رہتی تھیں۔ ۱۹۱۲ء کی ایک شام سر جوگندر سنگھ اقبال اور مرزا جلال الدین کو اُن کے ہاں لے گئے۔ درختوں کے ایک جھنڈ میں چائے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ راجکماری کی فرمائش پر اقبال نے اُنھیں چند اُردو اشعار سنائے۔ باما اُردو سمجھ لیتی تھیں، لیکن شعر سمجھنے کی اہلیت نہ رکھتیں، اس لیے سر جوگندر سنگھ نے اشعار کا انگریزی ترجمہ کرکے ان کی تشریح کی۔

باما کو معلوم ہو گیا تھا کہ اقبال حُقّہ کے شوقین ہیں۔ اس لیے اُنھوں نے اپنے ڈرائیور، پیر جی سے حُقّہ بھروا کر پہلے ہی برآمدے کے ایک کونے میں رکھوا دیا تھا۔ جب اقبال بیٹھ گئے تو وہ خود اُٹھ کر گئیں اور حُقّہ لا کر ان کے آگے رکھ دیا۔ اقبال نے مرزا جلال الدین سے مخاطب ہو کر کہا کہ دیکھو، رنجیت سنگھ کی پوتی نے اپنے ہاتھ سے ہمیں حُقّہ پلایا ہے۔

تصویر کا دوسرا رُخ

طالب علمی کے زمانے میں ایک مولوی صاحب یورپ کی سیاحت کرتے ہوئے لندن پہنچے۔ آرنلڈ ان دنوں لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر تھے۔ اس لیے مولوی صاحب جو انھیں علی گڑھ کی نسبت سے جانتے تھے، اُن سے ملنے گئے۔ آرنلڈ نے اقبال سے اُن کا تعارف کروایا اور اپنے شاگرد کو حکم دیا کہ انھیں لندن کے تمام قابل دید مقامات کی سیر کروا دیں۔

اقبال نے نہایت تندہی سے مولوی صاحب کو جگہ جگہ پھرایا اور شام کے قریب کسی قہوہ خانے میں جا بٹھایا۔ اس جگہ چند ستم پیشہ لڑکیاں بھی موجود تھیں۔ اقبال کے اشارے پر یا خود اپنی جولانی طبع سے وہ مولوی صاحب کے گرد جمع ہو گئیں۔ کوئی ان کو قہوہ پلانے لگی، کسی نے ان کی نورانی ڈاڑھی کو چھوا، اور ایک نے تو ان کے رخسار پر عقیدت کی چند مہریں بھی جڑ دیں۔

مولوی صاحب سخت پریشان ہوئے۔ جب اس مصیبت سے نجات ملی تو غصہ سے بھرے ہوئے آرنلڈ کے پاس پہنچے اور اقبال کی شکایت کی۔ آرنلڈ سخت نادم ہوئے۔ اقبال سے خفگی کے لہجے میں کہا: ''مولوی صاحب ایسے بزرگ کو قہوہ خانے میں لے جاتے ہوئے تمھیں شرم نہ آئی؟''

اقبال نے نہایت متانت سے جواب دیا: ''آپ نے خود ہی تو حکم دیا تھا کہ انھیں لندن کے تمام قابل دید مقامات کی سیر کروا دوں۔ اگر میں مولوی صاحب کو صرف محلات، عجائب گھر اور تاریخی عمارات ہی دکھلا دیتا تو وہ لندن کے متعلق سخت غلط فہمی میں مبتلا رہتے اور ہندوستان جاتے ہوئے یک طرفہ خیالات لے کر جاتے۔ لندن کی زندگی میں قہوہ خانے نہایت اہم ہیں، اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ مولوی صاحب کو تصویر کا دوسرا رُخ بھی دکھا دوں۔''

دُم دار ستارے کا دیکھنا

علامہ اقبال انگلستان میں ڈائری لکھتے تھے۔ ۱۵ مئی ۱۹۱۰ء کا اندراج آسمان پر دُم دار ستارہ دیکھتے وقت اقبال کے ذاتی تاثرات کا غماز ہے:

''کل تقریباً چار بجے صبح میں نے کرۂ ارض کے اس عظیم الشان زائر کو دیکھا جو ہیلی کا دُم دار ستارہ کہلاتا ہے۔ فضائے بسیط کا یہ پرشکوہ تیراک پچھتر برس میں ایک بار ہماری فضائے آسمانی پر نمودار ہوتا ہے۔ اب میں دوبارہ اُسے صرف اپنے پوتوں کی آنکھوں سے دیکھ سکوں گا۔ میری ذہنی کیفیت عجیب و غریب تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا گویا کوئی چیز اپنی ناقابل بیان وسعتوں سمیت میرے وجود کی تنگ حدود میں سما گئی ہے۔ تاہم اس خیال نے کہ میں اس آوارہ مسافر کو پھر نہ دیکھ سکوں گا، مجھے اپنی ذاتی ہستی کی اندوہناک حقیقت کا احساس دلا دیا اور لحظہ بھر کے لیے میرے تمام ولولے سرد پڑ گئے۔''

حالتِ سکر میں

انجمن کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۶ اپریل ۱۹۲۲ء میں اُنھوں نے اپنی مشہور نظم، خضرِ راہ کوئی بیس ہزار کے مجمع کے سامنے پڑھی۔ اقبال کو ان دنوں نہ صرف تنہائی کا شدید احساس تھا، بلکہ بیمار بھی تھے۔ اس لیے نظم کے انداز بیان نے سامعین کو رُلا دیا۔ نظم پڑھتے ہوئے اقبال نے یہ شعر پڑھا تو رو پڑے۔

بیچتا ہے ہاشمی ناموس دینِ مصطفےٰ
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمان سخت کوش

اور جب اس شعر پر پہنچے تو خود بھی رو رہے تھے اور سارا

مجمع بھی اشکبار تھا۔

ہو گیا مانند آب ارزاں مسلماں کا لہو
مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

نظم خضرِ راہ کے متعلق بعض باتیں غور طلب ہیں۔ پہلی یہ کہ جن دنوں اقبال نے یہ نظم لکھنی شروع کی، ان پر نقرس کے مرض کا شدید حملہ ہوا اور کئی راتیں لگاتار بیداری کے عالم میں گزاریں۔ وہ انارکلی والے مکان کی بیٹھک سے ملحق کمرے میں اُٹھ آئے تھے اور رات کو عموماً علی بخش ان کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ ایک شب درد کی شدت کے سبب نیم بیہوشی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس کیفیت میں انھیں محسوس ہوا، گویا کوئی مردِ بزرگ اُن کے پاس بیٹھا ہے۔

کچھ دیر بعد وہ مردِ بزرگ اُٹھتا اور چل دیتا ہے۔ اس کے رخصت ہونے کے فوراً بعد اقبال نے علی بخش کو آواز دے کر بلایا اور اس مردِ بزرگ کے پیچھے دوڑایا تاکہ اسے واپس لے آئے۔ علی بخش کا بیان ہے کہ وہ بیٹھک کے فرش پر لیٹا اس وقت جاگتے ہوئے اقبال کو تنہائی میں کسی کے ساتھ باتیں کرتے سُن رہا تھا۔ رات کے قریباً تین بجے تھے۔ علی بخش تعمیلِ حکم میں پھرتی سے سیڑھیاں اُترا لیکن نچلے دروازے کو اندر سے مقفل پایا۔

دروازہ کھول کر بازار میں نکلا مگر ہُو کا عالم طاری تھا اور بازار کے دونوں طرف دور دور تک اسے کوئی بھی شخص دکھائی نہ دیا۔ سو ظاہر ہے کہ نظم تحریر کرتے وقت کسی مرحلہ پر اقبال حالتِ سکر سے گزرے، کیونکہ وہ بیمار تھے اور شدتِ درد کا عالم ایسا تھا کہ شعوری طور پر اس پر غالب آسکنا یا حالتِ صحو برقرار رکھ سکنا غالباً ان کے لیے ممکن نہ رہا تھا۔ علاوہ شدید تنہائی اور ہر طرف سے مخالفت کے سبب انھیں شاید اپنے آپ پر اعتماد نہ رہا تھا اور ان کے دل میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ ان کا موقف غلط ہے یا وہ صحیح راہ سے بھٹک گئے ہیں اور انھیں راستہ دکھانے والے کسی راہبر کی ضرورت ہے۔

اقبال اپنے محبوب صوفیہ کے مزاروں پر اکثر حاضری دیتے تھے۔ علماء و مشائخ کے طبقے میں جس کسی کی بھی شہرت سنتے، اس کی خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ کرتے۔ ان کے مہاراجہ کشن پرشاد کے نام چند خطوط سے ظاہر ہے کہ بعض بزرگ ہستیوں یا مجذوبوں کے متعلق سن کر ملاقات کے شوق میں ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

اسی طرح ایک دن لاہور سے چند میل کے فاصلے پر قصبہ شرق پور میں ایک نہایت متقی اور پرہیزگار بزرگ میاں شیر محمد کے متعلق سنا اور ان کی خدمت میں پہنچے۔ میاں شیر محمد ہمیشہ احترامِ شریعت پر اصرار کرتے تھے اور جو کوئی بھی انھیں ملنے آتا اسے ڈاڑھی رکھنے کی سخت تاکید کرتے۔ جب اقبال انھیں ملے تو وہ مسجد میں بیٹھے تھے۔ پوچھا: کیسے آئے ہو؟

جواب دیا: میرے لیے دعا کیجیے، فرمایا: تم ڈاڑھی منڈواتے ہو، میں تمھارے لیے دعا نہیں کروں گا۔

اقبال یہ سن کر اٹھے اور مسجد سے نکل کر تانگوں کے اڈے کی طرف چل دیے۔ اسی اثنا میں میاں شیر محمد کے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کسی نے کہہ دیا کہ یہ اقبال تھے۔ یہ سن کر میاں شیر محمد کی عجیب حالت ہوئی۔ مولانا عبدالمجید سالک تحریر کرتے ہیں:

”مسجد سے نکل کر ننگے پاؤں اڈے کی طرف دوڑے۔ علامہ تانگے پر سوار ہو ہی رہے تھے کہ یہ آن پہنچے۔ بے حد معذرت کی اور کہا کہ میں عام لوگوں کو ڈاڑھی رکھنے کی تاکید کرتا رہتا ہوں۔ لیکن میرے نزدیک آپ جیسے شخص پر جس نے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کے قلوب میں ایمان اور عمل کے چراغ روشن کر دیے ہیں، ڈاڑھی کے معاملے میں سختی کرنا مناسب نہیں۔ اس کے بعد علامہ کے لیے دعا کی اور علامہ مسرور و مطمئن واپس لاہور آئے۔“

(کتاب ”زندہ رود“ سے اخذ شدہ واقعات)

صبا عمران

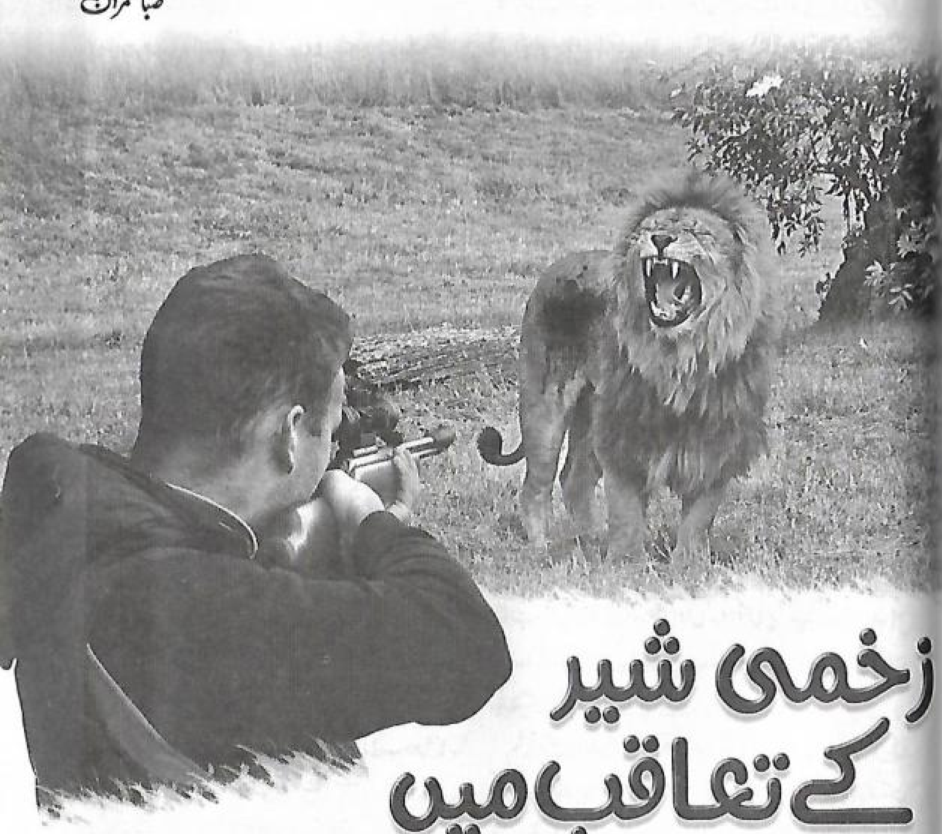

زخمی شیر کے تعاقب میں

موت دبے پاؤں ان بے خبر شکاریوں کا پیچھا کر رہی تھی کہ اچانک...

میں اپنے پرانے خستہ حال ریڈیو کی سوئیاں گھما رہا تھا۔ یہ میرا خوابوں کی دنیا سے رابطے کا واحد ذریعہ تھا پھر بھی مجھے ایک وجہ سے ناپسند تھا۔ میرے جیسے جنگل کے باسی کی خوابوں والی دُنیا بڑی سادہ تھی۔ جہاں صاف پانی نلکوں سے آتا تھا۔ جہاں نرم گدے والے بستر تھے اور گوشت کے لذیذ تازہ پکوان جن کی خوشبو بھوک بڑھا دیتی۔ زمبیا (افریقہ) کے

جنگلوں میں شکاری مہمات کی نگرانی پر مامور ایک افسر کے خواب شاید یہی ہو سکتے ہیں۔

میں بات کر رہا تھا اپنے قدیم ریڈیو کی جسے توجہ سے سُننا بعض اوقات زندگی اور موت کا مسئلہ بن جاتا تھا۔ اب بھی سوئیاں گھماتے گھماتے شکاریات کے افسر کی آواز گونجی۔ ٹرانسمیشن نہایت خراب تھی اور میں صرف یہ سُن پایا کہ شیر دریا کے پار چلا گیا ہے جلد از جلد وہاں پہنچو۔

آگے کچھ سمجھ نہ آیا۔ میں دوبارہ سوئیاں گھمانے لگا۔ کھیلوں کی خبریں آنے لگیں۔ میں سر جھٹکتے ہوئے دوبارہ آفیسر سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں بار بار دہرا رہا تھا: ”سر یہاں ٹرانسمیشن بالکل صاف نہیں آ رہی، میں آپ کا پورا پیغام نہیں سن پایا...... براہ مہربانی اپنا پیغام دہرا دیں۔“

اچانک گہرے سانس کی آواز اُبھری اور ساتھ ہی افسر کہنے لگا ”کیپسٹک، میں کہہ رہا ہوں کہ موبو کیمپ کے علاقے میں ایک زخمی شیر دریا پار کر کے جنگل میں داخل ہو گیا ہے۔ عام لوگوں کو اُس علاقے میں جانے کی اجازت نہیں۔ تم وہاں جاؤ، تمام تفصیلات اکٹھی کرو اور اُس شیر کا خاتمہ کر دو۔ اس سے پہلے کہ وہ آدم خور بن جائے کیونکہ اب وہ شکار نہیں کر سکتا۔“

وہ علاقہ ایک نجی کمپنی کو ٹھیکے پر دیا گیا تھا۔ کئی سو میل پر پھیلے اس جنگلی علاقے میں سات سے آٹھ سفاری کیمپ تھے جو شکار اور علاقے میں سیر و تفریح کرنے کا پورا انتظام کرتے تھے۔ کبھی اُن میں سے ایک میرا بھی ہوا کرتا تھا۔ پھر میں نے محکمہ شکاریات کا افسر بننے کا ایسا احمقانہ فیصلہ کر لیا جو ایک افریقی ناول کا مرکزی کردار بن سکتا ہے۔ حالانکہ سفاری کیمپ سے میں نے اتنا پیسہ کما لیا تھا کہ چاہتا تو واپس امریکا جا کر پارک ایونیو میں شاندار حویلی لے سکتا تھا۔ مگر میں نے سب چھوڑ کر اس ڈراؤنی اور خوفزدہ زندگی کا انتخاب کر لیا تھا۔ شکار کا شوق ہی مجھے اس معمولی نوکری میں خوار کروا رہا تھا۔

ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ میں ایک ماہر شکاری تھا۔ میں نے کئی درندے شکار کیے اور بے شمار لوگوں کی ان سے جان بچائی تھی۔ خصوصاً دوسرے لوگوں کے زخمی کیے ہوئے جھگڑالو شیروں سے مقابلہ کرنا میری خاص مہمات میں شامل تھا۔

”ہیلو! ہیلو!...... تم سن رہے ہو؟......“ اتنے میں افسر کی آواز دوبارہ گونجی۔

”راجر، راجر...... چیف، میں نے سن لیا ہے اور اب تمام بات مجھے سمجھ آ گئی۔ میں کل صبح ہوتے ہی روانہ ہو جاؤں گا“

”نہیں...... نہیں کیپسٹک، تم آج رات ہی جاؤ۔ اپنی جمائیاں روکو اور تیاری کرو۔“ چیف کی آواز دوبارہ گونجی۔

میں نے ناگواری سے آنکھوں کو سکیڑا مگر بولا ”ٹھیک ہے جناب، میں سامان باندھتا ہوں۔ واپسی پر آپ سے بات ہو گی۔ اللہ حافظ۔“ یہ کہہ کر میں نے ریڈیو بند کیا اور اپنا سامان بیگ میں ڈالنے لگا۔

آدھی رات کا وقت تھا جب میں جارج کے سفاری کیمپ پہنچا۔ جارج میرا پرانا دوست تھا۔ کیمپ کے باہر لالٹین جل رہی تھی۔ جارج نے ایک ملازم کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ میں نے جارج کو گلے لگایا۔ وہ شیر کے فرار ہو جانے پر شرمندہ اور رنجیدہ تھا۔ میں نے اُسے تھپکی دے کر تسلی دی کہ وہ گھبرائے نہیں، شیر جلد مارا جائے گا۔

جارج کا شکاری دراصل ایک وکیل تھا جو شکاگو سے آیا تھا۔ اُنھوں نے پنجوں کے نشان دیکھ کر چارہ ڈالا۔ جب قسمت مہربان ہوئی تو ایک نر اور دو شیرنیاں اُن کے نشانے پر آ گئے۔ نر بہت بڑا اور شاندار ببر شیر تھا۔ وکیل

صاحب نے اُسی کا نشانہ باندھا مگر وہ چُوک گیا۔ شیر ڈھیر ہونے کے بجائے کمر پر زخم لیے جنگل کی طرف بھاگ گیا۔ اس سے پہلے کہ جارج اُسے ختم کرتا وہ گھنے جنگل میں غائب ہو چکا تھا۔

جارج ساری کہانی سنا کر چھڑی سے جلتی لکڑیوں کی آنچ تیز کرنے لگا جو مدہم ہوتی ایک دم سُرخ ہو کر بھڑک اُٹھی۔ دریا قریب ہی تھا۔ تھوڑی دیر بعد رات کی خاموشی میں دو گینڈوں کی آواز گونجی جو شاید پانی پینے آئے تھے۔

جارج نے سگریٹ جلایا اور مزید کہنے لگا ”تم جانتے ہو یہاں زمبیا میں قانون کافی سخت ہے۔ شیر ممنوعہ علاقے میں داخل ہو گیا ہے اور میں اُسے مار کر غیر قانونی شکار کے جرم میں جیل نہیں جانا چاہتا۔“ میں نے گردن ہلا دی جیسے مجھے اُس سے اتفاق ہے مگر دل میں یہی سوچ رہا تھا، ہاں!...... تم خود مصیبت سے بچ گئے اور مجھے آفت میں ڈال دیا۔

سچ یہ ہے کہ ایک زخمی شیر دنیا کی سب سے خطرناک اور ہولناک چیز بن جاتا ہے۔ وہ اپنے پیچھے آنے والوں کا عبرت انگیز حشر کرتا ہے۔ میں خود کو تسلی دینے لگا کہ شاید زخم گہرا ہو اور شیر دوسرے کنارے پر پہنچ کر مر چکا۔ یہ خیال کچھ سکون بخش تھا۔ مجھے نیند آنے لگی اور جلد ہی میں پُرسکون وادی میں پہنچ گیا۔

صبح بہت جلد ہو گئی۔ میں اُٹھ کر تیار ہوا، چائے پی اور جارج کی طرف چل پڑا۔ جارج نے عین اُس مقام کی نشاندہی کی جہاں سے شیر دریا پار گیا تھا۔ مجھے گزشتہ تجربات سے علم تھا کہ دریا سے چند سو گز کے فاصلے پر ایک گھاٹی ہے۔ میں نے اپنی ۴۷۰ نائٹرو ڈبل رائفل تیار کی اور پانی کی تھرماس اور دوپہر کا کھانا جارج سے لے کر چل پڑا۔

جارج کا ملازم ہنسن میرے آگے تھا۔ ہم نے گولی لگنے کے مقام کا دوبارہ معائنہ کیا۔ ہنسن کے مطابق گولی شیر کی آنتوں میں لگی تھی اور زخم کافی گہرا تھا۔ اس کی پیشن گوئیاں اور اندازے اکثر درست ثابت ہوتے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ سو فیصد درست کہہ رہا ہے۔ شیر کو گولی میگنم رائفل سے ماری گئی تھی۔ میرا تجربہ بتاتا تھا کہ اُس رائفل کی گولی جسم کے اندر ہی رہتی ہے۔

جارج نے مزید بتایا، جو مادہ شیرنیاں شیر کے ساتھ تھیں، وہ گولی چلتے ہی غائب ہو گئیں۔ اُس نے اُنھیں شیر کے ساتھ دریا پار کرتے نہیں دیکھا تھا۔ مگر ممکن تھا کہ وہ رات کو دریا پار چلی گئی ہوں۔ بہر حال خوش فہمی تو تھی کہ ہمیں شیر تنہا ہی ملے گا۔ حملہ کرنے میں شیرنیاں شیر سے زیادہ تیز اور پھرتیلی ہوتی ہیں۔ مشرقی افریقہ میں اگر نر اور مادہ اکٹھے نظر آئیں تو پہلے شیرنی کو گولی ماری جاتی ہے مگر یہاں وکیل صاحب شیر پر وار کر چکے تھے۔

میرے ساتھ ہنسن کے علاوہ سنی بھی تھا، ایک ماہر کھوجی۔ وہ ماضی میں آدم خور شیر کو مارنے میں میری مدد کرتے ہوئے اپنے ایک بازو کی قربانی دے چکا تھا۔ آدم خور نے اُس کا بازو بُری طرح چبا ڈالا تھا۔ سنی دریا کے کنارے ریت پر نشان ڈھونڈنے لگا۔ وہ محکمے کا ملازم نہیں تھا مگر مجھے اس کی صلاحیتوں پر پورا اعتبار تھا اس لیے میں اپنی تنخواہ میں سے اُسے کچھ رقم دے کر اپنے ساتھ شامل کر لیا کرتا۔

نشانات اچھی طرح دیکھنے کے بعد سنی نے ایک سمت اشارہ کیا اور مسکراتے ہوئے بولا ”چلو آؤ، اب اس قصے کو تمام کریں۔“ اس نے اپنے جوتے اُتار کر گلے میں ڈال لیے۔ میں نے بھی اُس کی پیروی کی۔

دریا میں گھٹنے گھٹنے پانی تھا۔ دریا پار کرتے ہی شیر کے پنجوں کے نشان دکھائی دیے۔ یہ چوبیس گھنٹے پرانے تھے مگر نمی والی جگہ ہونے کی وجہ سے بالکل تازہ لگتے تھے۔ کنارے سے تقریباً ۱۵۰ گز دور خون کے بڑے بڑے دھبے جھاڑیوں میں غائب ہوتے دکھائی دیے۔ نشان بتا رہے تھے کہ وہاں شیر نے اپنا بدن خشک کیا تھا۔

خون کے دھبے بتا رہے تھے کہ زخم کافی گہرا ہے اور شیر شدید تکلیف میں ہے۔ ایسا شیر وحشی اور پاگل ہو جاتا ہے۔ اب ہم پہلے سے چوکنے ہو گئے۔ عین ممکن تھا وہ سامنے ہی موجود کسی جھاڑی میں بیٹھا اپنے زخم چاٹتا ہمارا انتظار کر رہا ہو۔ ایک زخمی شیر کو شکار کرنا جان جوکھم کا کام ہے۔ ذرا سی غلطی بھی مہنگی پڑ سکتی ہے اور اس کی سزا شرمندگی نہیں موت ہی ہوتی ہے۔

دریا سے ساٹھ گز دور آ کر شیر دوبارہ لیٹا تھا۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد وہ پھر چل پڑا۔ اس کے بعد ایک بڑے گھنے درخت کے نیچے لیٹا۔ وہاں خون کا بڑا سا دھبہ ایک گھنٹے سے زیادہ پرانا نہیں تھا۔ مطلب یہ کہ اب ہم شیر کے قریب ہی پہنچ چکے تھے۔ گرمی ایک دم ہی بڑھ گئی کہ یہ صرف سورج کی حدت نہیں تھی، یہ شیر کی قربت کا احساس تھا جس نے ہمارا خون گرما دیا۔ یہی لگا جیسے بھری محفل میں کوئی گھور رہا ہے۔ ہمارے اندازے درست ثابت ہوئے۔ ۳۰ گز دور ہمارے عین سامنے موجود جھاڑیوں کے جھنڈ سے ایک خوفناک غراہٹ سنائی دی اور پھر ایک اور...... ہمیں لگا جھاڑیوں میں بہت سارے شیر موجود ہیں۔

شیرنیاں یقیناً شیر کے پاس پہنچ چکی تھیں۔ اب مزید آگے بڑھنا موت کو دعوت دینے کے برابر تھا۔ سنی نے اپنی جیب سے ایک سکہ نکال کر جھاڑیوں کی طرف اُچھالا اور پھر لال ڈاڑھی والے بڑے زخمی نر کا سر نظر آیا جو جھاڑیوں سے نکل کر اندھا دھند بھاگتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا۔ میں نے اُس کے سینے کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔ وہ یوں اُچھلا جیسے اُس پر بجلی گری ہو اور پھر گر کر ٹھنڈا ہو گیا۔ اُسی لمحے دو شیرنیاں جھنڈ سے نکلیں اور بھاگتی ہوئی ہم سے صرف ۱۵ گز دور آ کر رُک گئیں۔ وہ شش و پنج میں تھیں کہ حملہ کریں یا نہیں۔ اُن کی دُمیں تیزی سے ہل رہی تھیں۔

صورتحال بڑی دلچسپ تھی اور گمبھیر بھی...... دو ناراض بپھری ہوئی شیرنیاں...... حملے کو تیار...... اور میری رائفل میں صرف ایک گولی...... اگر میں ایک کو مارتا تو اتنی دیر میں دوسری حملہ کر کے مجھے چیر پھاڑ دیتی۔ اور اگر سنی اُسے نیزے کی مدد سے روک بھی لیتا تو اُس کے دوبارہ زخمی ہونے کی قوی اُمید تھی۔

شیرنیاں بہت خوبصورت تھیں۔ اُن کی غراہٹیں جاری رہیں۔ ہم نے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ میں بلاوجہ اُنھیں مارنا نہیں چاہتا تھا سو جو گولی رائفل میں موجود تھی، میں نے اُن کے پیروں پر چلا دی۔ اُنھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر جیسے فیصلہ کر لیا۔ وہ غراتی ہوئی پیچھے ہٹنے لگیں اور پھر ایک سمت بھاگتی گھنے جنگل میں غائب ہو گئیں۔

شیرنیوں نے رات کو ہی دریا پار کر لیا تھا۔ واپسی پر ہمیں اُن کے پنجوں کے نشان بھی مل گئے۔ یہ اس جگہ سے تقریباً سو گز دور تھے جہاں سے شیر نے دریا پار کیا تھا۔ اگر ہم نے دریا پار کرنے کے بعد کنارے کا پوری طرح جائزہ لیا ہوتا تو ہم اُن کی موجودگی سے یقینی طور پر باخبر ہوتے، مگر زندگی شاید سیکھنے کا نام ہے اور ہم ہر لمحہ تجربات ہی سے سبق سیکھتے ہیں۔ ●●●

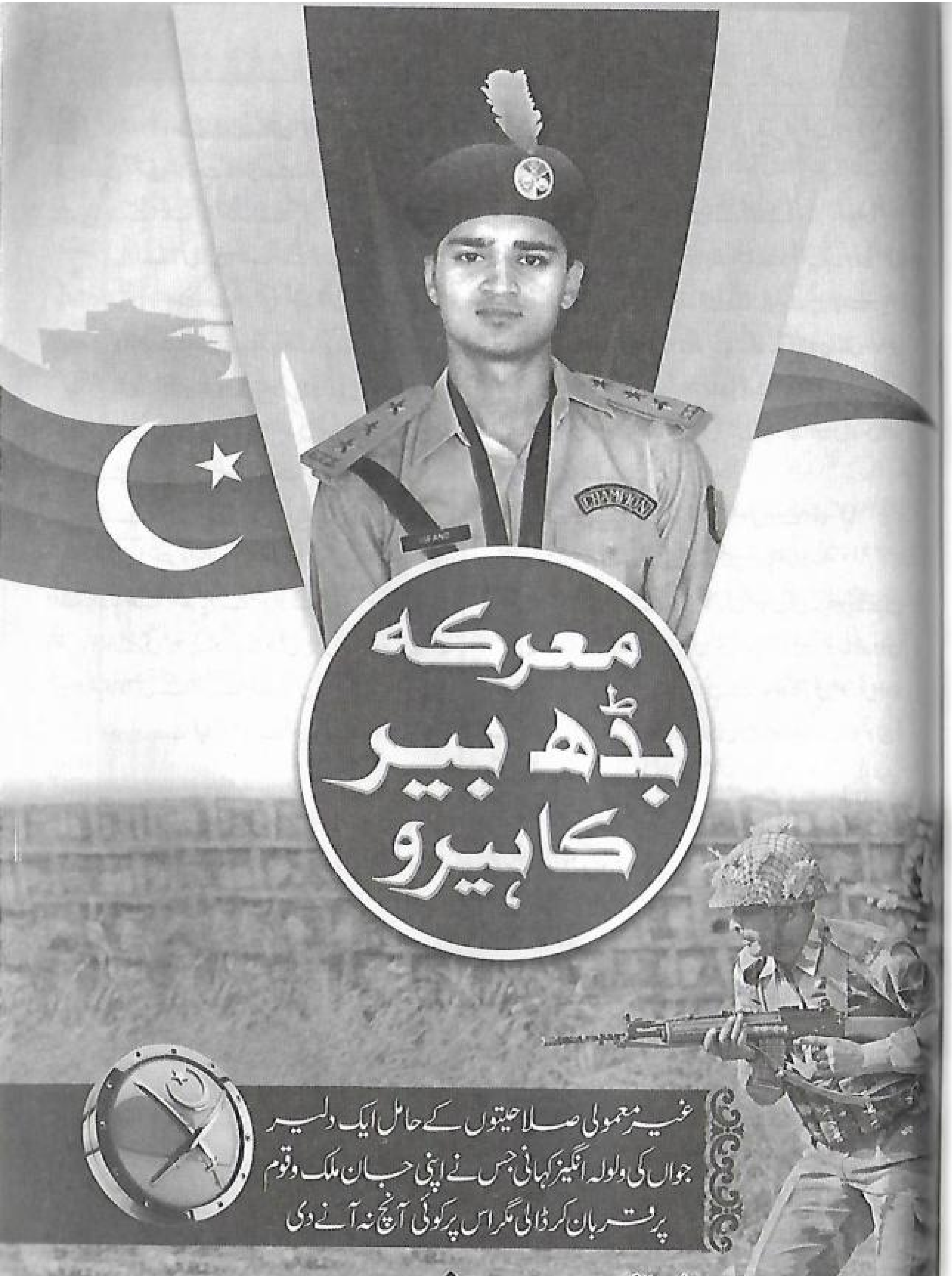

معرکہ بڈھ بیر کا ہیرو

غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل ایک دلیر جواں کی ولولہ انگیز کہانی جس نے اپنی جان ملک وقوم پر قربان کر ڈالی مگر اس پر کوئی آنچ نہ آنے دی

پروفیسر محمد ظہیر قندیل

۵ ستمبر ۲۰۱۵ء، ہفتے کا دن، کیپٹن اسفندیار بخاری کے ساتھ اہل خانہ کی آخری ملاقات کا دن ہے۔ وہ صرف چند گھنٹے کے لیے پشاور سے اٹک آیا تھا۔ اسے چھٹی نہیں مل رہی تھی لیکن سسرال والے اس دن اٹک آئے ہوئے تھے، اس لیے کچھ گھنٹوں کی رخصت لے گھر پہنچ گیا۔ اس دن اسفندیار کچھ زیادہ ہی خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ امی نے مہمانوں سے کہا: ''دیکھیے ہمارا چاند آج کچھ زیادہ ہی چمک دمک رہا ہے۔۔۔ مہمان چلے جائیں تو مجھے اسفند کی نظر اتارنا ہے۔'' رات کو آٹھ بجے جب وداعِ شہید کا وقت قریب آیا تو ماں اسے اپنے کلیجے سے لگائے بہت دیر تک پیار کرتی رہی۔

کیپٹن اسفند واپس پشاور پہنچا تو اس کا اردلی، شہزاد انتظار کر رہا تھا۔ اسفندیار نے شہزاد سے کہا: ''شہزاد! میرے دفتر جاؤ اور میری میز پر جو ایک فائل پڑی ہے وہ لے آؤ۔'' شہزاد گیا اور اس کے دفتر سے متعلقہ فائل لے آیا۔

اسفندیار نے کہا: ''میرے شہزادے! اب جا کر سو جاؤ۔''

شہزاد کہتا ہے: ''میں نے سر کو جواب دیا، سر آپ بھی سو جائیں! رات کا ایک بج چکا، صبح کام کر لیجیے گا۔'' صاحب مسکرائے اور ہنستے ہوئے بولے:

''لوگ کہتے ہیں فوج میں بڑی موج ہے۔ میں کہتا ہوں فوج کی وجہ سے لوگوں کی موج ہے۔ فوج جاگتی ہے تو عوام موج اور مزے میں سوتے ہیں۔ شہزاد! مجھے ابھی بہت کام کرنا ہے، تو جا کر آرام کر۔۔۔'' یہ کہہ کر لیپ ٹاپ پر فائل کھول کر کچھ کام کرنے لگے۔ جانے کب سوئے، میں ایک بجے جا کر سو گیا تھا۔''

شہزاد اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے: ''۱۸ ستمبر کو منہ اندھیرے ہی ۵:۴۰ پر مجھے صاحب کی کال آئی۔ میں فوراً ان کے کمرے میں پہنچا تو انھوں نے مجھ سے کہا: ''شہزاد! فوراً میری وردی تیار کرو، مجھے بہت جلد نکلنا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ غسل خانے میں تشریف لے گئے۔ ان کے چہرے پر بہت زیادہ پریشانی کے آثار میں نے دیکھ لیے تھے۔ جتنی دیر میں وردی تیار ہوئی، صاحب شیو کر کے اور منہ ہاتھ دھو باہر تشریف لا چکے تھے۔ اس دن انھوں نے غسل بھی نہیں کیا۔ فوراً وردی پہنی اور باہر کی طرف بھاگ گئے۔

ناشتے کا میں پوچھتا رہا لیکن انھوں نے اتنا کہا: ''ٹائم نہیں ہے۔۔۔'' میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

''صاحب باہر نکلے تو فوجی گاڑی کھڑی تھی۔ باہر نکلتے ہی انھوں نے ڈرائیور سے چابیاں لیں اور ڈرائیور کو ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے کو کہا۔ نہایت تیزی کے ساتھ گاڑی موڑی اور یہ جا وہ جا۔ میں دیکھتا ہی رہا۔ کچھ ہی دیر بعد صاحب کا فون آ گیا اور وہ مجھ سے کہنے لگے: ''شہزاد! فوری طور پر لائٹ کمانڈوز کے میجر صاحب کا نمبر مجھے ایس ایم ایس کرو۔'' میں فوراً ان کی کمپنی گیا اور وہاں سے میجر صاحب کا نمبر لے کر انھیں بھیج دیا۔

''اسی وقت مجھے بریگیڈیئر صاحب کا اردلی، اصغر مل گیا۔ میں نے اس سے کہا 'یار آج صاحب بہت جلدی اور پریشانی میں نکلے ہیں۔ اللہ خیر کرے۔ کچھ تمھیں خبر ہے؟' اس نے بھی بے خبری کے عالم میں سر ہلا دیا۔ تقریباً سات بجے مجھے پتا چلا کہ بڈھ بیر ایئر فورس کیمپ پر دہشت گردوں نے حملہ کر دیا ہے۔

''میں پریشان ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے صاحب سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر ان سے بات نہ کر سکا۔

ساڑھے نو بجے قریب اٹک سے کیپٹن صاحب کی باجی کا فون آیا کہ صاحب کہاں ہیں؟ میں نے انھیں بتایا کہ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ انھوں نے کہا، جب واپس آئیں تو انھیں بتانا کہ آپ کی امی کا فون آیا تھا۔ جب واپس آئیں تو مجھے فون کر لیں۔۔۔ مگر پھر وہ واپس نہ آ سکے۔'' یہ کہتے ہوئے شہزاد کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔

بڈھ بیر پشاور کا نواحی قصبہ ہے۔ وہاں کا ایک بہت بڑا علاقہ ۱۹۵۹ء میں امریکا کو دس سال کی لیز پر دے دیا گیا تھا جہاں امریکا نے اپنا ایک ہوائی اڈا قائم کر لیا تا کہ وہ یہاں سے روس پر نظر رکھ سکے۔ اس اڈے سے جاسوسی جہاز ''یو ٹو U2'' اڑائے جاتے اور سوویت یونین کی نگرانی کی جاتی۔ مئی ۱۹۶۰ء میں روسیوں نے امریکی جاسوسی جہاز کو ریڈار کے ذریعے پکڑا اور اپنے طیاروں کی مدد سے نیچے اُتار لیا۔ پائلٹ گرفتار ہوا۔ روسیوں کو جب یہ پتا چلا کہ 'یوٹو' پشاور کے قریب بڈھ بیر ایئربیس سے اڑ کر آیا تھا تو انھوں نے نقشے پر بڈھ بیر کے اردگرد سرخ دائرہ کھینچ کر شہر کی اینٹ سے اینٹ بجانے کی دھمکی دے دی۔ جنوری ۱۹۷۰ء میں امریکا سے یہ ایئربیس واپس لے لی گئی اور اسے پاکستان ایئربیس کا بیس کیمپ بنا دیا گیا۔

پشاور میں کیپٹن اسفندیار کے بریگیڈ کمانڈر، بریگیڈیئر عنایت بتاتے ہیں: ''جوں ہی مجھے یہ خبر ملی کہ دہشت گردوں نے بڈھ بیر کیمپ پر اپنے ناپاک قدم رکھے ہیں تو میں نے فوری طور پر اسفندیار کو فون کیا اور اسے بتایا کہ فوری طور پر چلا آئے۔ اس نے بہت تیزی سے اپنی ٹرانزٹ پلاٹون کو متحرک کر دیا۔ جب میں باہر نکلا تو کیپٹن اسفندیار بخاری باہر بالکل تیار اور مستعد کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی سیلوٹ کیا اور کہا: ''سر! جلدی کیجیے کہیں دیر نہ ہو جائے۔ اللہ نہ کرے کہ کوئی سانحہ ہو جائے۔ وہاں اسکول بھی ہے اے پی ایس، ہم

تعارف

کیپٹن اسفندیار بخاری شہید پر زیرِ نظر مضمون ایک کتاب ''معرکہ بڈھ بیر کا ہیرو'' سے بصد شکریہ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب پروفیسر محمد ظہیر قندیل کے موئے قلم کا اعجاز ہے جو کیپٹن اسفندیار شہید کے استاد بھی رہ چکے۔ انھوں نے کتاب میں نہایت احترام، محبت اور ولولے سے شہید شاگرد کے حالات زندگی رقم کیے ہیں۔ یہ منفرد کتاب قاری کے جذبہ حب الوطنی کو مہمیز دیتی اور اُسے بھی ملک و قوم کی خاطر کارنامہ ہائے انجام دینے پر اُکساتی ہے۔

یہ کتاب بخاری لیبارٹری، ۲۳۔کیپٹن اسفندیار روڈ، اٹک شہر۔ فون نمبر: ۰۳۲۲۷۰۱۰۱۰۱ سے دستیاب ہے۔

کیپٹن اسفندیار شہید کا آخری دیدار

نہیں چاہتے کہ پشاور جیسا کوئی واقعہ دہرایا جاسکے۔"

ہم بجلی کی طرح وہاں سے نکلے۔ میں نے اپنا وائرلیس سیٹ اسفندیار کو دے دیا اور کہا کہ سب سے ضروری رابطہ کرواور موجودہ صورت حال سے باخبر رکھو۔ پھر اسفندیار تازہ خبریں پہنچاتا رہا۔ اس نے بتایا: "دہشت گرد دو گروہوں میں بٹ کر دونوں دروازوں سے اندر داخل ہوئے ہیں... لڑائی شدت سے جاری ہے... دونوں اطراف سے شدید فائرنگ کا تبادلہ ہورہا ہے... وہ اندر اقامتی کالونی میں جانا چاہتے ہیں... سر! اگر یہ لوگ وہاں چلے گئے تو بہت خوف ناک نتیجہ نکل سکتا ہے۔"

میں نے دیکھا کہ اسفندیار کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اُڑ کر وہاں پہنچ جائے۔ اس کے ہاتھوں، انگلیوں کی حرکات اور چہرے سے صاف لگتا تھا کہ وہ شدید تناؤ میں ہے۔ کہنے لگا "سر! یہ درندے ہیں اور بھیڑیے... انھوں نے وہاں جا کر نہ بچہ دیکھنا ہے نہ عورت، نہ جوان، نہ بوڑھا، سب کے ساتھ بہیمانہ سلوک کریں گے... سر یہ انسانی بدن میں بھیڑیے ہیں... وہ کالونی کے لوگوں کو اپنی ڈھال بنا لیں گے تو ہمارے لیے آپریشن مشکل ہو جائے گا... انھیں وہاں نہیں جانے دینا چاہیے... (وہ مسلسل بولے جارہا تھا)... خبیثو! ہمیں پہنچنے دو... تمہیں عبرت کی مثال بنا دیں گے آج... بس ہمارا انتظار کرو۔ ہم ۶:۲۵ پر بڈھ بیر پہنچ گئے۔"

بڈھ بیر بازار سے ایک سڑک ائیر بیس کی جانب جاتی ہے۔ سڑک کے دونوں طرف وہاں کے ملازمین کی کالونیاں ہیں۔ اس سڑک کا نام انقلاب روڈ ہے۔ بیس کیمپ کے دونوں گیٹ آمنے سامنے ہیں۔ اب سیکورٹی کی وجہ سے ایک گیٹ کو ذرا آگے کر دیا گیا ہے۔

بریگیڈیئر عنایت اور کیپٹن اسفندیار بخاری جب ائیر بیس پر پہنچے تو انھیں شدید فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ دونوں فوری طور پر کنٹرول روم پہنچے تو معلوم ہوا کہ ۱۲ پنجاب کی کوئیک ری ایکشن فورس کے کمانڈر میجر حسیب زخمی ہو گئے ہیں اور انھیں سی ایم ایچ پشاور بھیج دیا گیا ہے۔ اسفندیار نے بریگیڈیئر عنایت سے درخواست بلکہ التجا کی کہ اسے کمانڈ دی جائے۔ انھوں نے اسے منع کرتے ہوئے کہا: "کیپٹن اسفند! میجر صاحب کے بعد دوسرے آفیسر موجود ہیں، جن کی ذمہ داری ہے اور وہ نبھا رہے ہیں، آپ ایک اسٹاف آفیسر ہیں، آپ کو کیسے اجازت دی جاسکتی ہے۔؟"

اسفندیار نے ضد کی: "سر! وہ کپتان ناتجربے کار اور جونیئر ہیں جبکہ دہشت گرد خوب تجربے کار اور جدید اسلحے سے لیس ہیں۔ مجھے ایک ہی خطرہ ہے کہ وہ کالونی کے سینکڑوں لوگوں کو یرغمال نہ بنا لیں۔ سر! پلیز... پلیز... پلیز مجھے جانے دیں... میں انھیں ایسا سبق سکھاؤں گا کہ ان کی نسلیں یاد رکھیں گی۔ انھیں بطخیں بنا بنا کر شکار کروں گا۔" بالآخر اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالتے ہوئے بریگیڈیئر عنایت نے اسے اجازت دے دی۔

بریگیڈیئر عنایت صاحب کہتے ہیں: "حالانکہ میں نے بادل ناخواستہ اسفندیار کو اجازت دی مگر مجھے اس کی صلاحیتوں پر بہت بھروسا اور اعتماد تھا اور اس وقت اس سے بہتر کوئی آپشن بھی نہیں تھا۔ میں نے اسے مکمل طور پر مسلح ہونے کا کہا اور خود گاڑی میں بیٹھ کر اگلی کسی خبر کے ملنے کا انتظار کرنے لگا۔ اچانک مجھے نہایت قریب سے فائر کی آواز آئی۔ میں چونک گیا۔ مڑ کر دیکھا تو اسفندیار مسکرا رہا تھا، اس نے میری حیرانی دیکھتے ہوئے کہا: "سر! میں اپنے اسلحے کی پڑتال کر رہا تھا۔" وہ پھر چیتے کی سی پھرتی سے آگے بڑھا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اپنے ہی بیٹے کو محاذ جنگ کی طرف جاتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ میں نے اسے پیچھے سے آواز دی اور کہا: "اسفند کیا تم مکمل مسلح ہو؟"

اس نے دور سے ہاتھ بلند کر کے کہا: "سر او کے" اور پھر اسفندیار وہاں سے دشمن کی جانب چلا گیا۔"

کمانڈ ملتے ہی اسفندیار گاڑی میں بیٹھا اور سب سے پہلے اس نے اپنی فورس کے جوانوں کو منظم کیا۔ پھر ان راستوں کو مکمل طور پر بند کروا دیا جو اقامتی کالونی کی جانب جاتے ہیں، پھر وہاں موجود مسجد کا چاروں طرف گھوم کر جائزہ لیا اور آگے بڑھ کر اپنی گاڑی دہشت گردوں کے مزید قریب لے گیا۔ دہشت گرد چھپ چھپ کر بیرکوں سے فائرنگ کر رہے تھے۔

اسفندیار نے دہشت گردوں کی جانب فائر کھول دیا۔ انھوں نے گاڑی پر شدید جوابی کارروائی شروع کر دی۔ اس کی یہ چال انتہائی کامیاب رہی، اس طرح اسفندیار نے دہشت گردوں کے ٹھکانوں کا پتا معلوم کر لیا۔ ریکی مکمل کر کے وہ واپس آگیا اور پھر ان پر فوری قابو پانے کا مکمل منصوبہ بنا لیا۔

اس کے بعد اسفندیار نے وہ فیصلہ کیا جو بالکل اس کے شایان شان تھا۔ اس نے سب کچھ فراموش کر دیا۔ وہ بھول گیا کہ وہ ایک اعزازی شمشیر یافتہ کپتان ہے۔ اس نے فراموش کر دیا کہ وہ جی تھری کپتان ہے۔ اسے فوج میں اپنا تابناک مستقبل بھی بھول گیا۔ اسے راہ دیکھتی اپنی ماں بھی بھلانا پڑ گئی جو اس کے ماتھے پر سہرا سجا دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے اپنے ابو بھی بھول گئے جو اس کی پیدائش سے اس کے بہترین دوست اور راہنما تھے، اسے بھائیوں کا خلوص و محبت بھی یاد نہ رہی۔ اسے یاد رہے تو بس وہ درندے جنہوں نے وطن کی عزت داغدار کرنے کے ناپاک عزائم بنا رکھے تھے۔ اسے یاد رہے تو وہ معصوم اور بے گناہ لوگ جو ان درندوں کا بآسانی نشانہ بن سکتے تھے۔ اسے یاد رہے تو وہ شہدا جن کو وہ مسجد میں خون سے لت پت دیکھ چکا تھا۔ اسے یاد رہے تو وہ وحشی قاتل جو سینکڑوں لوگوں کی موت سے اپنی پیاس بجھانا چاہتے تھے۔

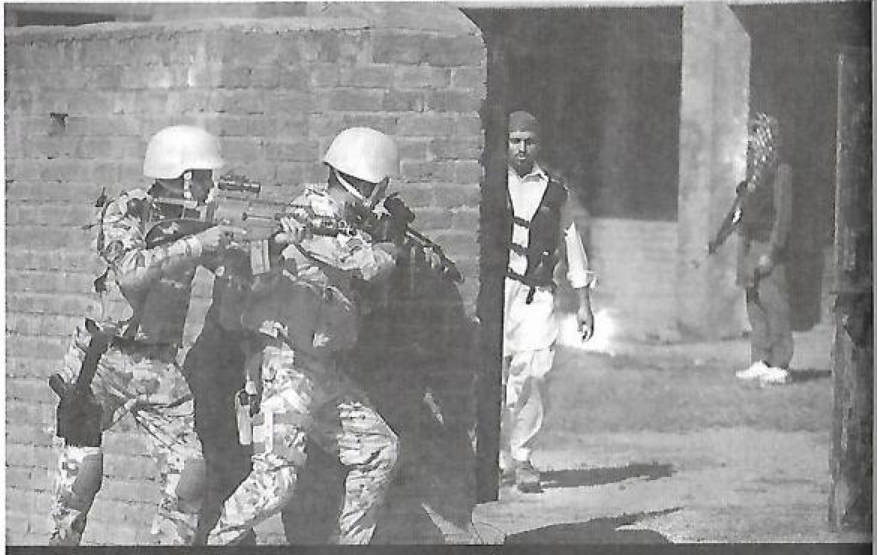

شاہین دہشت گردوں کو تلاش کرتے ہوئے

کیپٹن اسفند یار نے رضاکارانہ طور پر ۱۲ پنجاب اور ۱۵ بلوچ کے جوانوں کی قیادت کی تھی۔ اس نے اپنے منصوبے کے مطابق ایک متبادل راستے کا انتخاب کیا تاکہ جو دہشت گرد عمارت کے اندر موجود ہیں اور فائرنگ کرتے ہوئے کالونی کی طرف جانا چاہتے ہیں، ان کا راستہ روک کر انھیں وہیں ختم کر دیا جائے۔

اس کے ساتھی، کیپٹن اعجاز بتاتے ہیں: ''اسفند یار کی حکمت عملی کے باعث تمام راستے سیل کر دیے گئے اور دہشت گرد ایک مخصوص علاقے تک محدود ہو کر رہ گئے۔ اب وہ بیرکوں کے اندر ہی سے ہماری گاڑی کی طرف فائرنگ کر رہے تھے۔ تب کمانڈر اسفند یار کے ایک عجیب فیصلے نے سب کو حیران کر دیا۔ انھوں نے کہا: ''ہمیں گاڑی سے باہر نکلنا ہوگا۔''

''میں نے ان سے کہا: ''سر یہ خطرناک ہو سکتا ہے، وہ ہمیں سامنے پا کر چھوڑیں گے نہیں'' مگر انھوں نے کہا'' آپ لوگ فائرنگ جاری رکھیں، میں موقع پا کر نکلتا ہوں، ورنہ یہ دہشت گرد شدید فائرنگ کا فائدہ اُٹھا کر کالونی کی جانب چلے جائیں گے اور پھر اے پی ایس کی طرح کا کوئی سانحہ ہو جائے گا اور میں کسی قیمت پر ایسا نہیں چاہتا۔''

یوں انھوں نے اپنے فرائض سے بھی بڑھ کر وطن کی خدمت کے لیے خود کو پیش کیا۔ انھوں نے بہترین کمانڈ کی۔ اس دن میں ان کی قائدانہ صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوا۔ پھر وہ شدید جاری فائرنگ میں گاڑی سے باہر کود گئے اور دہشت گردوں پر قہر الٰہی بن کر ٹوٹ پڑے۔ ایک خارجی، مسجد کی طرف جا کر زخمی لوگوں پر فائرنگ کرنے لگا۔ کیپٹن اسفند یار نے سب سے پہلے اپنا نشانہ بناتے ہوئے اُسے بھون کر رکھ دیا۔ عمارت کے ایک ستون کی آڑ سے وہ مسلسل دہشت گردوں کو اپنا نشانہ بنا رہے تھے۔''

اس آپریشن کے چشم دید گواہ، نائیک محمد شفیق کا کہنا ہے: ''اٹھارہ ستمبر کی صبح میں اور نائیک طارق کیانی نماز فجر پڑھنے بڈھ بیر کیمپ میں واقع مسجد آئے۔ وہاں کافی نمازی پہلے ہی سے موجود تھے۔ ہم نے وضو کیا اور سنتیں ادا کیں۔ ابھی فرض نماز کھڑی ہونے میں کچھ دیر باقی تھی لہٰذا ہم درود شریف اور وظائف پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ اسی دوران وضو کے مقام پر فائرنگ ہو گئی۔ ہم نے گھبرا کر دیکھا کہ یہ فائرنگ کی آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ اسی وقت دو آدمی اندر آ کر کہنے لگے: ''دہشت گردوں نے حملہ کر دیا ہے، ہم آپ کو بچانے آئے ہیں۔ سب لوگ ایک طرف اکٹھے ہو جائیں۔''

سبھی نمازی گھبرا کر ایک جگہ جمع ہونے لگے۔ اچانک اُن دونوں نے نمازیوں پر فائر کھول دیا۔ یہ قیامت خیز منظر تھا۔ زخمی نمازی فرش پر، ایک دوسرے پر گر رہے تھے۔ دہشت گردوں نے مسجد کے اندر بھی جوتے پہن رکھے تھے اور وہ کہیں سے مسلمان نہیں لگتے تھے۔ ان کے چہروں پر لعنت برس رہی تھی۔ اتنا ہولناک منظر دیکھ کر مجھے چکر آ گئے اور میں بے ہوش ہو کر فرش پر گر گیا۔

''جب مجھے ہوش آیا تو مسجد کے باہر سے فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مسجد میں بہت سے لوگ شہید ہو چکے تھے جن میں میرا دوست نائیک طارق کیانی بھی شامل تھا۔ بہت سے زخمی آہ و بکا کر رہے تھے۔ میں ہمت کر کے اٹھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میں بالکل زخمی نہ تھا۔ البتہ کچھ شیشوں کے ٹکڑے ضرور مجھے لگے تھے۔ میرے بے ہوش ہو جانے کی وجہ سے شاید وہ مجھے مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے۔''

''میں نے کھڑکی کے باہر دیکھا تو مسجد کی سیڑھیوں پر بھی کئی زخمی زخموں اور درد کی شدت کی وجہ سے کراہ رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ ان کی کس طرح مدد کروں۔ اسی لمحے ایک دہشت گرد بیرک سے فائرنگ کرتا ہوا مسجد کی سیڑھیوں کی

طرف آ نکلا۔ وہ زخمیوں کو مارنے آگے بڑھا۔ میں نے اُسے دیکھا تو میرے جسم میں سارا خون منجمد ہو گیا، اب مجھے اپنی موت یقینی نظر آنے لگی۔

''عین اسی لمحے میری آنکھوں نے یہ منظر دیکھا کہ سامنے سے ایک فوجی گاڑی آ کر رکی۔ اس میں سے ایک خوبصورت جوان بجلی کی سی تیزی سے نیچے کودا اور دہشت گرد کی جانب دوڑا۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ آدمی نہیں شیر ہے جو اپنے شکار کی طرف بھاگ رہا ہے۔ وہ انتہائی غضب ناک نظر آ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنے شکار کو کچا ہی چبا جائے گا۔ اس نے دہشت گرد کو للکارا: ''بزدل! میری طرف آ!''

اس کی للکار سے دہشت گرد گھبرا گیا تو فوجی نوجوان نے فائر کر دیا۔ گولیاں لگیں تو دہشت گرد اوندھے منہ زمین پر گر گیا۔ فوجی جوان بھاگ کر اس کے پاس پہنچا تاکہ یقین کر لے کہ وہ جہنم رسید ہو چکا یا نہیں۔ فوجی جوان بالکل تنہا تھا اور اس حقیقی میدان جنگ میں کسی فلم کا ہیرو نظر آ رہا تھا۔ اسی اثنا میں بیرک کے اندر سے اس پر فائرنگ ہونے لگی۔ وہ ایک ستون کی اوٹ سے جوابی فائرنگ کرنے لگا۔

''اس کی جانب گولیوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی لیکن وہ نہایت اطمینان اور سکون کے ساتھ جوابی فائرنگ کر رہا تھا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ ایک دہشت گرد بیرک سے نکلا۔ وہ ایک ستون کی آڑ لینا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے ہی ہمارے ہیرو نے اسے جہنم واصل کر دیا۔ اب وہاں فائرنگ رک گئی۔ میں نے بغور دیکھا تو وہ پاک فوج کا کپتان تھا۔ میں اس کا نام نہیں پڑھ سکا مگر اس کی جواں مردی اور شجاعت کی داد دیے بنا رہ نہ سکا۔ اسی وقت کپتان صاحب نے اپنے جوانوں کو حکم دیا'' زخمیوں کو یہاں سے نکال کر اسپتال یا کسی اور محفوظ جگہ پر فوری طور پر پہنچا دیا جائے۔''

مسجد کی بالائی منزل پر کئی ائیرمین پناہ لیے ہوئے تھے۔ انھیں نیچے آنے کا حکم دیا گیا۔ جب بہت سے ائیرمین نیچے آ گئے تو انھیں باحفاظت وہاں سے نکال کر کسی محفوظ مقام کی طرف روانہ کر دیا۔ اچانک ملحقہ بیرکوں سے فائرنگ شروع ہو گئی تو وہ اس جانب دھاڑتا ہوا اچلا گیا: ''ان جہنمیوں کو ان کے ٹھکانے پر پہنچا دو، کسی کو چھوڑنا نہیں۔ . . یہ اپنا اصل مقام بھول گئے ہیں، انھیں جہنم کے دروازے تک چھوڑنا۔''

''ہم سب حیران تھے کہ ایک ہی شیر نے لڑائی کا پانسا پلٹ دیا۔ ہمیں پھر اسپتال منتقل کر دیا گیا۔ اس واقعے کے دو تین گھنٹے بعد ٹیلی ویژن پر میں نے دیکھا کہ اسی خوبصورت کڑیل جوان، کپتان اسفند یار بخاری کی شہادت کی خبر چل رہی تھی۔

اس آپریشن کی کامیاب تکمیل پر اللہ تعالیٰ نے فوری طور پر اسے شہادت کے عظیم منصب کا انعام بخشا تھا۔ میری آنکھیں چھلک پڑیں کہ پاک فوج کا ایک نہایت بہادر اور قابل افسر اس دنیا کو اپنے وطن کی خاطر چھوڑ گیا۔ ایسے افسر تو اس وطن کا اثاثہ ہیں۔ میں جب تک زندہ رہوں گا قوم کے اس عظیم سپوت کی داستان شجاعت میرے دل میں زندہ رہے گی۔ خدائے بزرگ و برتر اس کے درجات بلند کرے، آمین۔ واقعی ''شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔''

شہید بڈھ بیر، شہید ناموس وطن، شہید قوم، کیپٹن اسفند یار بخاری کی شہادت نے پوری دنیا کو پیغام دیا کہ پاک فوج بے باک فوج ہے اور دنیا کے بہترین جاں باز اور جاں نثار اس فوج میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے افسر، سپاہیوں کے عقب میں پناہ گزین نہیں ہوتے بلکہ انھیں اپنے منصب قیادت کا پورا احساس رہتا ہے۔ وہ اپنے سپاہیوں کے لیے ڈھال بن کر پوری دنیا کے لیے مثال بن جاتے ہیں۔ شہید نہ خود کبھی مرتا ہے نہ اپنی قوم کو مرنے دیتا ہے۔ ◆◆◆

اپنا ریموٹ اپنے پاس!

امجد محمود چشتی

موجودہ دور میں مسائل ٹلنے والے ہرگز نہیں، ہمیں ہی ٹھنڈے دماغ سے مثبت ردعمل دکھانا ہوگا

زندگی میں ہر وقت، ہر جگہ، ہر قسم کے افراد اور حالات سے واسطہ پڑتا ہے۔ گھر، دفتر، بازار، اجتماعات اور سفر میں ایسے لمحات آتے ہیں کہ ہم آپے سے باہر ہو جائیں۔ پبلک مقامات اور ٹرانسپورٹ میں حد سے زیادہ بھیڑ، شور اور سگریٹ کا دھواں بے حال کرتا ہے۔ دفتر میں چھٹی چاہیے مگر نہیں ملتی، کام یا ڈیوٹی پر جاتے گاڑی خراب ہو جاتی ہے۔ بازار میں دکانداروں اور راہ گیروں سے منہ ماری بھی ہو سکتی ہے۔ کچھ لوگ ذاتیات پر بات کر کے تنگ کرتے ہیں تو کچھ کو بلاوجہ ہر بری صورت حال کا ذمہ دار ٹھہرا دیا جاتا ہے۔

گویا مسائل ٹلنے والے ہرگز نہیں، ہمیں ہی ٹھنڈے دماغ سے مثبت ردعمل دکھانا ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ مسئلہ دراصل ہوتا نہیں ہے، آپ کا رویہ اُسے مسئلہ ضرور بنا دیتا ہے۔

اگر ہم کسی کے غلط رویے کا جواب ناروا رویے سے ہی دیں تو ظاہر ہوا کہ ہم بھی اس شخص کی نقل کر کے اپنا ذاتی تشخص کھو رہے ہیں۔ اگر آپ لوگوں سے تنگ ہیں تو دو ہی حل ہیں: لوگوں کو سمجھا لیں یا اپنے آپ کو! کون سا فیصلہ کرنا آسان ہے یہ آپ خود طے کر لیجیے۔ اچھا ہو کہ جب کوئی ہم سے الجھے تو یہ جملہ یاد رکھیں کہ اپنی آواز بلند نہ کریں بلکہ اپنے دلائل قوی بنائیے۔ کیونکہ دنیا میں دس فیصد مسائل اختلاف رائے کے باعث ہوتے ہیں جبکہ باقی نوے فیصد مسائل کا مؤجب فوری ردعمل، جذباتی اور ہیجانی رویے ہیں۔

اپنے وجود کو قابو میں رکھنے والا ہی اصل ماسٹر ہے اور جو غصے میں کنٹرول کھو کر اپنا ہی خون جلائے اور کڑھتا رہے، حقیقت میں وہ شکار ہے۔ فریب ہی سہی، خوش رہنے کی کوشش کی جائے۔ اگر زمین پہ کانٹے ہیں تو کوسنے کے بجائے جوتے پہن لیں۔ اپنے مزاج کو قابو رکھنے سے ہماری اپنی ذات، خاندان، ملازمت اور معاشرتی تعلقات سب ٹھیک چل سکتے ہیں۔

جو معاملات ہمارے دائرہ اختیار میں نہیں، ان کے بارے میں زیادہ سوچ بچار اور فکر مندی بھی بے سود ہے۔ بُرے لوگوں کے خراب رویے کو تین طرح سے لیا جاتا ہے۔ جن لوگوں سے ہم ڈرتے ہیں وہاں سب کچھ جذب کر لیتے ہیں، ڈر نہ ہو تو یعنی اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے ہیں مگر جہاں پیار ہو تو بدلنے کی کوشش کرتے ہیں یعنی ناخوشگوار کو خوشگوار میں بدلتے ہیں۔ جیسے بچہ روئے تو ماں روتی نہیں بلکہ پیار کرتی ہے۔

کام اپنے آپ کو بدلنے سے سنورتے ہیں۔ یاد رہے کہ بار جھک کر پہنے جاتے ہیں اور یہیں سے ہی محبت، امن اور ہمدردی جیسے ارفع جذبوں کا آغاز ہوتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ عظیم لوگ مثبت طرزِ عمل اور رواداری کے باعث ہی عظیم ٹھہرے۔ آئیں ہم بھی طے کریں کہ اپنے من کا ریموٹ ہم خود چلائیں گے اور اسے دوسروں کے ہاتھ نہیں لگنے دیں گے۔

اگر ہمارا ریموٹ دوسروں کے ہاتھ میں ہے تو وہ جب چاہیں ہمیں غصہ دلائیں، چڑائیں یا تنگ کریں گے۔ اس دور میں یہ مشکل ضرور ہے مگر ناممکن ہرگز نہیں کہ اپنا ریموٹ اپنے پاس ہی رکھا جائے۔ ♦♦♦

لیو ٹالسٹائی / عروج فاطمہ

لبِ گور

مستقبل سنوارنے کا حسین سپنا دیکھنے والے ایک آدرشی کی غم ناک کہانی

پوہم ایک کسان تھا۔ وہ اپنی معاشی بدحالی سے اکثر پریشان رہتا۔ اس کے پاس تھوڑی سی زمین تھی جس پر کھیتی باڑی کر کے وہ اپنی زندگی گزار رہا تھا۔ اپنی زندگی خوشحال بنانے اور بچوں کے بہتر مستقبل کی خاطر وہ دو مرتبہ پہلے بھی اپنی رہائش تبدیل کر چکا تھا۔ اب زمین کا وہ حصہ جس کا وہ مالک تھا چھوٹے سے رقبے پر محیط تھا۔ اس پر اُگنے والی فصل بیچ کر وہ اتنی رقم ضرور کما لیتا کہ اہلِ خانہ سمیت پُرسکون زندگی گزار سکے۔

پوہم اپنی زمین اور کمائی سے مطمئن نہ تھا۔ وہ اکثر کسانوں کو حسرت سے دیکھتا جن کے پاس زیادہ زمین تھی۔ کاش اس کے پاس بڑے رقبے پر پھیلی زمین ہوتی جس پر وہ کپاس کی بڑی فصل لگا سکتا۔ وہ اکثر اسی فکر میں رہتا۔ وہ دن رات محنت کرتا، لیکن زندگی کے جو خواب اس نے دیکھے تھے، وہ پورے ہوتے نظر نہ آتے۔

ایک دفعہ پوہم کو کچھ کسانوں سے پتا چلا کہ باشکرز قبیلے کے لوگ جو وسیع و عریض رقبے پر پھیلی زمینیں رکھتے ہیں، اپنی زمین سستے داموں فروخت کر رہے ہیں۔ پوہم نے سوچا، کیوں نہ وہ بھی اپنی قسمت آزمائے۔ شاید وہ کسی بڑی زمین کا مالک بن سکے۔ اس نے اپنی چھوٹی سی زمین ایک کسان کو سستے داموں فروخت کر دی اور حاصل کردہ رقم لیے نکل کھڑا ہوا۔ دو ہفتے سفر کے بعد پوہم قبیلے میں جا پہنچا۔ قبیلے کا سردار

دیکھنے میں لمبا چوڑا اور سخت گیر شخص معلوم ہوتا تھا۔ سردار نے حیرت انگیز طور پر کہا کہ ایک ہزار روپے میں جس طرح کی زمین تمہیں چاہیے، وہ مل جائے گی۔ غریب کسان کے پاس ایک ہزار روپے ہی تھے۔ اس نے فوراً پوچھا، ”ایک ہزار روپے میں کتنے گز زمین ملے گی؟“

سردار نے کہا، ”زمین کے رقبے کا فیصلہ تمہاری اپنی مرضی سے ہوگا۔ تم جتنی بڑی زمین چاہو، لے سکتے ہو۔“ یہ سن کر کسان حیران رہ گیا۔ زمین حاصل کرنے کا جو طریقہ کار اسے بتایا گیا وہ اسے بہت آسان اور سادہ لگا۔ طے یہ پایا کہ وہ اتنے ہی ایکڑ کا مالک بن سکتا ہے جتنے پر وہ ایک دن میں اپنے پیروں پر چکر لگا کر واپس آسکے۔

یہ دوڑ طلوع آفتاب سے شروع ہوگی اور غروب آفتاب سے پہلے اسے واپس اسی جگہ پہنچنا ہوگا جہاں سے شروع ہوئی تھی۔ دوڑتے ہوئے اسے کچھ فاصلوں پر چھوٹا سا گڑھا کھودنا ہوگا۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ اس زمین پر دوڑ چکا تا کہ زمین کو ناپنے میں آسانی ہو۔ جتنا وسیع اس کی دوڑ کا دائرہ ہوتا اتنی ہی زمین اس کے نام کر دی جاتی۔

”لیکن“... سردار نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا، ”یہ یاد رکھنا کہ تمہیں سورج غروب ہونے سے پہلے وہیں واپس پہنچنا ہوگا جہاں سے دوڑ شروع ہوئی تھی۔ دیر ہونے پر تمہارے پیسے اور زمین ضبط کر لی جائے گی۔“

پوہم نے یہ سن کر جلدی سے سر ہلا دیا کیونکہ وہ تو ہر طرح سے دوڑ پر آمادہ تھا۔

دوسرے دن پوہم طلوع آفتاب سے کچھ دیر پہلے دوڑ شروع کرنے منتخب جگہ پر پہنچ گیا۔ باشکرز قبیلے کے لوگ بہت بڑی تعداد میں اپنے سردار کے ساتھ اس جگہ موجود تھے۔ پوہم نے کمر کے گرد بندھی بیلٹ میں ایک بڑی سی پانی کی بوتل اور ہاتھ میں کدال لے رکھا تھا۔ سارے مجمع نے بہت ہی والہانہ انداز میں نعرے لگا کر اسے رخصت کیا۔

پوہم پورے جوش و خروش سے دوڑ پر روانہ ہوا۔ وہ اپنے آپ کو بہت تر و تازہ محسوس کر رہا تھا کیونکہ بھرپور نیند لے کر آیا تھا۔ مزید برآں صبح سویرے دوڑنا اسے بہت فرحت بخش محسوس ہوا۔ اسی لیے دوڑتے ہوئے اسے تھکن محسوس نہ ہوئی اور تیزی کے ساتھ گڑھے کھودتے وہ تین میل تک دوڑ گیا۔ سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ دھوپ کی تپش پوہم کو اپنی پیٹھ پر محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اب پسینے میں شرابور تھا۔ وہ اپنے اندازے سے ہر میل پر اپنے نقش پا کی تصویر، چھوٹا سا گڑھا کھود دیتا۔ دوڑتے ہوئے اس کا دل اطمینان اور خوشی سے بھر رہا تھا۔

وہ خواب جو اس نے اپنی زندگی اور مستقبل بہتر بنانے کے لیے دیکھے تھے، سب سچ ہوتے نظر آنے لگے۔ پیروں کے نیچے زیر ہوتی زمین اس کے تابع ہو رہی تھی۔ زمین کی یہ تسخیر اس کے لیے نہایت توانائی بخش تجربہ تھا۔ جہاں وہ زمین میں گڑھا کھودنے رکتا وہیں بوتل سے پانی نکال کر پی لیتا۔ یوں تازہ دم ہو کر پھر دوڑنے لگتا۔ ڈھلتے سورج کے ساتھ وہ اب کافی حد تک تھک چکا تھا۔

اس نے سورج کو غور سے دیکھا کہ جان سکے، کتنی دیر باقی ہے؟ اور فیصلہ کیا کہ اب اسے پلٹ جانا چاہیے، کیونکہ وہ زمین کا بڑا حصہ سر کر چکا تھا۔ اب شرط کے مطابق اُسے اپنی زمین کا دائرہ مکمل کرنا تھا، لیکن سامنے اسے میٹھے پانی کا چشمہ نظر آیا۔ اس نے سوچا کہ اگر یہ چشمہ بھی زمین میں شامل ہو جائے تو اس کی فصل سونا اگلے گی۔ یہ سوچ کر اس نے واپسی کا ارادہ ترک کیا اور آگے دوڑ گیا۔ یوں وہ چشمہ بھی زمین میں شامل کر لیا۔

چشمے کے آگے کی زمین بڑی زرخیز تھی۔ پوہم نے جب وہ جگہ دیکھی جو گیہوں اگانے کے لیے بہترین تھی تو اس سے نہ رکا گیا اور وہ مزید دوڑتا گیا۔ آخر کار اس زمین کو بھی دوڑ کر سر کر لیا۔ اب سورج ڈھل کر کافی نیچے آچکا تھا۔ سامنے کا نظارہ دھندلا ہوتا جا رہا تھا۔ پوہم نے واپسی کی دوڑ لگا دی۔ اس کی سانس بار بار اکھڑ جاتی۔ وہ کچھ لمحے رک کر لمبی سانس لیتا، اپنی ہمت یکجا کرتا اور پھر دوڑنے لگتا۔

دوڑتے ہوئے اس نے بڑا فاصلہ طے کر ہی لیا۔ اب اسے پہاڑی پر کھڑے باشکرز قبیلے کے لوگ دھندلے سائے کی مانند نظر آرہے تھے۔ وہ اس کی واپسی کے منتظر تھے مگر پوہم کے لیے قدم آگے بڑھانا مشکل سے مشکل تر ہو رہا تھا۔ اس کا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ بہتے پسینے کی وجہ سے اسے سامنے دیکھنے میں شدید دقت کا سامنا تھا۔ سورج کی روشنی نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اندھیرا تیزی سے پھیل رہا تھا پھر بھی اس کے قدم نہ رکے۔ وہ اپنی پوری قوت جمع کر کے تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا مگر ڈوبتا سورج اس سے کہیں تیزی سے دوڑتا اپنے پیچھے اندھیروں کے بادل گہرے کرتا آرہا تھا۔ پوہم کو اب باشکرز قبیلے کے لوگوں کے نعروں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ چلا چلا کر اس کا حوصلہ بلند کر رہے تھے۔ مگر افسوس پوہم میں اب چلنے کی سکت بھی نہ رہی اور وہ گر پڑا۔

آخر کار اس نے پھر اپنی ہمت جمع کی اور اپنے بازوؤں اور گھٹنوں کے بل بڑھنا شروع کیا۔ وہ کسی طرح بھی یہ زمین اور اپنی زندگی بھر کی کمائی گنوانا نہیں چاہتا تھا مگر وہ کچھ ہی دور رینگ سکا۔ اس کا سر زمین سے جا لگا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

اس نے اپنی طاقت، ہمت اور وقت کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ مایوسی کے اندھیروں میں لپٹے پوہم کو باشکرز قبیلے کے لوگوں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ وہ نعرے لگا کر اسے اٹھنے کو کہہ رہے تھے۔ سورج تو غروب ہو چکا، یہ لوگ مجھے اب کیوں آوازیں دے رہے ہیں؟ پوہم نے لمحہ بھر کو سوچا اور فوراً ہی اسے خیال آیا کہ وہ لوگ تو پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہیں جہاں سے ڈوبتے سورج کا نظارہ ممکن ہوگا۔ یعنی ابھی کچھ لمحے باقی تھے۔ پوہم کے لیے یہ لمحات بہت قیمتی تھے۔

اس کی زندگی بھر کی کمائی اور وسیع و عریض زمین اب کچھ ہی فاصلے پر منتظر تھی۔ اس نے جسم کے اندر بچی کھچی طاقت کو یکجا کیا اور دوڑ لگا دی۔ آخر کار خطِ سرحد پار کر وہ سر کے بل سجدے کی صورت میں گر گیا۔ سردار نے، جو اُس کا خیر مقدم کرنے قریب ہی کھڑا تھا، چیخ کر پوہم کو ساری زمین جیتنے کی نوید سنائی۔ وہ پوہم کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ واقعی یہ شخص مضبوط جسم و جان اور ارادے کا مالک ثابت ہوا تھا۔ اس نے ایک بڑے رقبے کی زمین جیت لی تھی۔ باشکرز قبیلے کے لوگ بھی اچھل اچھل کر نعرے لگانے لگے۔ وہ پوہم کو اتنی بڑی زمین جیتنے پر مبارک باد دے رہے تھے۔

پوہم کے اندر اب اُٹھنے کی سکت نہ تھی۔ وہ سر کے بل جوں کا توں پڑا تھا۔ آخر کار اُسے سیدھا کیا گیا اور پانی پلانے کی کوشش کی گئی۔ یہ کیا... پانی پینا تو دور کی بات پوہم کے جسم نے ہلکی سی جنبش بھی نہ کی۔ فوراً اس کے دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کی گئی، مگر وہاں بھی کوئی حرکت نہ تھی۔ یوں اس کی موت کی تصدیق ہو گئی۔ باشکرز قبیلے کے وہ لوگ جو مبارکباد کے نعرے بلند کر رہے تھے، اب صدائے افسوس بلند کرنے لگے:

”ہائے بیچارا، اتنی بڑی زمین جیت کر بھی کچھ حاصل نہ کر پایا۔“

سردار نے اس کی قبر کھودنے کا حکم دیا۔ ایک آدمی نے اسی کدال سے اس کی قبر کھود ڈالی جس سے پوہم اپنی زمین کے نشان کھودتا رہا تھا۔ آخر کار پوہم کو لحد میں اُتار دیا گیا، جو اس کے سر سے پیر تک صرف دو گز زمین پر محیط تھی۔ شاید اُسے اتنی ہی زمین کی ضرورت تھی۔ ◆◆◆

گُڈ مارننگ، شیک ہینڈ اور تھینک یو

سیما صدیقی

ہماری ماڈرن ماؤں کے انداز تعلیم کا پوسٹ مارٹم

ادھورا علم خطرناک ہوتا ہے۔ آج کل کی ماؤں نے کہیں سے سُن لیا کہ بچوں کو روکنا ٹوکنا نہیں چاہیے، کیونکہ اس سے ان کی نشوونما متاثر اور اعتماد مجروح ہوتا ہے۔ بس جناب ماؤں نے فوراً طے کرلیا کہ خواہ کچھ ہو جائے، وہ بارہ سال کی عمر تک بچے کو کچھ نہیں کہیں گی، کیونکہ جہاں انھوں نے بچے کو ڈانٹا وہیں ان کی نشوونما رُک گئی۔

پہلے زمانے میں لوگ بچوں کی خوب گوشمالی کیا کرتے تھے۔ معلوم نہیں وہ کیسے بڑھتے اور پھلتے پھولتے رہے؟ اور حیرت کی بات یہ کہ آج کے جدید تربیت یافتہ بچوں سے بہتر ہی ہیں۔ ایک اور تحقیق جس میں کہا گیا ہے کہ بچے کی شخصیت ابتدائی پانچ سال میں بنتی یا بگڑتی ہے، غالباً کسی ماں کی نگاہ سے نہیں گزری۔

بچے کو نہ ٹوکنے سے مراد یہ ہے کہ اگر وہ کوئی کام اپنی محدود استعداد کے مطابق کر رہا ہے تو اسے درمیان میں نہ ٹوکا جائے۔ مثلاً اگر کوئی نوعمر بچہ پانی لا رہا ہے تو ماں کہے کہ ”ارے ارے!! دیکھو بیٹا گلاس کتنا بھر لیا ہے... پانی چھلک رہا ہے... دیکھو گر نہ جائے... دیکھو سنبھل کر... لاؤ مجھے دے دو... تم نہیں لے جاسکتے۔“

اس قسم کی روک ٹوک سے واقعی بچے میں اعتماد بحال نہیں رہتا اور وہ ہمیشہ ہر کام میں ماں کی اعانت کا محتاج رہتا ہے۔ ماہرین نے اسی نوع کی روک ٹوک سے منع کیا ہے مگر ماؤں کو نجانے کیوں یہ غلط فہمی ہوگئی کہ ماہرین نفسیات نے بچوں کی غلطیوں اور بدتمیزیوں پر بھی روکنے ٹوکنے سے منع کر دیا۔ حالانکہ اگر بچہ کسی کا گلا دبا رہا ہے یا کسی کے گھر تباہی کا ہرکارہ بن کر لوٹ مار مچاتا ہے تو بچے کو دو تھپڑ رسید کرنے پر دنیا کے کسی ماہر نفسیات کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

آج کل ماؤں کو بچوں کی نشوونما کی سخت فکر ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بچوں کی نشوونما اس قدر ہو جاتی ہے کہ کچھ ہی دنوں میں ماں باپ پر چڑھ دوڑتے ہیں۔

ایک ماں کا کہنا تھا کہ میں نے بچوں کی تربیت سے متعلق ایک خصوصی کورس کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بچے کو ابتدائی پانچ سال کی عمر تک مارنا نہیں چاہیے۔ (پانچ سال بعد بھی نہ ماریے، کیونکہ پھر کوئی فائدہ نہیں۔ ساری عادتیں اب پختہ ہو چکی ہیں) لہٰذا فی الحال میں اپنے بچوں کو کچھ نہیں کہہ سکتی۔

پانچ سال بعد جب ہماری ملاقات ہوئی تو اشتیاق سے پوچھا، ”ہاں بھئی! اب تو آپ نے بچوں کو مارنا شروع کر دیا ہوگا۔“

وہ جھینپ کر بولیں، ارے کہاں! پانچ سال کی چھوٹ سے بچوں میں اتنا اعتماد پیدا ہوگیا کہ اب اپنے ابا کو مارنے

تے ہیں۔ وہ بے چارے چھپتے پھرتے ہیں۔“

ہم نے دیکھا کہ واقعی پانچ سال میں ان کے بچے جن کے بچے بن چکے تھے۔ ایسے ہی ایک باپ کو ہم نے سڑک پر دیکھا، ایک پیارے سے بچے کو ٹہلا رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد ہم نے محسوس کیا کہ باپ بچے کو نہیں... بچہ باپ کو ٹہلا رہا ہے۔ کبھی کھینچ کر کسی دُکان پر تو کبھی کسی دُکان پر اور والد صاحب بادل نخواستہ بچے کے ساتھ ساتھ گھسٹ رہے تھے۔

اسکول کے انتخاب کے سلسلے میں بھی ایک دوڑ لگی ہوئی ہے۔ یہ بھی اسٹیٹس سمبل بن گیا ہے۔ اگر فلاں کے بچے فلاں اسکول میں پڑھتے ہیں تو میرا بچہ بھی وہیں پڑھے گا۔ (خواہ وہ نکما فیل ہی ہوتا رہے) بقول بانو قدسیہ ”آج کل مائیں فیصلہ کرتی ہیں کہ سرکس کے یہ جوکر کس اسکول میں تربیت پائیں گے۔“

ماؤں کا یہ اصرار ہے کہ اگر پڑوس کا بچہ گرمیوں کی چھٹیوں میں ”سمر کیمپ“ جائے گا تو میرا بچہ بھی جائے گا۔ نند یا دیورانی کا بچہ جم خانہ یا کراٹے کلب کا ممبر ہے تو میرا بچہ بھی اس کا ممبر بنے گا۔ گویا تعلیم، صحت اور تربیت کی تمام تر ذمے داری معاوضہ لینے والے کاروباری اداروں کے سر ڈال دی جاتی ہے۔ ماں کے پاس صرف ایک ہی کام رہ جاتا ہے کہ وہ جہاں تک ہو سکے، اپنے بچوں پر فخر کرتی رہے۔

چاہے بچہ بڑوں کو منہ چڑائے، گالیاں دے، تھوکے یا گھونسے مارے، ماں ایسی ہر حرکت کو بچے کی ادا سمجھ کر مُسکرا دیتی ہے۔ خوش ہوتی ہے کہ بچہ اتنے سارے لوگوں میں اعتماد سے ”گفتگو“ کر رہا ہے۔ ایک صاحبہ محفل میں وارد ہو کر بڑے ناز سے بچے سے مخاطب ہوئیں:

”نائل بیٹا! آنٹی کو سلام کیجیے... شاباش گڈ بوائے!“

”گڈ بوائے“ انتہائی بدتمیزی سے بولا۔ ”یہاں اتنی ساری ڈراؤنی چڑیلیں بیٹھی ہیں، ان میں سے کس کو سلام کروں؟“

پوری محفل پہ سناٹا چھا گیا۔ آنٹیوں کے چہروں پہ ناگواری و غصے کے آثار دیکھتے ہوئے ماں سٹپٹا کر بولی، ”ارے جانو! یہ آپ کیا ”بیڈ لینگویج“ استعمال کر رہے ہیں...!“ پھر حاضرین سے مخاطب ہو کر بولی ”دراصل ان کے اسکول میں کچھ بچے بیڈ لینگویج یوز کرتے ہیں۔ پرنسپل نے کہا ہے کہ ہم نے انھیں واچ کرلیا ہے۔“

”کیا...!!“ حاضرین میں سے ایک خاتون بوکھلا اٹھیں ”کیا انھوں نے نائل کو پکڑ لیا؟“

ماں منہ بسور کر بولیں ”جی نہیں! انھوں نے ان بچوں کو پکڑ لیا جو نائل کو خراب کر رہے تھے۔“

مسئلہ یہ ہے کہ آج ہر ماں کو یہ وہم ہے کہ دوسرے بچے ان کے بچے کو خراب کر رہے ہیں۔ حالانکہ بچوں کو بدتمیز بنانے کے لیے ان کی ماں ہی کافی ہے۔

ایک صاحبہ اپنے بچے کے ساتھ ہمارے گھر آئیں۔ بچے نے صحن سے ماں کو آواز دی، ”ممی! دیکھیں... کبوتر بیٹھا ہے!“

ماں نے ایک چیخ ماری اور بچے کو تنبیہہ کرتے ہوئے بولیں ”کبوتر نہیں بیٹا پیجن (Pigeon)... پیجن ہے یہ!!“

ایسا محسوس ہوا گویا کبوتر کو کبوتر کہہ دینے سے نہ صرف بیچارے جانور بلکہ ماں کے دل کو بھی ٹھیس پہنچی ہے۔ یہ بات تو بچے اسکول میں سیکھ ہی لیتے ہیں کہ پرندوں کے انگریزی نام کیا ہیں۔ ماں نہ بھی سکھائے تو کوئی بات نہیں۔

ماں کی گود بچے کا پہلا مدرسہ ہے، مگر مسئلہ یہ ہے کہ آج کل ماؤں کی اکثریت تہذیب محض اسی کو سمجھتی ہے کہ بچہ مہمانوں سے ”شیک ہینڈ“ کرے، ”گڈ مارننگ“ کہے یا ”سوری“ اور ”تھینک یو“ کا پہاڑا پڑھتا رہے... بچے کے اندر شرم ساری یا شکر گزاری کے حقیقی احساسات پیدا کرنے کے بجائے انھیں رٹو طوطا بنا دیا جاتا ہے۔ بچہ سوری یا تھینک یو اس طرح کہتا ہے گویا لٹھ مار رہا ہو۔ مہمانوں کی آمد پر ماں کی توجہ مہمان کے بجائے اپنے بچے پر مرکوز رہتی ہے۔ ایسا لگتا ہے گویا والدین پہلی بار اپنے بچے سے ملے ہوں۔

”ارے...!! انکل سے شیک ہینڈ نہیں کیا!“ بچہ شیک

ہینڈ کرلے تو ماں کو قرار آجاتا ہے۔ اس کے بعد بے شک بچہ مہمان کو تنگ کرتا رہے۔ اگر بچہ طالب علم بھی ہے تو ماں مستقل فرمائشی پروگرام جاری رکھتی ہے:

"بیٹا انکل کو گنتی سناؤ!"

اگر بچے کو ہزار تک گنتی یاد ہو تو مہمان بے چارے کی شامت آجاتی ہے اور وہ نو دو گیارہ ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ آج کل والدین بچے کی ہر فرمائش پوری کرنے کے لیے سر کے بل تیار رہتے ہیں، جبکہ بچے کو "نا" سننے کی عادت ہونی چاہیے۔ اسے سمجھانا چاہیے کہ کچھ چیزیں ہم دے سکتے ہیں اور کچھ نہیں۔ زندگی میں بھی ہر ایک کو ہر نعمت میسر نہیں ہوتی تو پھر اس کے لیے بچے کو ذہنی طور پر تیار کیوں نہ کر دیا جائے؟

مگر یہاں تو یہ حال ہے کہ کیا صحیح ہے کیا غلط، کیا ضروری ہے اور کیا غیر ضروری! اس کا فیصلہ ماں باپ نہیں... بچے کرتے ہیں۔ پہلے والدین بچے کو انگلی پکڑ کر چلنا سکھاتے تھے۔ آج کل بچے والدین کو انگلیوں پر نچاتے ہیں۔ مائیں بچوں کے تھرماس میں کولڈ ڈرنک جیسی مضر صحت شے بھر کر دیتی اور کہتی ہیں "ہمارا بچہ تو بڑا نخرے والا ہے، پانی کی جگہ کولڈ ڈرنک پیتا ہے۔"

ننھے منے بچوں کی "ضد" کے آگے گھٹنے ٹیک کر انھیں مہنگے موبائل دلا دیے جاتے ہیں۔ والدین فخریہ کہتے ہیں کہ ہمارا بچہ تو ہم سے زیادہ "شارپ" ہے، ساری ونڈوز کھول لیتا ہے۔ انٹرنیٹ اور موبائل کے مضر اثرات کی وجہ سے اب مغربی دنیا میں بھی بچوں سے انھیں دور رکھنے کے قوانین پاس ہو رہے ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ مغربی تہذیب سے مرعوب ہو کر بچے کو انٹرنیٹ، جنک فوڈ اور کولڈ ڈرنکس کے استعمال سے روک نہیں پاتے کہ کہیں لوگ ہمیں دقیانوسی نہ سمجھیں۔

بچے کے پیٹ میں معمولی درد ہو یا چھینک آجائے تو مائیں فوراً چائلڈ اسپیشلسٹ کو دکھانے لے جاتی ہیں جو اینٹی بایوٹک دوائیں دے دے کر ان کا معدہ چوپٹ کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر بھی کیا کرے... جب تک وہ تین چار دوائیں نہ لکھے ماؤں کی تسکین نہیں ہوتی۔ ان دواؤں سے چھینکیں تو بند ہو جاتی ہیں مگر ان کے ضمنی اثرات (سائیڈ افیکٹس) سے نئی بیماریوں کا راستہ کھل جاتا ہے اور بیماریوں اور علاج کا یہ سلسلہ ماں کی تشویش کے ساتھ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ بڑوں کے سامنے چیونگم چبانا، سگریٹ پینا، ٹانگیں ہلانا، ان کی جانب بیٹھنا، بحث کرنا، قطع کلامی کرنا یا اونچی آواز سے بولنا سخت معیوب سمجھا جاتا تھا، مگر آج کل ایسا نہیں۔ بڑوں اور بچوں کے درمیان سارا ادب لحاظ ریت کی دیوار ثابت ہوتا ہے۔

آج کل والدین "جنریشن گیپ" ختم کرنے کا نعرہ لگاتے اور بچوں سے دوستانہ پالیسی اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے بچے انھیں نہایت بے تکلفی سے گالیاں دیتے ہیں۔ بچوں سے تعلقات میں "میانہ روی" ہی سب سے بہتر پالیسی ہے۔ جہاں نرمی سے کام چل سکتا ہو وہاں نرمی اور جہاں سختی کی ضرورت ہو وہاں سختی ضروری ہے۔ یہ کی ماڈرن مائیں جب کسی کے گھر بطور مہمان جاتی ہیں تو ان کے بچے تباہی کا ہرکارہ بن کر سارے گھر میں پھیل جاتے ہیں۔ ایسے میں مائیں اتنی بے تعلق ہوتی ہیں جیسے یہ کسی اور کے بچے ہوں اور ان کے ساتھ نہ آئے ہوں۔ میزبان کا بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ وہ دو ہاتھ لگا کر بچے کا دماغ درست کر دے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو بچے والدین کی مار نہیں سہتے انھیں زمانے کی مار کھانی پڑتی ہے۔ جنھیں والدین نہیں سکھاتے انھیں زمانہ سکھاتا ہے۔ بچے کی بدتہذیبی کوئی جانثار ماں یا رحم دل خالہ تو برداشت کر سکتی ہے مگر دوسرے نہیں۔ جب بچہ عملی زندگی میں قدم رکھتا ہے تو دوسروں کے رحم و کرم پہ ہوتا ہے۔ ماں کے بے جا لاڈ پیار نے اس کی شخصیت میں جو بگاڑ پیدا کر دیا ہوتا ہے، اس کے باعث بچے کو شدید دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ اس کی مدد کرنے، خامیوں پہ پردہ ڈالنے اور حمایت کرنے کے لیے ماں ہر وقت اور ہر جگہ ساتھ نہیں ہوتی۔ ◆◆◆

عورت کا گھر کون سا

ایک سے دوسرے گھر سفر در سفر رہنے والی اُداس لڑکی کی کہانی

رافعہ اعظم

عروسی لباس میں ملبوس سارہ شہزادی سے کم نہیں لگتی تھی۔ مگر ایک خوف اُسے اردگرد کے ہنگامے اور شور شرابے سے بے خبر رکھے ہوئے تھا۔ بیٹیاں باپ کے گھر سے رخصت ہونے پر افسردہ ہوتی ہیں مگر سارہ اسی کشمکش کا شکار تھی کہ باپ اُسے کیسے رخصت کرے گا؟ وجہ یہ کہ وہ باپ کی شفقت سے محروم تھی۔

سارہ کی پیدائش پر آصف علی ماتم زدہ بن گیا، کیونکہ وہ بیٹے کا خواہش مند تھا۔ تب سے اس نے سارہ کو ایک بار بھی جی بھر کر نہ دیکھا۔ سارہ تیسرے نمبر پر سب سے چھوٹی بہن تھی۔ اب شادی اس کی پسند سے ہو رہی تھی۔ صائم یونیورسٹی میں سارہ کا ہم جماعت تھا۔

جہیز تو دور باپ نے تنکا تک دینے سے انکار کر دیا مگر ماں نے تین، چار جوڑے بنا رکھے تھے جو اُسے مل گئے۔ سارہ کی بڑی خواہش تھی کہ ایک بار باپ اسے اپنے سینے سے لگا لے۔ اس کی نظریں باپ کو تلاش کر رہی تھیں۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی اس کی یہ خواہش حسرت بن کر دل میں ہی رہ گئی۔

جب وہ ہر سال کلاس میں اول پوزیشن لے کر آتی تب بھی یہی تمنا دل میں لیے باپ کے پاس جاتی کہ شاید وہ بھی اس کی خوشی میں شریک ہو جائے مگر تیسری بار بھی بیٹا نہ ہونے پر آصف علی کے دل میں سارہ کے لیے ایک باپ کی محبت دم توڑ چکی تھی۔

آج بھی وہ گم سم بیٹھی باپ کی راہ تک رہی تھی۔ بارات آ چکی تھی اور آدھے گھنٹے بعد سارہ کو رخصت ہو جانا تھا۔ رخصتی کے وقت سارہ نے باپ کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ آ گئی اور آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلک پڑے۔ باپ کے قریب آتے ہی سارہ باپ کے گلے لگ کر رونے لگی۔

"آج کے بعد تمہارا اس گھر سے کوئی تعلق نہیں۔ اب

وہ ہی تمہارا گھر ہے''۔

باپ کی تلخ باتیں سن کر سارہ ایک دم سے پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے سارے خواب آئینے کی طرح چکنا چور ہو گئے۔ وہ بوجھل قدم اُٹھاتی اپنے گھر سے رخصت ہوئی جو اب اس کے لیے اجنبی بن چکا تھا۔

☆☆

سارہ اپنے کمرے میں بیٹھی باپ کی تلخ باتیں یاد کر کے رو رہی تھی کہ اچانک صائم کمرے میں داخل ہوا۔ شوہر کو دیکھتے ہی سارہ نے اپنے آنسو پونچھے۔ وہ سارہ کے سارے حالات سے لاعلم تھا، کیونکہ سارہ ایک مضبوط لڑکی تھی اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی بھی اس پر ترس کھائے۔ صائم مسکرا کر سارہ کو دیکھ رہا تھا۔

''صائم! کیا آپ کو بھی بیٹا چاہیے؟'' نئی نویلی دلہن کی بات سن کر شوہر نے چونک کر اسے دیکھا ''بتائیں نا صائم؟''

''اولاد تو اللہ کی رحمت ہوتی ہے، چاہے بیٹا ہو یا بیٹی۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' صائم کی بات سن کر سارہ جیسے اپنے تمام غم بھول گئی اور اُسے دیکھ کر مسکرانے لگی۔

اگلی صبح دونوں میاں بیوی ہنستے مسکراتے ناشتے کی میز پر آئے۔

''بہو تمہارے گھر سے ابھی تک ناشتہ نہیں آیا۔'' آسیہ بیگم کی بات سنتے ہی سارہ کی مسکراہٹ حیرت میں بدل گئی۔

''اوہو امی! اب یہ کون سی نئی رسم ہے؟'' صائم نے پوچھا۔

''بیٹا! یہ تو برسوں سے چلتا آرہا ہے کہ بہو کا پہلا کھانا اس کے میکے سے آتا ہے۔'' بیٹے کی بات سن کر آسیہ جھٹ سے بولی۔

سارہ جانتی تھی کہ ناشتا لانا تو دور کی بات، ماں باپ نے اس بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا۔

''ہو سکتا ہے امی کہ سارہ کے گھر والوں کو اس رسم کا پتہ ہی نہ ہو؟''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ پتا نہ ہو۔ کیوں سارہ کیا تمہارے گھر والوں کو نہیں علم کہ بیٹی کا پہلا ناشتا میکے سے جاتا ہے؟''

''پتا نہیں آنٹی۔۔۔'' آسیہ بیگم کی بات سن کر سارہ صرف اتنا ہی کہہ سکی۔

''اچھا امی چھوڑیں، آپ ناشتا لگوائیں۔'' صائم نے کہا۔

''سنا تھا کہ بیٹیاں بوجھ ہوتی ہیں۔ تمہیں دیکھ کر آج یقین ہو گیا۔''

ساس کی بات سن کر سارہ کی آنکھوں میں پانی اتر آیا مگر وہ ضبط کر گئی۔ ناشتا کرنے کے بعد وہ برتن سمیٹ رہی تھی کہ اچانک پلیٹ ہاتھ سے گر کر چکنا چور ہو گئی۔

''بات سنو لڑکی۔ یہ سب چیزیں تم جہیز میں نہیں لائیں جو اس طرح توڑ رہی ہو۔ میں نے بڑی مشکل یہ چیزیں بنائی ہیں۔ تمہارے باپ نے تو تمہیں ایک تنکا بھی نہیں دیا، بس اپنے سر کا بوجھ ہمارے کندھوں پہ لادیا۔''

''امی یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔'' ماں کی تلخ باتیں سن کر صائم ایک دم سے بولا۔

''تم سمجھا دو اپنی بیوی کو یہاں بے پروائیاں نہیں چلیں گی۔ اس گھر میں میرے اصولوں کے مطابق رہنا ہوگا۔'' یہ کہہ کر آسیہ بیگم وہاں سے چلی گئی۔

''کوئی بات نہیں صائم۔ غلطی میری تھی، مجھے احتیاط کرنی چاہیے تھی۔'' شوہر کے کچھ بولنے سے پہلے ہی سارہ نے اپنی غلطی قبول کر لی۔

☆☆☆☆

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آسیہ بیگم کے لہجے کی تلخی میں بھی اضافہ ہو گیا۔

ایک دن وہ بیٹے سے کہنے لگیں:

''بیٹا اب میں چاہتی ہوں کہ تمہاری اولاد ہو جائے۔ اس گھر میں بچوں کی آوازیں گونجیں۔''

ماں کی بات سن کر صائم مسکرانے لگا۔

''کیا عورت کا کوئی گھر نہیں ہوتا؟ پہلے باپ اور شادی

کے بعد اسے ساس کے گھر رہنا پڑتا ہے؟ کھانا بناتے ہوئے سارہ یہی کچھ سوچ رہی تھی کہ اچانک گر پڑی۔ اس کی چیخ سن کر صائم دوڑ کر وہاں پہنچا اور بیوی کو سہارا دیا۔

☆☆

''مبارک ہو آپ باپ بننے والے ہیں۔'' ایک لیڈی ڈاکٹر نے سارہ کا معائنہ کرنے کے بعد صائم کو بتایا۔

آسیہ یہ خبر سن کر بہت خوش تھی۔ ''صائم، مجھے تو بیٹا چاہیے۔''

آسیہ بیگم کی بات سن کر سارہ نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

''اگر بیٹی ہو گئی تو۔۔۔؟''

''نہیں مجھے تو بیٹا ہی چاہیے۔'' صائم کی بات سن کر آسیہ بیگم نے گویا فیصلہ سنا دیا۔

''صائم! آپ نے تو کہا تھا کہ اولاد اللہ کی رحمت ہوتی ہے چاہے بیٹا ہو یا بیٹی۔'' ساس رخصت ہوئی، تو سارہ نے شوہر سے کہا۔

''ہاں کہا تو تھا مگر سچ پوچھو تو مجھے خود بیٹے بہت پسند ہیں۔''

شوہر کی بات سن کر سارہ نے حیرت سے صائم کی طرف دیکھا۔ وہ دکھی دل سے سوچنے لگی، اگر بیٹی ہو گئی تو کیا اس کے ساتھ بھی وہ ہی سب کچھ ہوگا جو میرے ساتھ ہوا؟ کیا وہ بھی باپ کی شفقت سے محروم رہے گی؟

اسی غم کو سارہ نے دل سے لگا لیا کہ اگر بیٹی ہوئی تو کیا وہ بھی صائم کی محبت نہیں پا سکے گی؟ اب وہ ایک اور سارہ کو جنم نہیں دینا چاہتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا وہی سب کچھ اس کی اولاد کے ساتھ بھی ہو۔ اس غم نے سارہ کو مزید کمزور کر دیا۔

ایک دن باورچی خانے میں کام کرتے کرتے سارہ کی طبیعت خراب ہوئی تو اُسے اسپتال لے جایا گیا۔ اسپتال میں صائم اور آسیہ بیگم سارہ اور بچے کی صحت یابی کی دعائیں کر رہے تھے۔ ''مریضہ کو خون کی ضرورت ہے۔'' ایک نرس نے آکر بتایا۔

سارہ کے خون کا گروپ او نیگیٹو تھا۔ نرس کی بات سنتے ہی صائم خون کا بندوبست کرنے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد نرس ایک بچہ گود میں اٹھا کر باہر آئی اور بولی ''مبارک ہو، بیٹا ہوا ہے۔''

آسیہ بیگم نے خوشی سے لڑکے کو گود میں اُٹھا لیا۔ اسی وقت ڈاکٹر نے بتایا ''ماں کی جان کو خطرہ ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے خون کا بندوبست کریں۔''

سارہ کی حالت خراب تھی مگر اس کا دماغ کام کر رہا تھا۔ ایک بار وہ اپنے باپ سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اُسے کس قصور کی بنا پر پدرانہ محبت و شفقت سے محروم رکھا گیا۔

''سارہ''۔۔۔ اچانک اسے وہ آواز سنائی دی جسے سننے کے لیے وہ بچپن سے تڑپ رہی تھی۔ ''آنکھیں کھولو بیٹا۔ میں ہوں تمہارا بدنصیب باپ۔ مجھ سے بات کرو۔۔۔''

وہ بات کرنا چاہتی تھی مگر بے بس تھی۔ سارہ نے ہمت کر کے تھوڑی سی آنکھیں کھولیں تو سامنے باپ کو کھڑا دیکھ کر ہولے سے مسکرائی۔ آصف علی کی آنکھیں شرمندگی سے نم تھیں۔ سارہ کی آنکھیں زیادہ دیر کھلی نہ رہ سکیں۔ آج وہ بہت خوش تھی۔ وہ ہمیشہ کے لیے پُرسکون نیند سونا چاہتی تھی۔ اس کے چہرے پر فخر تھا اور اطمینان کہ باپ کو اپنی زیادتی کا احساس ہو گیا تھا۔

''آنکھیں کھولو سارہ۔۔۔ اپنے بیٹے کو تو دیکھو۔۔۔''

صائم نے روتے ہوئے کہا مگر سارہ بہت دور جا چکی تھی۔ ان سب رشتوں سے دور ایک نئی دنیا میں!

''جہنمی عورت'' ایک ایسی عورت کی کہانی جو آپ کی آنکھوں کے گوشے نم کر دے گی۔ صفحہ نمبر ۲۲۹ پر

جستجو کھوئے ہوؤں کی!

بشریٰ شیریں / روبینہ کوکب

نامور شعرا کی دل افروز غزلوں کا جامع انتخاب

احمد مشتاق

مل ہی جائے گا کبھی دل کو یقیں رہتا ہے
وہ اسی شہر کی گلیوں میں کہیں رہتا ہے

جس کی سانسوں سے مہکتے تھے در و بام ترے
اے مکاں بول! کہاں اب وہ مکیں رہتا ہے

اک زمانہ تھا کہ سب ایک جگہ رہتے تھے
اور اب کوئی کہیں کوئی کہیں رہتا ہے

روز ملنے پہ بھی لگتا تھا کہ جگ بیت گئے
عشق میں وقت کا احساس نہیں رہتا ہے

دل فردہ تو ہوا دیکھ کے اُس کو لیکن
عمر بھر کون جواں کون حسیں رہتا ہے

اسلم انصاری

میں نے روکا بھی نہیں اور وہ ٹھہرا بھی نہیں
حادثہ کیا تھا جسے دل نے بھلایا بھی نہیں

جانے والوں کو کہاں روک سکا ہے کوئی
تم چلے ہو تو کوئی روکنے والا بھی نہیں

دور و نزدیک سے اٹھتا نہیں شورِ زنجیر
اور صحرا میں کوئی نقشِ کفِ پا بھی نہیں

گل بہر رنگ تبسم کا گُنہ گار رہا!
زخم ہستی کا سوا اس کے مداوا بھی نہیں

کون سا موڑ ہے، کیوں پاؤں پکڑتی ہے زمیں
اس کی بستی بھی نہیں، کوئی پکارا بھی نہیں

بے نیازی سے کبھی قریۂ جاں سے گزرے
دیکھتا کوئی نہیں ہے کہ تماشا بھی نہیں

وہ تو صدیوں کا سفر کر کے یہاں پہنچا تھا
تو نے منہ پھیر کے جس شخص کو دیکھا بھی نہیں

پروین شاکر

جستجو کھوئے ہوؤں کی عمر بھر کرتے رہے
چاند کے ہمراہ ہم ہر شب سفر کرتے رہے

راستوں کا علم تھا ہم کو نہ سمتوں کی خبر
شہر نا معلوم کی چاہت مگر کرتے رہے

ہم نے خود سے بھی چھپایا اور سارے شہر کو
تیرے جانے کی خبر دیوار و در کرتے رہے

وہ نہ آئے گا ہمیں معلوم تھا، اس شام بھی
انتظار اس کا مگر کچھ سوچ کر، کرتے رہے

آج آیا ہے ہمیں بھی اُن اُڑانوں کا خیال
جن کو تیرے زعم میں، بے بال و پر کرتے رہے

خاطر غزنوی

گو ذرا سی بات پر برسوں کے یارانے گئے
لیکن اتنا تو ہوا کچھ لوگ پہچانے گئے

گرمیٔ محفل فقط اک نعرۂ مستانہ ہے
اور وہ خوش ہیں کہ اس محفل سے دیوانے گئے

میں اسے شہرت کہوں یا اپنی رُسوائی کہوں
مجھ سے پہلے، اُس گلی میں میرے افسانے گئے

یوں تو میری رگِ جاں سے بھی تھے نزدیک تر
آنسوؤں کی دُھند میں لیکن نہ پہچانے گئے

وحشتیں کچھ اس طرح اپنا مقدر ہو گئیں
ہم جہاں پہنچے، ہمارے ساتھ ویرانے گئے

اب بھی ان یادوں کی خوشبو ذہن میں محفوظ ہے
بارہا ہم جن سے گلزاروں کو مہکانے گئے

کیا قیامت ہے کہ خاطر کشتۂ شب بھی تھے ہم
صبح آئی تو بھی مجرم ہم ہی گردانے گئے

ریاض مجید

وقت خوش خوش کاٹنے کا مشورہ دیتے ہوئے
رو پڑا وہ آپ، مجھ کو حوصلہ دیتے ہوئے

اس سے کب دیکھی گئی تھی میرے رُخ کی مردنی
پھیر لیتا تھا وہ منہ، مجھ کو دوا دیتے ہوئے

خوابِ بے تعبیر سی سوچیں مرے کس کام کی؟
سوچتا اتنا تو وہ دستِ عطا دیتے ہوئے

بے زبانی بخش دی خود احتسابی نے مجھے
ہونٹ سل جاتے ہیں دنیا کو گلہ دیتے ہوئے

اپنی رہ مسدود کر دے گا یہی بڑھتا ہجوم
یہ نہ سوچا ہر کسی کو راستہ دیتے ہوئے

آپ اپنے قتل میں شامل تھا میں مقتول شوق
یہ کھلا مجھ پر، طلب کا خوں بہا دیتے ہوئے

وہ ہمیں جب تک نظر آتا رہا، تکتے رہے
گیلی آنکھوں، اُکھڑے لفظوں سے دعا دیتے ہوئے

جانے کس دہشت کا سایہ اس کو مہر لب ہوا
ڈر رہا ہے وہ مجھے کھل کر صدا دیتے ہوئے

بے اماں تھا آپ لیکن معجزہ ہے یہ ریاضؔ
ہالۂ شفقت تھا اس کو آسرا دیتے ہوئے

ساحر لدھیانوی

محبت ترک کی میں نے گریباں سی لیا میں نے
زمانے اب تو خوش ہو زہر یہ بھی پی لیا میں نے

ابھی زندہ ہوں لیکن سوچتا رہتا ہوں خلوت میں
کہ اب تک کس تمنا کے سہارے جی لیا میں نے

انھیں اپنا نہیں سکتا مگر اتنا بھی کیا کم ہے
کہ کچھ مدت حسیں خوابوں میں کھو کر جی لیا میں نے

بس اب تو دامن دل چھوڑ دو بیکار امیدو
بہت دُکھ سہہ لیے میں نے بہت دن جی لیا میں نے

شکیب جلالی

آ کے پتھر تو مرے صحن میں دو چار گرے
جتنے اس پیڑ کے پھل تھے، پسِ دیوار گرے

ایسی دہشت تھی فضاؤں میں کھلے پانی کی
آنکھ جھپکی بھی نہیں، ہاتھ سے پتوار گرے

مجھے گرنا ہے تو میں اپنے ہی قدموں میں گروں
جس طرح سایۂ دیوار پہ دیوار گرے

تیرگی چھوڑ گئے دل میں اُجالے کے خطوط
یہ ستارے مرے گھر ٹوٹ کے بے کار گرے

کیا ہوا ہاتھ میں تلوار لیے پھرتی تھی
کیوں مجھے ڈھال بنانے کو یہ چھتنار گرے

دیکھ کر اپنے در و بام، لرز جاتا ہوں
میرے ہمسائے میں جب بھی کوئی دیوار گرے

وقت کی ڈور خدا جانے کہاں سے ٹوٹے
کس گھڑی سر پہ یہ لٹکی ہوئی تلوار گرے

ہم سے ٹکرا گئی خود بڑھ کے اندھیرے کی چٹان
ہم سنبھل کر جو بہت چلتے تھے، نا چار گرے

ہاتھ آیا نہیں کچھ رات کی دلدل کے سوا
ہائے کس موڑ پہ خوابوں کے پرستار گرے

وہ تجلی کی شعاعیں تھیں کہ جلتے ہوئے تیر
آئینے ٹوٹ گئے، آئینہ بردار گرے

دیکھتے کیوں ہو شکیبؔ اتنی بلندی کی طرف
نہ اُٹھایا کرو سر کو کہ یہ دستار گرے

غزل

جو فرض عین ہو، پہلے وہ کام کر لینا
خلوص دل سے کیا ہو اعلان، عام کر لینا

ہے دل یہ مائل کہیں ایسا تو نہیں
چھپا رہے یونہی دل میں، سلام کر لینا

رہبر نہ مل سکا نہ دلبر ملا ہمیں
مل جائیں دونوں خود اپنا ہی انعام کر لینا

نہیں گل کی صورت تو کیا کرے کوئی
جو ہیں خار کی صورت تو غلام کر لینا

نہ ہو گا کچھ حاصل بھنور سی ہے دنیا
ہوا کے رخ پر حاصل اپنا مقام کر لینا

نہ آئیں گے نقیؔ بس انتظار باقی ہے
ہے یہ بھی فرض عین صبح سے شام کر لینا

نقی حسین نقی امروہوی

مجید امجد

برس گیا بہ خراباتِ آرزو، ترا غم
قدح قدح تری یادیں، سبو سبو ترا غم

ترے خیال کے پہلو سے اُٹھ کے جب دیکھا
مہک رہا تھا زمانے میں چار سُو ترا غم

غبارِ رنگ میں رس ڈھونڈتی کرن تری دُھن
گرفتِ سنگ میں بل کھاتی آب جُو ترا غم

ندی پہ چاند کا پر تو، ترا نشانِ قدم
خطِ سحر پہ اندھیروں کا رقص، تُو، ترا غم

نخیلِ زیست کی چھاؤں میں نے بہ لب تری یاد
فصیلِ دل کے کلس پر ستارہ جُو، ترا غم

طلوعِ مہر، شگفت، سحر، سیاہیٔ شب
تری طلب، تجھے پانے کی آرزو، ترا غم

نگہ اُٹھی تو زمانے کے سامنے ترا رُوپ
پلک جھکی، تو مرے دل کے رُبرو، ترا غم

منیر نیازی

اشکِ رواں کی نہر ہے اور ہم ہیں دوستو
اُس بے وفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو

لائی ہے اب اُڑا کے گئے موسموں کی باس
برکھا کی رُت کا قہر ہے اور ہم ہیں دوستو

شام الم ڈھلی تو چلی درد کی ہوا
راتوں کا پچھلا پہر ہے اور ہم ہیں دوستو

پھرتے ہیں مثلِ موجِ ہوا شہر شہر میں
آوارگی کی لہر ہے اور ہم ہیں دوستو

آنکھوں میں اُڑ رہی ہے لُٹی محفلوں کی دُھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو

ناصر کاظمی

دل میں اک لہر سی اُٹھی ہے ابھی
کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی

شور برپا ہے خانۂ دل میں
کوئی دیوار سی گری ہے ابھی

بھری دنیا میں جی نہیں لگتا
جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی

یاد کے بے نشاں جزیروں سے
تیری آواز آ رہی ہے ابھی

شہر کی بے چراغ گلیوں میں
زندگی تجھ کو ڈھونڈتی ہے ابھی

سو گئے لوگ اُس حویلی کے
ایک کھڑکی مگر کھلی ہے ابھی

وقت اچھا بھی آئے گا ناصرؔ
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

رنگ برنگ کہاوتیں

دلچسپ واقعات جنہوں نے کہاوتوں کو جنم دیا

پروفیسر سیّد مجیب ظفر انوار حمیدی

ہماری قومی زبان کا دامن دلچسپ و مزیدار کہاوتوں سے مالا مال ہے۔ یہ کہاوتیں اپنی تاریخ رکھتی ہیں۔ مشہور کہاوتوں کی داستان آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

بخشو بلی، چوہا لنڈورا ہی بھلا

لنڈورا یعنی بغیر دُم کے۔ قصہ مشہور ہے کہ ایک بلی نے ایک چوہے پر لپک کر حملہ کیا۔ چوہا بھاگ کر اپنے بل میں گھس گیا لیکن اس کی دُم بلی کے پنجوں میں کٹ کر رہ گئی۔ بلی نے چاپلوسی سے کام نکالنا چاہا اور چوہے سے بولی ”میاں چوہے! تم باہر آ جاؤ تو ہم دونوں مل کر کھیلیں گے اور تم اپنی دُم بھی مجھ سے لے لینا۔“

چوہا اس کی چال سمجھ گیا۔ اس نے بلی کو جواب دیا ”بخشو بی بلی، چوہا لنڈورا ہی جی لے گا۔“ اگر کسی کام میں معمولی سی کمی رہ جائے تو کام کی تکمیل کی خاطر بڑا خطرہ مول لینے کی سفارش یا تنبیہ پر یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔

بغل میں بچہ شہر میں ڈھنڈورا

ڈھنڈورا یعنی مسلسل ڈھولک بجانا۔ پرانے زمانے میں جب ٹی وی، لاؤڈ اسپیکر وغیرہ کچھ نہیں تھا تو شہر کے لوگوں کو ڈھنڈورے کے ذریعے سرکاری خبریں پہنچائی جاتی تھیں۔ ڈھنڈورا چوراہے پر پیٹا جاتا تھا اور لوگ جمع ہو کر ڈھنڈورچی سے سرکاری اعلان سن لیا کرتے۔ جب کوئی چیز آنکھوں کے سامنے ہو لیکن اس کی تلاش چاروں طرف زور و شور سے کی جا رہی ہو تو یہ کہاوت بولی جاتی ہے۔

بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا

جب گھروں میں ریفریجریٹر نہیں ہوتے تھے تو باورچی خانے کی چھت سے عموماً رسی لٹکی رہتی جس کو ”چھینکا“ کہتے تھے۔ رات کو دودھ یا سالن کی ہانڈی اس میں رکھ دی جاتی۔ اس طرح ایک تو کھلی ہوا میں رہنے سے چیز کے خراب ہونے کا امکان کم ہو جاتا اور دوسرے وہ چوہوں اور بلی کی دسترس سے بھی بچ جاتی۔ بلی کے بھاگوں یعنی قسمت سے اگر چھینکا ٹوٹ جائے تو گویا یہ بلی کی خوش قسمتی ہوئی۔ چنانچہ اگر کسی شخص کی خوش قسمتی سے کوئی ان ہونی بات اس کے حق میں ہو جائے تو یہ کہاوت بولی جاتی ہے۔

بلی پہلے دن ہی ماری جاتی ہے

یعنی جھگڑے یا فساد کے انسداد کی فکر اوّل روز ہی کی جاتی ہے۔ دیر ہو جائے تو معاملہ ہاتھ سے نکل سکتا ہے۔ اس

کہاوت سے ایک قصہ منسوب ہے۔ دو بھائیوں کی ساتھ ساتھ شادی ہوئی۔ کچھ دن بعد دیکھا گیا کہ چھوٹے بھائی کی بیوی تو نہایت فرمانبردار اور خدمت گزار ہے لیکن بڑے بھائی کی نہایت تنک چڑھی اور جھگڑالو ہے۔ اس نے شوہر کی جان ضیق میں ڈال رکھی ہے۔ ایک دن بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی سے پوچھا ”کیا بات ہے کہ تمہاری بیوی ایسی خاموش اور نیک بخت ہے جب کہ میری ایسی ناکارہ اور بدزبان؟“

چھوٹے بھائی نے کہا ”بھائی صاحب! شادی کے بعد جب میں حجلۂ عروسی میں داخل ہوا تو اُسی وقت کہیں سے ایک بلی کمرے میں گھس آئی۔ قریب ہی کونے میں ایک ڈنڈا رکھا ہوا تھا۔ میں نے انتہائی غضب ناک ہو کر ڈنڈا گھما کر جو بلی کو رسید کیا تو وہ وہیں جاں بحق ہو گئی۔ بیوی کے دل پر میرے غصے کی دہشت ایسی بیٹھی کہ وہ اب کسی بات پر مجھ سے اختلاف نہیں کرتی۔“

بڑے بھائی نے یہ باتیں غور سے سنیں۔ اُسی رات جب وہ اپنے کمرے میں گیا تو اتفاق سے بیوی کی پالتو بلی وہاں گھس آئی۔ اُس نے کونے میں کھڑا ایک ڈنڈا اُٹھا کر بلی کو ایسا رسید کیا کہ وہ وہیں گر کر مر گئی۔ یہ دیکھ کر بیوی کو غصہ آ گیا اور اُس نے اپنے خاوند کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ دوسرے دن بڑے بھائی نے چھوٹے سے کہا کہ اُس کا بتایا ہوا نسخہ تو کسی کام نہ آیا۔ چھوٹے بھائی نے مسکرا کر کہا ”بھائی صاحب! بلی پہلے ہی روز ماری جاتی ہے!“ محل استعمال کا اسی سے قیاس کر لیجیے۔

بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا

اس کہاوت کے ساتھ ایک قصہ منسوب ہے۔ ایک بلی مستقل چوہوں کا شکار کیے جا رہی تھی۔ چوہوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس مصیبت سے کس طرح نجات حاصل کی جائے۔ آخر سب سر جوڑ کر بیٹھے۔ ایک چوہے نے تجویز پیش کی کہ بلی کے گلے میں گھنٹی باندھ دی جائے تو اس کے آنے کی ٹن ٹن سن کر چوہے بھاگ کر اپنی جان بچا سکیں گے۔ تجویز کو سب نے بہت پسند کیا۔ اتنے میں ایک چوہے نے پوچھا ”لیکن بلی کے گلے میں گھنٹی باندھے گا کون؟“

یہ سن کر چاروں جانب سناٹا چھا گیا۔ گویا کسی مشکل کا حل تجویز کرنا جس قدر آسان ہوتا ہے اسی قدر اس پر عمل درآمد دشوار بلکہ ناممکن ہو سکتا ہے۔ دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ تجویز کے ہر پہلو پر غور کر کے، پھر اس کو پیش کیا جائے۔

بندر بانٹ کرنا

یعنی دو اشخاص کے درمیان کسی شے کی ایسی تقسیم کرنا جس سے فریقین کو تو کچھ نہ ملے لیکن تقسیم کرنے والا سارا مال ہڑپ لے۔ اس کہاوت سے ایک کہانی منسوب ہے۔ ایک بار دو کوّوں کو ایک روٹی مل گئی اور اس کی تقسیم پر ان میں جھگڑا ہونے لگا۔ وہ دونوں ایک بندر کے پاس روٹی کی تقسیم کے لیے گئے۔ بندر نے روٹی کے دو ٹکڑے کیے لیکن ایک کوّے نے کہا کہ اُس کا ٹکڑا دوسرے کے ٹکڑے سے چھوٹا ہے۔ اس پر بندر نے دوسرے ٹکڑے سے ایک نوالہ کاٹ کر کھا لیا۔ لیکن ایسا کرنے سے اب وہ ٹکڑا پہلے ٹکڑے سے چھوٹا ہو گیا۔

کوّوں نے پھر شکایت کی تو بندر نے پھر بڑے ٹکڑے میں سے ایک نوالہ کتر کر کھا لیا جس سے پہلا ٹکڑا چھوٹا ہو گیا۔ کوّے شکایت کرتے رہے اور بندر روٹی کھاتا رہا یہاں تک کہ آخر میں بندر کے پاس روٹی کا نہایت چھوٹا سا ٹکڑا رہ گیا۔ اس نے کہا ”اب یہ تو اتنا چھوٹا ہو گیا ہے کہ اس کے دو ٹکڑے ہو ہی نہیں سکتے۔“ یہ کہہ کر اُس نے وہ آخری ٹکڑا بھی منہ میں رکھ لیا اور کوّے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ اسی کو ”بندر بانٹ“ کہتے ہیں۔

بہت ٹیڑھی کھیر ہے

قصہ مشہور ہے کہ ایک شخص نے ایک اندھے سے پوچھا ”کھیر کھاؤ گے؟“ اُس نے جواباً پوچھا ”کھیر کیا ہوتی ہے“۔ اُس شخص نے کہا کہ ”حلوے کی طرح میٹھی اور رنگ میں سفید“۔ اندھے نے دریافت کیا کہ ”سفید کا کیا مطلب ہے؟“ اُس شخص نے کہا ”جیسے بگلا“۔ اندھے آدمی نے حیرانی

سے پوچھا کہ ’’یہ بگلا کیا ہوتا ہے؟‘‘

اُس شخص نے ہاتھ کو بگلے کی شکل میں ٹیڑھا کر کے اندھے کے سامنے کر دیا۔ اندھے نے ٹٹول کر اس کا ہاتھ چھوا اور بولا ’’بھائی یہ تو بہت ٹیڑھی کھیر ہے۔ ہم سے نہیں کھائی جائے گی۔‘‘ اسی مناسبت سے اگر کوئی کام مشکل اور پیچیدہ ہو تو اس کو ٹیڑھی کھیر کہتے ہیں۔ محل استعمال معنی سے ظاہر ہے۔

پانڈے جی پچھتاؤ گے، وہی چنے کی کھاؤ گے

جب کوئی شخص ضد میں کسی کام سے انکار کر دے لیکن بعد میں مجبور ہو کر راضی ہو جائے تو یہ کہاوت بولی جاتی ہے۔ کہاوت سے ایک کہانی منسوب ہے۔ ایک پنڈت جی کو چنے کی روٹی اور دال سخت ناپسند تھے۔ ایک دن جب بیوی نے ان کے سامنے چنے کی دال اور روٹی رکھی تو پنڈت جی نے کھانے سے انکار کر دیا۔ بیوی نے سمجھایا کہ گھر میں اس وقت اور کچھ پکانے کو نہیں ہے، لیکن وہ نہ مانے اور غصہ میں بھنائے گھر سے نکل گئے۔

شام تک بھوک نے اتنا برا حال کر دیا کہ ہار کر گھر واپس آئے اور خاموشی سے کھانے کی چٹائی پر بیٹھ گئے۔ بیوی مطلب سمجھ گئی اور اس نے دال روٹی ان کے سامنے رکھ دی۔ پانڈے جی نے بحالت مجبوری اسی سے پیٹ کی آگ بجھائی۔

پنچ کہیں بلّی تو بلّی ہی سہی پنچ

اگر لوگوں کی اکثریت کسی بات پر متفق ہو جائے تو غلط بات بھی سچ ہو جاتی ہے اور اس کو ماننا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ قصہ مشہور ہے کہ ایک شخص کے گھر میں رات کو چور گھس آیا اور کمرے میں چوری کرنے گیا۔ اس شخص کی آنکھ کھل گئی اور اس نے چپکے سے کمرے کی کنڈی باہر سے لگا دی کہ چور نکل کر بھاگ نہ سکے۔ چور نے گھبرا کر اس اُمید پر بلّی کی طرح میاؤں میاؤں کہنا شروع کیا کہ وہ شخص اسے بلّی سمجھ کر دروازہ کھول دے گا اور وہ بھاگ نکلے گا۔ اُس شخص نے بلّی کی آواز سن کر کہا کہ ’’پنچ کہیں بلّی تو بلّی ہی سہی‘‘ یعنی صبح ہونے دو تو پنچوں کو بلاؤں گا۔ اگر وہ کہتے ہیں کہ تو بلّی ہی ہے تو میں مان کر تجھ کو چھوڑ دوں گا۔

تھکا اُونٹ سرائے کو تکتا ہے

پرانے زمانے میں اونٹ سفر کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ مسافروں کے آرام کی خاطر جابجا سرائے موجود تھیں۔ جہاں کھانا پینا اور رات بسر کرنے کی سہولت کرایے پر مل جاتی۔ دن بھر سامان اور مسافر لاد کر سفر کرنے کے بعد تھکا ہارا اُونٹ جب سرائے دیکھتا، تو منہ اٹھا اٹھا کر اسے تکتا کہ اب تھوڑی دیر میں شاید آرام مل سکے گا۔ یہ کہاوت تب کہی جاتی ہے جب کوئی شخص زندگی کا سفر تقریباً مکمل کر چکا ہو اور خود کو موت کے قریب محسوس کرے۔

جاٹ مراتب جانیے جب تیرھویں ہو جائے

تیرھویں یعنی کسی کے مرنے کے تیرھویں دِن ہونے والی رسم۔ جاٹ بہت سخت جان اور جفاکش مشہور ہیں اس لیے ان کا نام لیا گیا۔ کہاوت کا مطلب ہے کہ جب تک کسی معاملے کی اچھی طرح تصدیق نہ ہو جائے اس پر یقین نہ کرو اور تحقیق جاری رکھنی چاہیے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک حکایت بیان کی جاتی ہے۔

ایک جاٹ نے ایک بنیے سے قرض لیا۔ وقت کے ساتھ سود کی وجہ سے قرض کی رقم بڑھتی گئی اور جاٹ کسی طرح اسے ادا نہ کر سکا۔ جب بنیے کے تقاضے بہت بڑھ گئے تو اس نے عاجز آ کر اپنی فرضی موت کی خبر تک پہنچا دی۔ بنیا کف افسوس ملتا رہ گیا۔ حادثے کی تصدیق کے لیے وہ جاٹ کے گاؤں گیا اور اس کے گھر والوں سے تعزیت بھی کر آیا۔ سب نے اپنے عزیز کی موت پر بہت رنج کا اظہار کیا۔ اتفاق سے کچھ دنوں کے بعد بنیے کو ایک قریبی گاؤں میں کسی کام سے جانا پڑا۔ وہاں اس نے بازار میں اُس جاٹ کو گھومتے پھرتے دیکھا تو بھونچکا رہ گیا۔ لوگوں سے گھبرا کر پوچھا تو انھوں نے کہا کہ ’’شاہ جی! جاٹ مراتب جانیے جب تیرھویں ہو جائے۔‘‘

ڈیل کارنیگی

’’اچھے دن کا اختتام‘‘

وہ گیت جس نے ایک مقروض خاتون کو کروڑپتی بنا دیا

پچاس برس پہلے امریکا کی ریاست مشی گن کے شمالی حصے میں فرینک بانڈ نامی ایک ڈاکٹر رہتا تھا۔ ایک یخ بستہ رات کو اچانک اسے ایک مریض دیکھنے باہر جانا پڑا۔ رخصت ہونے سے پہلے اس نے بیوی سے کہا ’’میری جان ایسے بے وقت میرا گھر سے نکلنا تمھیں گراں گزرتا ہوگا، لیکن ایک ڈاکٹر کی زندگی کا طور یہی ہے۔ ہمیں ایک دوسرے سے محبت ہے اور اس قسم کی جدائیاں محبت کو استوار کرتی ہیں۔‘‘

یہ اس کے آخری الفاظ تھے۔ ابھی وہ اپنے گھر سے تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ برف پر سے اس کا پاؤں بُری طرح پھسلا۔ ڈاکٹر کے سر پر سخت چوٹ آئی اور اس کی کئی پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ چند لمحوں بعد وہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

ڈاکٹر اپنے پیچھے دس ہزار ڈالر کا قرضہ اور ایک بچہ چھوڑ گیا تھا۔ ڈاکٹر کی بیوی، کیری جیکبس بانڈ حیران و پریشان تھی کہ اب وہ کیا کرے؟ اسے کسی قسم کی تجارت کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ وہ تو فقط گھریلو زندگی سے واقف تھی۔ اسے گھریلو کام کاج کیے بھی عرصہ گزر چکا تھا کیونکہ وہ ایک مدت سے دمے کی مریضہ تھی۔ جب اسے دمے کا دورہ پڑتا تو اس کا سارا جسم ڈھانچے کی طرح جھولنے لگتا۔

لیکن وہ ہمدردی اور نہ ہی خیرات کی خواہشمند تھی۔ اسے اپنے آپ پر بہت فخر تھا، لہٰذا اس نے اپنے احباب اور رشتے داروں سے کنارا کیا اور شکاگو چلی گئی تاکہ وہاں آئندہ زندگی کی سختیاں عزیز و اقارب سے دور رہ کر جھیل سکے۔

اس نے کیا کچھ کیا؟ سب سے پہلے اس نے ایک مسافر خانہ کھولا، لیکن وہ اس کے اخراجات کی متحمل نہ ہو سکی۔ پھر اس نے چینی کے برتنوں پر نقش و نگار بنا کر فروخت کرنا شروع کر دیا لیکن لوگوں نے انھیں کوئی خاص پسند نہ کیا، پھر وہ گیت لکھنے لگی لیکن کوئی ناشر انھیں خریدنے پر تیار نہ تھا۔

آخر پندرہ برس بعد کیری جیکبس بانڈ (Carrie-Jacobs Bond) نے ’’ایک اچھے دن کا اختتام‘‘ کے عنوان سے ایک گیت لکھا۔ اس گیت کی ساٹھ لاکھ کاپیاں فروخت ہوئیں اور اس نے تقریباً پانچ لاکھ ڈالر کمائے۔

مگر جب اس نے شروع شروع میں گیت لکھے تو کوئی انھیں دس پونڈ کے عوض بھی خریدنے کو تیار نہ تھا۔ مفلسی نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ اس کے پاس اتنے پیسے بھی نہ ہوتے تھے کہ مکان کا کرایہ ادا کر سکے۔ اسے ہر وقت یہ خطرہ رہتا تھا کہ کہیں مالک مکان اس کا سامان مکان سے نکال کر باہر فٹ پاتھ پر نہ رکھ دے۔

سردیوں میں اپنا جسم گرم رکھنے کے لیے اس کے پاس

اتنی رقم نہ ہوتی کہ ایندھن خرید سکے۔ وہ اتنی غریب ہو گئی کہ دن میں فقط ایک بار کھانا کھاتی تھی۔ آخر اس نے فاقوں سے تنگ آ کر اپنا بچا کھچا فرنیچر بھی فروخت کر ڈالا۔

لیکن اس ساری پریشان کن مفلسی کے زمانے میں کیری جیکبس بانڈ خوبصورت گیت لکھتی رہی۔ ایسے گیت جو ایک دن دنیا میں مشہور ہونے تھے اور ہر ایک نے انھیں گاتے پھرنا تھا مگر مسز بانڈ ان گیتوں کو ردی کے کاغذوں پر لکھا کرتی تھی کیونکہ اس کے پاس اتنے پیسے نہ ہوتے کہ اچھا اور صاف کاغذ خرید سکے۔ وہ شمع کی روشنی میں گیت لکھتی، کیونکہ گیس روشن کرنے کی حیثیت نہ تھی۔

وہ اپنے گیت مشتہر کرنا چاہتی تھی لیکن اس کے پاس اشتہار دینے کے لیے ڈالر نہ تھے لہٰذا وہ اشتہاروں کی قیمت چکانے کے لیے ایڈیٹروں کی بیویوں کے کپڑے سیا کرتی۔ شروع شروع میں اسے کسی کلب میں شام کے وقت گیت سنانے کے بمشکل دس ڈالر ملا کرتے۔ جب بعد میں مشہور ہو گئی تو اسے کسی کلب میں گیت سنانے کے لیے بارہ منٹ کا معاوضہ دو سو ڈالر ملا کرتا۔

جب پہلی دفعہ وہ ایک کلب میں گیت سنانے گئی تو لوگوں نے اس کا خوب مذاق اُڑایا۔ شکستہ دل ہو کر وہ کلب کے عقبی دروازے سے ننگے پاؤں باہر گلی میں بھاگ آئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے لیکن بعد میں اس کا نام اور تصویر نامور اخباروں اور رسالوں میں شائع ہونے لگے۔ تب اسے تھیٹر میں گیت سنانے کے عوض دو ہزار ڈالر فی ہفتہ ملتا۔

ایک دفعہ اسے ایک گورنر کے سامنے گیت سنانا تھا لیکن پہننے کے لیے اس کے پاس لباس نہ تھا اور نہ ہی اتنے پیسے تھے کہ بازار سے خرید سکے۔ اس نے اپنا ٹرنک کھولا، اس میں دو بڑے بڑے پردے پڑے تھے۔ اس نے وہ پردے سی کر لباس تیار کر لیا۔

پھر ایک دن ایسا آیا کہ مسز بانڈ کو اپنے چند دوستوں کے ہمراہ شمالی کیلیفورنیا کے حسن پرور اور نظر فریب مناظر میں ایک دن گزارنے کا موقع ملا۔ اس کا وہ دن بڑے طلسمی انداز میں گزرا۔ شام کے وقت وہ روبی ڈیکس کی پہاڑی پر کھڑی ڈوبتے ہوئے سورج کا نظارہ کر رہی تھی۔ جب سورج دور سمندر میں غروب ہو رہا تھا تو اس نے اپنے آپ سے کہا "سچ مچ یہ کتنا اچھا دن ہے۔"

لفظ اور مصرعے اس کے ذہن میں ترتیب پانے لگے۔ شکر گزاری کا ایک جذبہ اس کے دل میں جنم لینے لگا۔ اس پر شعر کہنے کا موڈ طاری ہو گیا اور اس نے وہیں دو قطعے لکھ ڈالے۔ پھر وہ اس کی طرز بھی گنگنانے لگی۔ بات بن گئی تھی۔

موسیقی کے ایک معجزے نے جنم لے لیا تھا۔ اس نے کسی کوشش کے بغیر ایک ایسے گیت کی تخلیق کی تھی جس نے بیسویں صدی کی غنائیہ شاعری میں ہلچل پیدا کر دی۔

جب مسٹر روز ویلٹ امریکا کا صدر تھا تو وہ مسز بانڈ کو وائٹ ہاؤس میں بلا کر اس سے گیت سنا کرتا۔ "ایک اچھے دن کا اختتام" صدر ہارڈنگ کا محبوب ترین گیت تھا۔ اس گیت کا اردو ترجمہ ذیل میں درج ہے:

جب آپ ایک اچھا دن گزار چکے ہوں
اور شام کے وقت اپنے خیالات میں محو ہوں
اور دن کی لائی ہوئی خوشی کی یاد میں
کلیسا کی گھنٹیاں سریلے انداز میں بجتی ہوں
تو کیا آپ جانتے ہیں کہ ایک اچھے دن کا اختتام
جب سورج اپنی آتشیں کرنوں کے ہمراہ ڈوب رہا ہو
اور عزیز دوست جدا ہونے والے ہوں
ایک تھکے ہوئے دل کے لیے کیا اہمیت رکھتا ہے
ایک سفر کے اختتام پر
یہ ایک اچھے دن کا اختتام بھی ہے
لیکن یہ اپنے پیچھے ایک ایسا خیال
چھوڑے جا رہا ہے
جو بڑا مؤثر اور سچا ہے
اس اچھے دن نے اپنی یاد کی تصویر
ایسے رنگوں کے ساتھ کھینچ دی ہے
جو کبھی دھندلے نہ پڑیں گے
یہ یاد ایک اچھے دوست سے کم نہیں

◆●●

مہدی آذر یزدی

گدھے کا مشورہ

ایک احمق کی کتھا، اُس نے بلاوجہ مصیبت اپنے سر مول لی

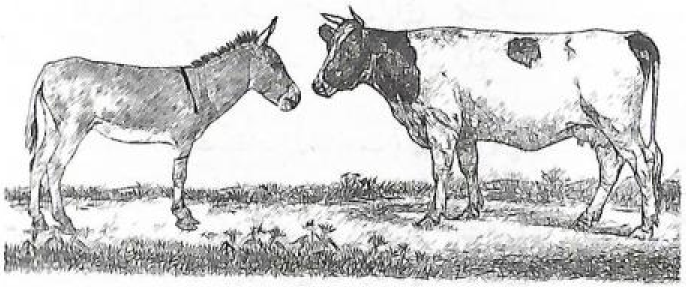

ایک دیہاتی کے پاس ایک گدھا اور ایک گائے تھی۔ وہ ان دونوں کو ایک ہی طویلے میں باندھتا تھا۔ گدھے پر سواری کرتا تھا اور اس کا خوب خیال رکھتا لیکن گائے کو صحرا میں لے جاتا۔ اُسے جوتتا اور زمین میں ہل چلاتا۔ فصل گاہنے کا وقت آتا تو اس کو کھلیان کے چرخ میں جوت دیتا اور اس سے خوب کام لیتا۔

ایک روز گائے بہت تھک چکی تھی۔ جب وہ گھر لوٹ رہی تھی، مسلسل اپنے آپ سے باتیں کرتی اور بڑبڑاتی جاتی۔

گدھے نے اس سے پوچھا: "اس قدر ناخوش کیوں ہو اور کیوں اپنے آپ سے باتیں کرتی جا رہی ہو؟"

گائے بولی، "کچھ نہیں، تم گدھوں کو ہمارے دکھوں کا کچھ اندازہ نہیں۔ ہم تمہارے مقابلے میں زیادہ بدقسمت ہیں۔"

گدھا: "یہ کیا بات کر رہی ہو؟ تم بوجھ اٹھاتی ہو، ہم بھی بوجھ اٹھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کیا بہتر اور کیا بدتر، کوئی فرق نہیں۔" گائے بولی "کیوں نہیں، بڑا فرق ہے۔ گدھے کو سواری اور بار برداری کے لیے طلب کرتے ہیں، اس کے سوا تمہارے ساتھ ان لوگوں کو کچھ کام نہیں ہوتا لیکن ہم پابند ہیں کہ زمین میں ہل چلائیں، گاہنے کے وقت کھلیان کے چرخ کو گھمائیں، دودھ بھی دیں اور سب سے بڑھ کر ہمارا سروکار قصاب کے ساتھ! آج ہی کی بات ہے، مجھے اس قدر ہل چلانا پڑا کہ میرے پہلو ہل پنجائی کے بوجھ سے درد کر رہے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم مجھ سے کیا گناہ سرزد ہوا ہے جس کی یہ سزا ہے۔"

گدھے کو بڑا دکھ ہوا، اس نے کہا: "تم سچ کہتی ہو۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میں تمھیں ایک ایسا گُر بتاؤں کہ اس کے بعد تمھیں صحرا میں نہیں لے جائیں گے اور ہل چلانے سے تمھاری جان چھوٹ جائے گی۔"

گائے بولی: "مجھے نہیں معلوم مگر عام طور پر مشہور یہ ہے

کہ گدھے خاصے ناسمجھ ہوتے ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ تم مجھے کوئی ایسا احمقانہ گُر بتاؤ گے جس کا انجام میرے نقصان پر ہو۔“

گدھا بولا، ”نہیں بھئی، ہم اتنے بھی گدھے نہیں جتنا لوگ کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہمارے مالک ہمیں ہل جوتنے اور کھلیان کا چرخ گھمانے کے لیے نہیں لے جاتے۔ سردست تم ایک دفعہ میری نصیحت کو آزما کے تو دیکھو۔ جس قدر مجھے علم ہے، لوگ سخت کاموں کو طاقتور اور صحت مند گایوں کے کندھوں پر ڈال دیتے ہیں اور تم بھی چونکہ خوب عمدہ کام کرتی ہو، اس لیے یہ لوگ تم سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ میرے خیال میں تمہیں چاہیے کہ خود کو بیمار ظاہر کرو اور ہائے وائے کرو اور راہ چلنے سے اجتناب کرو۔ کوئی کسی سے زبردستی کام نہیں لے سکتا۔“

گائے بولی: ”کیا مشورہ ہے! ارے اس وقت وہ مجھ پر لاٹھی اٹھالیں گے اور مار پیٹ کریں گے۔“

گدھا: ”میری دانست میں زیادہ کام کرنے سے تھوڑے سے ڈنڈے کھا لینا بہتر ہے۔ اصل میں راہ چلنے سے پہلے ہی اس کی پیش بندی کر لینی چاہیے۔ صبح جب تمہیں صحرا میں لے جانے کے لیے آئیں تو تمہیں چاہیے زمین پر کسی کروٹ لمبی پڑ جاؤ اور ہائے ہائے کرنا شروع کر دو۔ تمھیں تین چار چھڑیاں ماریں گے اور جب دیکھیں گے کہ تم اپنی جگہ سے ایک پور برابر بھی حرکت نہیں کر رہیں تو تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دیں گے۔“

گائے بولی۔ ”تم درست کہتے ہو۔ اپنی تمام تر بے وقوفی کے باوجود یہ نکتہ تمہیں خوب سوجھا ہے۔“

اگلے دن گائے زمین پر ایک کروٹ لمبی پڑ گئی اور اس نے ہائے ہائے کرنا شروع کر دی۔ دیہاتی نے جس قدر بھی کوشش کی وہ گائے کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے میں ناکام رہا۔ ناچار وہ طویلے سے باہر نکل آیا کہ کوئی متبادل صورت نکالے۔

گدھا بولا: ”میں نے کہا نہیں تھا! دیکھا میں نے تمہیں کیسا گُر سکھایا۔ اب پھر کہو، گدھوں میں عقل کہاں؟“

چند لمحے گزرے ہوں گے کہ دیہاتی کسی دوسری گائے کا بندوبست نہ کر سکنے کے باعث طویلے میں واپس آیا اور لگام والی رسی گدھے کے منہ سر میں ڈالی اور اسے باہر لے گیا۔ جب گدھا باہر نکل رہا تھا، اس نے گائے کے کان میں کہا ”یاد رکھو کہ رات تک خود کو اسی طرح بیمار ظاہر کرنا، ورنہ ہوسکتا ہے یہ دوپہر کو آئیں اور تمہیں صحرا میں لے جائیں۔“

گائے بولی، ”اس راہنمائی کا شکریہ۔ اللہ تمہاری عمر اور عزت میں اضافہ فرمائے۔“

دیہاتی اس دن گائے کی جگہ گدھے کو صحرا میں لے گیا۔ اسے ہل میں جوتا اور وہ رات گئے تک زمین میں ہل چلاتا رہا۔ گدھا اپنے دل میں سوچ رہا تھا: ”گائے سے نیکی کرتا کرتا میں خود کباب ہو گیا۔ میں بھی کیا احمق گدھا ہوں، بے وجہ اپنے سر مصیبت مول لے لی۔“

گدھا کام میں کسی قدر جُتا تھا اور جب اسے گائے کا خیال آتا اور کام سے تھک جاتا تو اپنی راہنمائی پر پشیمان ہوتا اور خود سے کہتا: ”میں بھی کیا عجیب گدھا ہوں۔“ ظہر تک وہ بہت تھک گیا۔ اپنے آپ سے کہنے لگا، ”خوب! اب میں اپنی نصیحت پر خود بھی عمل کرتا ہوں۔“ وہیں بیٹھ گیا، آنکھیں میچ لیں اور ہائے وائے شروع کر دی!

دیہاتی نے ایک لکڑی اٹھائی، گدھے کو مارنا پیٹنا شروع کر دیا اور کہنے لگا: ”او بے شعور گدھے! تجھے معلوم ہے گائے بیمار ہے، اب تو بھی سستی دکھا رہا ہے؟ گائے تو دودھ دیتی ہے اس لیے میں نے اس سے نرمی کی لیکن اس لکڑی سے تجھے تو مار ہی ڈالوں گا۔ نہ تیرا دودھ کسی کام کا نہ

تیرا گوشت کسی لائق۔ بول، یہ سب گھاس کس لیے کھاتا ہے، اگر اس ایک روز میں بھی کام نہیں کرنا۔ تیرا نہ ہونا بہتر ہے۔“

گدھے نے جب دیکھا کہ معاملہ بڑا خطرناک ہے، اٹھ بیٹھا اور پہلے تھوڑی سی بےزاری اور بعد میں سرگرمی سے کام میں جُت گیا۔ اُس نے رات بڑی دیر جاگ کر اپنے کام کی تکمیل کی۔ خود سے مسلسل کہتا جاتا تھا: ”میں بھی کیا عجیب گدھا ہوں۔ میں نے خود کو کس مصیبت میں ڈال دیا۔ کچھ ایسا کرنا چاہیے کہ کسی بہانے سے دوبارہ گائے کو صحرا میں بھیجا جائے!“

رات ہو گئی تھی۔ گدھا طویلے میں آیا۔ وہ اگرچہ چاہتا تھا کہ گائے کو اس کے تھک جانے کا احساس ہو لیکن اس کے باوجود اپنی عادت سے مجبور وہ زیرلب بڑبڑائے جا رہا تھا: ”میں بھی کیا عجیب گدھا ہوں۔ میں بھی کیا عجیب گدھا ہوں!“

گائے نے اس کی بڑبڑاہٹ سنی اور بولی: ”نہیں نہیں تُو ہرگز گدھا نہیں۔ خاص طور پر جو گُر تو نے آج مجھے بتایا تھا، خوب تھا۔“

گدھا بولا: ”تم ہر چیز سے واقف نہیں۔ تم طویلے میں سو جانے ہی کو حل سمجھی ہو۔ لیکن آج مجھے ایک ایسی چیز سمجھ میں آئی کہ تمہاری خاطر مجھے بڑا رنج ہوا۔“

گائے بولی: ”ہاں اگر تو صحرا میں گیا ہوگا، تو تجھے اب سمجھ میں آیا ہوگا کہ زمین میں ہل چلانا کتنا مشکل کام ہے۔“

گدھا بولا: ”نہیں، اس کے برعکس میں گیا اور میں نے دیکھا کہ کام مشکل نہیں بہت آسان تھا۔ رنجیدہ ہونے کا سبب کچھ اور تھا اور ڈرتا ہوں کہ میں تمہیں بتاؤں تو تمہیں دُکھ ہوگا۔“

گائے بولی: ”ہاں بتاؤ، کیا سبب تھا۔ کہہ ڈال، مجھے دُکھ نہ ہوگا۔“

گدھا بولا: ”کچھ نہیں۔ دراصل ہمارا مالک آج ظہر کے بعد اپنے دوست سے کہہ رہا تھا: ”صحرا میں کام کے لیے گدھا خاصا بہتر ہے۔ گائے بیمار بھی ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ ہمارے ہاتھ سے جاتی نہ رہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کل اسے قصاب کے ہاتھ فروخت کر دوں تاکہ کم از کم اس کا گوشت تو حرام نہ ہو۔“

گدھے نے اپنی بات کے آخر میں کہا: ”تم یقین کرنا، میں تو تمہاری بھلائی چاہتا تھا اور جب میں نے تمہیں آرام کرنے کا گُر بتایا تھا تو میرا ارادہ بُرائی کا نہیں تھا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ہمارا مالک قصاب کی فکر کرے گا۔ اگر تم درست سمجھتی ہو تو چند دن آرام کر لو۔“

گائے ڈر گئی اور بولی: ”نہیں، بس یہ ایک دن ہی بہت ہے۔ میں جانتی تھی کہ گدھے کا مشورہ گائے کے لیے مفید نہیں ہوسکتا۔ میں کل اپنے کام پر جاؤں گی۔“

گدھے نے سکھ کا سانس لیا اور بولا: ”جب بھی تمہارا دل چاہے میں صحرا میں جانے کے لیے بہرحال حاضر ہوں۔ صحرا بہت عمدہ جگہ ہے۔ ہل اور کھلیان گاہنے کا چرخ بھی بہت خوب ہے۔“

گائے بولی: ”میں خود بھی جانتی تھی۔ تو نے مجھے دھوکا دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ صحرا و ہل، قصاب کی چھری سے بہتر ہیں۔“

گدھا بولا: ”لو اور کرو نیکی! مجھے معلوم تھا کہ گائے کی جنس بھلائی کی قدر کرنا نہیں جانتی۔“

اگلے دن دیہاتی گائے کو بھی صحرا میں لے گیا اور اپنے بیٹے سے کہنے لگا: ”ایک ہل تو بھی اٹھا اور اس گدھے کے ہمراہ کام کر۔ ایک لکڑی بھی ہاتھ میں لے تاکہ اسے سستی اور کاہلی کا خیال نہ آئے۔“ ●●◆

میرے بچپن کے دن

معصومیت اور خوشیوں سے بھرپور
البیلے دنوں کی پُرلطف یادیں

تحسین گل

میں ٹی وی دیکھ رہی تھی کہ اس میں ایک بھولا بسرا گیت گونج اٹھا جو محمد علی شہکی اور افشاں احمد نے گایا تھا:

میرے بچپن کے دن
کتنے اچھے تھے دن

گیت سن کر میں بیتی یادوں میں کھو گئی۔ یہ گیت میں نے پہلی بار اپنے بچپن میں ہی سنا تھا، مگر وہ بچپن تھا لہٰذا اُسے سنا ان سنا کر دیا۔ مگر آج جب ہم بڑھاپے کی دہلیز پر بیٹھے ہیں تو گیت سن کر لگا، واقعی وہ دن کتنے اچھے، کتنے سُہانے تھے۔ وہ دن، لوگ، یادیں، گلیاں سب کچھ کھو گئے۔

میرا بچپن راولپنڈی کے محلہ امر پورہ میں گزرا۔ تب لوگوں کے مکان یک منزلہ، گھر چھوٹے، گلیاں کشادہ اور دل بہت بڑے تھے۔ ہمارے محلے میں ایک خاتون تھیں۔ ماشا اللہ ان کے نو بچے تھے۔ پھر بھی ان کے گھر میں محلے کے دو چار بچے ہر وقت پائے جاتے۔ اس وقت گھروں کے دروازے مستقل کھلے رہتے تھے۔

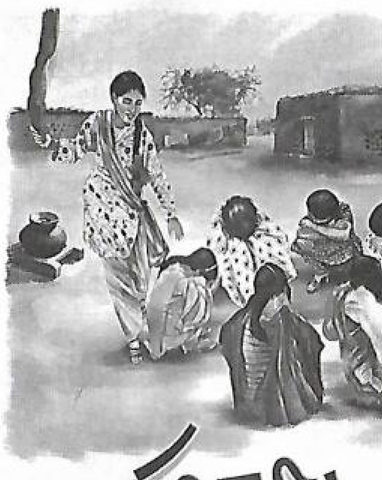

ہم پانچ بہن بھائی تھے۔ ہماری والدہ ماشا اللہ بہت سلیقہ مند اور سگھڑ خاتون تھیں۔ (اللہ انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے) ہم لوگوں کے سکول سے گھر آنے تک وہ صفائی ستھرائی، کھانا پکانے تمام کاموں سے فارغ ہو جاتی تھیں۔ اکثر ایسا ہوتا کہ گھر میں ہماری پسند کا سالن نہ ہوتا تو ہم پیالہ اٹھا کر انھی خاتون کے گھر چلے جاتے اور کہتے، خالہ جان تھوڑا سا سالن دے دیں۔ وہ پیالہ بھر کر ہمیں پکڑا دیتیں اور ہم خوشی خوشی سب بہن بھائی مل کر وہ سالن کھاتے۔

چپس برگر کا ہمیں علم ہی نہ تھا۔ والد سے چار آنے لیتے اور محلے میں بابا جی کی دکان سے مونگ پھلی، ملوک، ناشپاتی لاتے اور اسی میں خوش ہو جاتے۔

چھوٹی عید پر دادا جان ہمیں ۱۰ روپے عیدی دیتے۔ وہ

پیسے صرف ہمارے ہوتے۔ ان ۱۰ روپوں کی جی بھر کر عیاشی کرتے۔ قلفی، گول گپے، سموسے، چاٹ کھاتے اور لاٹ صاحب کی طرح اکڑ کر پھرتے۔ ہمارے سکول کے باہر چاٹ والا ہوتا جو ۲۵ پیسے کی پیالہ بھر چاٹ دیتا۔ اس چاٹ میں اُبلے چنے، ابلے لال لوبیا، آلو ہوتے اور کھٹا پانی۔ مگر اللہ کی قسم اس طرح کی چاٹ زندگی میں دوبارہ نہیں کھائی۔

۲۵ پیسے کی میٹھی مونگ پھلی والی پٹی ملتی جو روز چھٹی کے بعد میں خریدتی۔ وہ ذائقہ بھی دوبارہ نہیں ملا۔ ہمارے محلے میں ایک سبزی والے راجہ جی ہوتے تھے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ شام کو جو سبزی بچ جاتی اس کے پکوڑے بناتے۔ بینگن، گوبھی اور آلو کے پکوڑے، ویسے لذیذ پکوڑے دوبارہ نہیں کھائے۔ ہمارے محلے میں امام دین کے سموسے اور کھٹے لڈو پورے امر پورہ میں مشہور تھے۔ لوگ کہتے ''امام دین کے سموسوں جیسے سموسے کوئی نہیں بناتا۔'' گرمیوں میں ہماری گلی میں ایک شخص قلفی بیچنے آتا تھا۔ وہ خود ہی شاعری گھڑ کر قلفی بیچتا۔

میں سوچتی ہوں اس وقت لوگ کتنے خوش رہتے تھے۔ غریب کو بھی دو وقت کی روٹی آرام سے مل جاتی۔ ہوس نہیں تھی، ہر کوئی خوش رہتا۔ کوئی کسی کی امارت سے جلتا نہیں تھا۔ ہماری پوری گلی میں صرف ایک وکیل تھے جن کے پاس گاڑی تھی۔ اکثر لوگوں کے پاس سائیکل ہوتی۔ میرے والد کے پاس بھی سہراب سائیکل تھی اور وہ اس پر دکان جاتے۔

ہم خوشحال لوگ تھے مگر محلے میں اکثر لوگ متوسط درجے سے تعلق رکھتے مگر سب کا ایک دوسرے سے اچھا رابطہ تھا۔ ہمارے گھر میں اڑوس پڑوس کی خواتین ہر وقت براجمان رہتی تھیں۔ محلے کے بچوں سے ہماری بہت دوستی تھی۔ مجھے یاد ہے جب چھوٹی عید آتی تو والدہ چھوٹا گوشت اور آلو پکاتیں اور ابلے چاول بھی، ہم سب بہنیں اور ہماری سہیلیاں ایک بڑی پرات میں چاول اور سالن ڈال کر کھاتیں اور خوب مزے کرتیں۔ آج بھی وہ پرات اور سالن یاد آتے ہیں۔

اس وقت صرف پی ٹی وی کا راج تھا۔ چار بجے شام نشریات کا آغاز بصیرت سے ہوتا پھر کارٹون لگتے اور اس کے بعد بچوں کا کوئی ڈراما دیکھ کر ٹی وی بند کر دیا جاتا۔ پھر ۸ بجے کا ڈراما دیکھا جاتا۔ نو بجے کے بعد ہمیں ٹی وی دیکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ تب ہم سب بہن بھائی سو جاتے۔

رشتہ داروں کے گھروں میں باقاعدگی سے آنا جانا تھا۔ ہر جمعرات کو والدہ ہمیں دادی اماں اور تائی جان کے گھر لے کر جاتیں۔ رات کو والد کے ساتھ ہم واپس آتے۔ بچوں کو بڑوں کی محفل میں بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی۔ ہم بچے گلی میں کھیلتے یا پھر بچوں کے رسالے پڑھتے۔ ہمارے محلے میں ایک لڑکی مجھے اچھی نہیں لگتی تھی مگر جب پتا چلا کہ اس کے پاس اشتیاق احمد کے بہت سے ناول ہیں تو میں فقیروں کی طرح اس کے گھر کے چکر لگاتی کہ مزید ایک ناول پڑھنے کو مل جائے گا۔

لوگوں میں محبت اور خلوص تھا۔ ہر کوئی ایک دوسرے کا شناسا تھا۔ ہمیں یہ علم ہوتا تھا کہ یہ بچہ ہمارے محلے کا ہے یا نہیں۔ آج تو یہ حالات ہیں کہ ہمیں یہی پتا نہیں کہ ہمارے ساتھ والے گھر میں کون رہ رہا ہے؟ مادہ پرستی نے ہمارے دل و ذہن پر پنجے گاڑ لیے ہیں۔ ہمارے بچوں کا بچپن موبائل، کمپیوٹر اور بے تحاشا مشاغل نے چھین لیا ہے۔ وہ بے فکری وہ لاابالی پن جس میں ہم نے اپنا بچپن گزارا، ہمارے بچے اس سے ناآشنا ہیں۔ ہم چھوٹی چھوٹی چیزوں کی خوشی میں سارا دن سرشار رہتے تھے۔ عید آتی تو ساری رات صبح پہننے والے کپڑے اور جوتیاں اٹھا کر دیکھتے اور خوش ہوتے۔ ہمارے بچے ایسی چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے محروم ہیں۔ جو کھیل ہم کھیلتے تھے: برف پانی، کوکلا چھپاکی، نیلی پری، اونچ نیچ وغیرہ۔ ہمارے بچے جانتے ہی نہیں کہ یہ کیا ہیں۔

چوتھی اولاد

ڈاکٹر سیدہ سلمیٰ حسین

تنہائی اور بے رخی کا نشانہ بنی ایک بوڑھی کی دلدوز داستان جو اپنا تابناک ماضی کبھی نہ بھول پائی

۱۹۵۰ء کے اوائل کی بات ہے کہ روزہ (ROSA) اور ولیم شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ وہ فروری کی ایک سرد شام تھی جب ولیم کو آسٹریلیا کے شہر سڈنی میں ملازمت کی پیشکش ہوئی۔ شادی کو کچھ ہی دن گزرے تھے۔ ولیم نے یہ خبر بہت خوشی سے اپنی نو بیاہتا کو سنائی۔

"تم میرے لیے بہت خوش قسمت ثابت ہوئی ہو۔ اب میری تمام پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔ مجھے بہترین ملازمت کی پیشکش ہوئی ہے۔"

وہ دونوں اٹلی کے شہر روم کے رہنے والے تھے۔ والدین، رشتہ دار سبھی لوگ روم کے آس پاس مقیم تھے۔ سبھی لوگ عیسائیت کے پیروکار تھے۔ قدیم مسیحی مذہب کی جڑیں وہاں کافی مضبوط تھیں۔ خاندان والے مل جل کر رہتے تھے۔ بزرگ مضبوط بنیاد کی طرح پورے خاندان کو جوڑ کر رکھتے۔ آپس میں ملنا جلنا تھا۔ کھانا پینا، ہنسنا، خوشی، غمی سب کچھ سانجھا تھا۔ آنٹی ایلس روزہ کی بیوہ خالہ تھی۔ سگی ماں کی طرح عزت ملتی تھی۔

روزہ اپنے خاندان میں بڑی خوش تھی کہ اس کی زندگی میں ولیم آ گیا۔ وہ ایک خوش شکل، خوش پوش، پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ اُن کے درمیان دوستی اور اعتماد کا رشتہ اتنا بڑھا کہ روزہ نے اُسے اپنے تمام خاندان والوں سے ملوایا۔ ولیم کی اکلوتی بہن سڈنی میں سکونت پزیر تھی لہٰذا وہ اُن کی شادی میں شریک نہ ہو سکی۔ البتہ ولیم کے دوست احباب اور دور کے رشتہ دار شادی میں ہنسی خوشی شریک ہوئے۔ اب روزہ اُداس ہو گئی کہ سب کچھ چھوڑ کر اتنی دور جانا پڑے گا لیکن اچھے مستقبل کی خاطر اس نے یہ گوارا کر لیا۔ پھر جوانی میں نئی جگہ دیکھنے کی لگن بھی تو ہوتی ہے۔

دونوں میاں بیوی باہر جانے کی تیاری کرنے لگے۔ کچھ سامان وہ ساتھ لے جا رہے تھے۔ سامان میں ایک چھوٹی ڈریسنگ ٹیبل بھی تھی جو آنٹی ایلس نے اُسے شادی کے موقع پر تحفتاً دی تھی۔ سب ہی اُداس تھے کہ اب جانے کب ملاقات ہو مگر ان دونوں کی خوشی میں سب خوش بھی تھے۔ وہ بس کے ذریعے روم سے نیپلز روانہ ہوئے تو آنکھوں میں آنسو تھے۔ انھیں نیپلز سے بحری جہاز کی تقریباً دو ماہ کی مسافت کے بعد آسٹریلیا کے ساحل سڈنی پہنچنا تھا۔

روزہ اور ولیم نے یہ سفر کسی نہ کسی طرح طے کیا۔ جب وہ سڈنی پہنچے تو دفتر کی طرف سے انھیں ایک عارضی رہائش دی گئی۔ سڈنی بہت خوبصورت شہر تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ آبادی نہ ہونے کے برابر تھی۔ پھر بھی آسٹریلیا کامن ویلتھ کے زیر اثر تھا اس لیے وہاں بہت تیزی سے ترقیاتی کام ہو رہے تھے۔ دوسرے ممالک کے لوگ اپنی روزی کے چکر میں وہاں منتقل ہو رہے تھے، اسی لیے ایک ملٹی کلچرل (Multicultural) سوسائٹی تشکیل پا رہی تھی۔

روزہ کا دل بڑی مشکل سے سڈنی میں لگا لیکن وقت رفتار بڑھاتا ہے تو پتا ہی نہیں چلتا۔ جب یکے بعد دیگرے اُس کے تین بچے ہوئے تو وقت اتنی تیزی سے گزرا کہ روزہ کو معلوم ہی نہ ہوا۔

وہ سارا دن بچوں کی دیکھ بھال، گھر کے کام کاج کرنے اور ولیم کی واپسی کے انتظار میں گزار دیتی۔ شوہر کی بہن وہیں رہتی تھی۔ کبھی کبھی اس سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ ولیم کے توسط سے دو بہن بھائی بھی حصول روزگار کی خاطر آسٹریلیا منتقل ہو گئے۔ اب اٹلی جانے کا سوال ہی نہیں تھا مگر یاد تو آتا۔

دیکھتے ہی دیکھتے پینتیس سال گزر گئے۔ بچوں کی شادیاں ہو گئیں۔ ولیم اور وہ دونوں ہی بیمار رہنے لگے۔ اُن کا ملنا جلنا آپس میں اور وہاں کے رہنے والوں سے تھا لیکن وہ اپنائیت جو اپنے وطن میں ہوتی ہے، وہ عنقا تھی۔ ولیم اور روزہ الگ گھر میں رہتے۔ ایک دن ولیم کے سینے میں شدید درد اُٹھا اور وہ زرد پتے کی طرح کانپنے لگا۔ جب تک ایمبولینس آئی اس نے جان دے دی۔ شوہر کی موت کے بعد روزہ اکیلی رہ گئی۔ بچے آئے لیکن جنازے کی مصروفیات کے بعد اپنی نوکریوں کا بہانہ کر واپس چلے گئے۔

روزہ کے لیے بہت مشکل وقت تھا، اُس نے سوچا کیوں نہ وہ کوئی نوکری کر لے تاکہ مصروف ہو جائے۔ جب تک ولیم زندہ تھا، اس نے کبھی اس طرف دھیان نہ دیا تھا۔ ایک تو ولیم کو یہ بات پسند نہ تھی دوسرے روزہ بیمار بھی رہنے لگی تھی۔ بلڈ پریشر اور شوگر کے امراض نے اُسے کمزور کر دیا تھا اس لیے گاڑی ڈرائیو کرنا بھی مشکل ہو گیا۔ وہ زیادہ سے زیادہ اسپتال جاتی یا گھریلو سامان کی خریداری کے لیے اسٹور تک چلی جاتی۔

اُس کی بڑی بیٹی الزبتھ کبھی کبھی چکر لگا لیتی۔ اُس نے دیکھا کہ اتنا بڑا گھر سنبھالنا ماں کے لیے مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ اُس نے اُسے چھوٹے گھر کا مشورہ دیا۔ اگلے دن سے چھوٹا گھر ڈھونڈنے نکلی۔ پہلے گھر کا سامان بیچنے کے لیے درخواست میونسپل کمیٹی میں جمع کروا دی اور پھر روزہ سے پوچھے بغیر ہی بہت سی چیزوں کا سودا کر دیا۔ جب روزہ کو پتا چلا تو اُسے بہت رنج پہنچا اور اُس نے نئے گھر میں جانے سے انکار کر دیا۔

الزبتھ بولی "آپ ویسے بھی اکیلے گھر میں نہیں رہ سکتیں کیوں نہ میں آپ کو نرسنگ ہوم میں داخل کروا دوں۔ ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ وہاں آپ کا خیال رکھنے کے لیے عملہ ہو گا۔"

روزہ کو اپنی جوانی کا زمانہ یاد آیا جب تمام خاندان والے اٹلی میں مل جل کر اکٹھے رہا کرتے تھے۔ بزرگ گھر میں سایہ دار درخت کی طرح سمجھے جاتے۔ روزہ اور ولیم نے اپنی اولاد بہت پیار سے پالی تھی مگر جب اس کا بڑھاپا آیا تو کوئی بھی اُسے ساتھ رکھنے کے لیے تیار نہ تھا۔ شاید نئے زمانے میں ماں باپ کو ساتھ رکھنا عیب تھا یا نرسنگ ہوم

میں رکھنا فیشن بن چکا تھا۔

روزہ نے گھر کے بچے کھچے سامان کا جائزہ لیا۔ سامان سے اس کی سہانی یادیں وابستہ تھیں۔ باورچی خانہ جو اُس کے محبوب شوہر نے بڑی محبت سے بنوا کر دیا تھا۔ ٹی وی لاؤنج جہاں بیٹھ کر وہ اپنے شوہر اور بچوں کے سوئٹر اور جرابیں بُنا کرتی تھی۔ باغیچہ جہاں انار اور سیب کے درخت بڑی محنت کے بعد پھل دے رہے تھے۔ اس نے سبھی پر حسرت کی نظر ڈالی۔ واقعی شوہر کی زندگی میں عورت کو جو سکون نصیب ہوتا ہے وہ دوبارہ نہیں ملتا۔ نجانے اولاد کی تربیت میں کیا کمی رہ گئی تھی۔

شوہر کے بینک بیلنس اور سوشل سروسز کی وجہ سے اُسے وظیفہ ملتا تھا لہٰذا معاشی مسائل نہیں تھے بس تنہائی تھی۔ آخر وہ وقت بھی آہی گیا جب اس کو نرسنگ ہوم میں کمرہ الاٹ کر دیا گیا۔ وہ چند ضروری چیزیں لے جا سکتی تھی۔ اس نے اپنے پیارے گھر کی تمام چیزیں آہستہ آہستہ بکتے دیکھیں اور ہاتھ ملتی رہ گئی۔ جب ڈریسنگ ٹیبل کی باری آئی تو وہ رو پڑی اور الزبتھ سے درخواست کی کہ یہ میز اس کی پیاری خالہ نے اُسے دی تھی وہ اسے نرسنگ ہوم لے جانے کی اجازت حاصل کر لے۔

تھوڑی بحث کے بعد الزبتھ راضی ہو گئی اور اُس نے درخواست جمع کروا دی جو روزہ سے تھوڑی پوچھ گچھ کے بعد منظور کر لی گئی۔ الزبیتھ نے نرسنگ ہوم میں اپنی ماں کو منتقل کیا اور واپس اپنے شہر چلی گئی۔ ایک ماہ نہ گزرا تھا کہ روزہ کے سر میں شدید درد اٹھا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ نرسنگ ہوم والوں نے بچوں کو اطلاع دی۔ جب سب بچے پہنچ گئے تو ضروری انتظامات کے بعد روزہ کو دفنا دیا گیا۔ اُس کا بقایا سامان بچوں کو ملا جس میں ڈریسنگ ٹیبل بھی شامل تھی۔

الزبتھ نے اس میز کی طرف حقارت سے دیکھا اور بولی ”پرانے زمانے کی اس میز کا ہم نے کیا کرنا ہے۔“

نرسنگ ہوم کی انچارج نے کہا ”آپ دیکھ لیں اس میں کوئی قیمتی چیز تو نہیں۔“

جب الزبتھ نے پہلی دراز کھولی تو اُس میں تینوں بہن بھائیوں کے بچپن کی تصاویر نکل آئیں۔ اس دراز میں اسی کے بچپن کی ایک گڑیا تھی جس کا فراک الزبتھ نے خود سیا تھا۔ باپ کا ایک سگار بھی نکلا۔

دوسری دراز کھولی تو اس میں چار عدد خط رکھے تھے۔ ہر بچے کے نام ایک خط تھا اور ایک پیکٹ۔ تین عدد خط بچوں اور ایک عدد خط نرسنگ ہوم کی انچارج کے نام تھا۔

الزبتھ کے خط میں ماں نے اُس سے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا اور اپنی ہیرے کی انگوٹھی اُسے بطور تحفہ دی تھی۔ باقی دونوں بچوں کے خطوط میں انھیں وصیت کی تھی کہ وہ اپنے بچوں سے ایسے ہی محبت کریں جیسے ان کے ماں باپ نے اُن سے کی تھی۔ ان دونوں کے لیے اُس نے پرائز بانڈ رکھے تھے۔

نرسنگ ہوم کی انچارج کے نام خط میں روزہ نے لکھا تھا۔

”آپ نے میرا بہت خیال رکھا اس کے لیے میں آپ کی شکر گزار ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ آپ میرا سامان میرے بچوں کے حوالے کر دیں گی۔ یہ اس میز کو نہیں لے کر جائیں گے۔ یہ میز مجھے میرے وطن اٹلی کی یاد دلاتی ہے۔ یہ مجھے اپنی اولاد کی طرح پیاری ہے۔ اس میز نے ہمیشہ میرے رازوں کی حفاظت کی ہے اور میری تنہائی میں میرا ساتھ دیا۔ یہ میرا میکہ، سسرال، خاندان، یادیں، اولاد سب کچھ ہے۔ اُمید ہے آپ میری بات سمجھ گئی ہیں۔ کیا آپ اس میز کو جو میری چوتھی اولاد ہے میری خاطر قبول کریں گی؟

اگر ہاں! تو بہت شکریہ

اور اگر نہیں! تو اُسے بھی زمین میں میری طرح دفنا دیں ورنہ میرے بچے اس کو ضائع کر دیں گے۔ میں اس کی یہ بے وقعتی برداشت نہیں کر سکتی۔

آپ کی دوست روزہ ولیم

رومنی فرنانڈس/انجم فاروق ساحلی

انوکھا جھانسا

قانون کی نگاہوں میں دھول جھونکنے والے کائیاں فنکار کا دلچسپ ماجرا

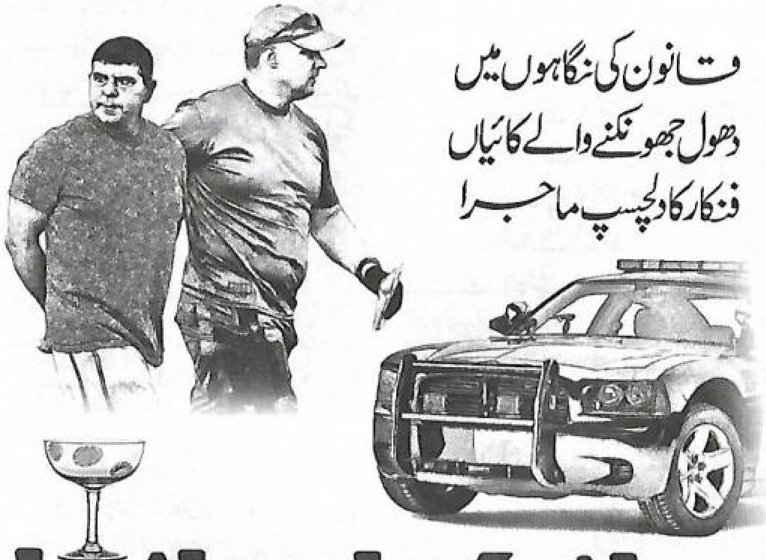

اسمتھ گولڈن ایگل بار میں مشروب سے شغل کر رہا تھا کہ ...ک تیز آنکھوں والا اجنبی آکر اس کے قریب کھڑا ہو گیا۔ ...ی خاصا قد آور تھا۔ جسم پر سرمئی رنگ کا سوٹ تھا۔ اسمتھ ...نے اندازہ لگایا، اس کی عمر ساٹھ سال کے قریب ہو گی۔ ...اسمتھ بار کے اوپر لگے آئینے میں اُسے دیکھ رہا تھا۔ نفیس ...راش کا سوٹ، نفاست سے ترشی ہوئی مونچھیں، چمکدار سیاہ ...ں۔ اُسے بھی اپنی مردانہ وجاہت اور خوش پوشی پر بڑا ناز تھا۔ ...ی لیے بھی یقین تھا کہ ایک گھنٹے بعد جب وہ سوسن سے ملنے ...یشن جائے گا تو وہ اسے دیکھتے ہی دل و جان سے فدا ہو جائے گی۔

لیکن اب اس اجنبی نے آکر فخر سے بھرے خیالوں میں ہلچل مچا دی تھی۔ اجنبی کی بائیں بغل کے پاس خاصا نمایاں ابھار تھا۔ گویا اُس نے کندھے کا ہولسٹر پہن رکھا تھا اور اس میں یقیناً ایک پستول بھی موجود تھا۔ اُس کی تیز چمکدار آنکھیں بڑی مہارت سے بار میں موجود ہر شخص کا جائزہ لے رہی تھیں۔

''کسی کی تلاش میں ہو؟''

اجنبی کی آنکھیں خود پہ مرکوز پا کر اُس نے قدرے بے چینی سے پوچھا۔

''ہاں میں کسی کی تلاش میں ہوں۔'' اجنبی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں ایک سراغ رساں ہوں۔ میں چہرے کو پڑھتا ہوں اور پھر انھیں کبھی نہیں بھولتا''۔

''پھر تو تمہیں خاصے دلچسپ تجربات ہوئے ہوں گے۔'' اسمتھ کے لہجے میں ہلکا سا تجسّس تھا۔ ''اُن کے بارے میں تم کسی سے باتیں کرنا پسند نہیں کرتے ہوگے۔''

لمبا تڑنگا اجنبی آہستگی سے بولا ''میں اُن کے بارے میں باتیں کرنا بہت پسند کرتا ہوں۔ اس وقت بھی ایک دلچسپ کیس کے سلسلے میں یہاں آیا ہوں۔ دراصل یہ ایک نو سال پرانا کیس ہے۔ کیا تم کچھ سننا پسند کرو گے؟''

اسمتھ ہچکچایا۔ اُس کا ماضی بے حد صاف ستھرا تھا۔ اس لیے اُسے قانون سے کوئی خوف یا خطرہ لاحق نہیں تھا۔ مگر ایک گھنٹے کے اندر اندر اُسے ضروری کام سے فارغ ہو کر سوسن سے ملنے ریلوے اسٹیشن جانا تھا۔

''آؤ کسی میز پر بیٹھ کر گفتگو کریں۔'' اجنبی نے پیش کش کی۔ ''کہانی سن کر تمہیں لطف آ جائے گا مگر پہلے میں تمہارے لیے کچھ آرڈر دے دوں۔'' اس نے بارٹینڈر کی طرف مڑ کر کہا۔ ''میرے دوست کے لیے ایک گلاس بنا لاؤ۔''

وہ پھر اسمتھ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''میں عام طور پر کسی میز میں بیٹھ کر ہی پینا پسند کرتا ہوں۔'' اسمتھ نفاست سے انگلیوں میں گلاس تھامے قریبی میز پر بیٹھ گیا۔ سراغ رساں نے بھی ایک کرسی سنبھال لی اور داستان شروع کر دی۔ اسمتھ نے گلاس ہونٹوں سے نہیں لگایا، نہ جانے کیوں وہ اس اجنبی سے خوف محسوس کر رہا تھا؟

☆☆☆

''جوزف! بے حد مکار آدمی تھا۔ سراغ رساں نے اپنی داستان شروع کی۔ ''بالکل لومڑی کی طرح چالاک۔ وہ اپنے میڈیکل اسٹور میں کاؤنٹر کے پیچھے ایک اُونچے اسٹول پر بیٹھا ایک نسخہ تیار کر رہا تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ رقص کر رہی تھی کیونکہ یہ نسخہ اُس کا اپنا بنایا ہوا تھا۔ . . اور یہ موت کا نسخہ تھا۔ اُس نے دو کیپسول تیار کیے اور ایک بھری شیشی میں ڈال کر پھر سربمہر کر دی۔ اب کسی طرح بھی یہ پتہ نہیں چل سکتا تھا کہ اس شیشی میں کسی قسم کی گڑبڑ کی گئی ہے۔ اسٹور کی گھنٹی بجنے لگی۔ لیکن اس کا مطلب تھا کہ کوئی گاہک آیا ہے۔ وہ انکل جون تھا۔

''کیا میرے وٹامن کیپسول تیار ہیں''؟ اس نے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

جوزف نے شیشی اٹھا کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دی۔ انکل پسندیدہ نگاہوں سے شیشی کو دیکھتا ہوا سر ہلانے لگا۔ اس شیشی میں وٹامن کیپسول تھے۔ مگر ان دو کیپسولوں میں جنہیں جوزف نے چند منٹ پہلے ہی شیشی میں سب سے اُوپر رکھا تھا اور جو اُس کے اندازے کے مطابق انکل جون کو سب سے پہلے لینے تھے، سائنائیڈ زہر بھرا ہوا تھا۔

''نہیں پیسوں کی پروا نہ کریں۔'' جوزف بولا۔ ''یہ میری طرف سے قبول کرلیں۔'' وہ گہری نظروں سے جھکے شانوں والے بوڑھے کا جائزہ لیتے سوچ رہا تھا کہ کہیں اُسے کسی قسم کا شک تو نہیں ہو گیا۔ انکل جون اُس کے سگے چچا نہیں تھے۔ چھ ماہ قبل اس نے اخبار میں ایک اشتہار دیا تھا۔ وہ ان کی شناسائی کا سبب بنا۔ اشتہار یہ تھا:

''پینتیس سالہ مہذب اور خوشحال مرد، ایک پختہ ذہن اور حسین خاتون سے شادی کا خواہش مند ہے۔ خاتون کو پُرمسّرت زندگی گزارنے کی ضمانت دی جاتی ہے۔ رجوع کریں۔''

جوزف کو اشتہار کے جواب میں سو کے قریب خطوط ملے۔ اُس نے انتہائی توجہ سے ان کا مطالعہ کیا پھر کئی دنوں کی تفتیش کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ روزی اُس کے لیے بہترین بیوی ثابت ہو گی۔ ایک میڈیکل اسٹور کی مالکہ ہونے کے علاوہ روزی کے اکاؤنٹ میں پچاس ہزار ڈالر کی خطیر رقم موجود تھی۔

شادی کے بعد ہی اُسے پتہ چلا کہ یہ پچاس ہزار ڈالر روزی کے چچا انکل جون کی ملکیت تھے اور روزی اُس کی زندگی میں اس رقم کی مالک ہرگز نہیں بن سکتی۔ شروع میں تو جوزف اس تصور ہی سے خوش ہوتا کہ انکل جون دل کا مریض ہے۔ وہ کسی بھی لمحے اس جہان فانی سے کوچ کر سکتا ہے اور پھر پچاس ہزار ڈالر کی خطیر رقم اس کی جیب میں آ جائے گی۔ مگر بعد میں انکل جون بتدریج صحت مند اور رعب ہوتا چلا گیا۔ ایک خطرے کی بات یہ بھی سامنے آئی کہ وہ جوزف کی پچھلی زندگی کے بارے میں مشکوک ہوتا گیا۔ وہ سوچتا کہ جوزف کی پہلی دو بیویاں کس طرح شادی کے تھوڑے ہی عرصے بعد مر گئی تھیں اور اُس کے لیے خطیر رقم چھوڑ گئی تھیں۔

جوزف انکل جون کو میڈیکل اسٹور سے باہر جاتے دیکھتا رہا۔ اُسے توقع تھی کہ وہ انکل جون کو آخری مرتبہ دیکھ رہا ہے۔ جوزف کو علم تھا کہ پوٹاشیم سائنائیڈ مؤثر ترین زہر ہے۔ بس دو خامیوں کی وجہ سے اُس کے پہچان جانے کا خطرہ تھا۔ ایک تو یہ کہ سائنائیڈ بے حد سریع الاثر ہوتا ہے۔ اس سے فوری طور پر موت واقع ہو سکتی ہے۔ دوسری خامی مخصوص قسم کی بُو ہے۔

یہ سوچتے ہوئے وہ دل ہی دل میں ہنس پڑا۔ اس نے دونوں خامیاں بڑی مہارت سے دُور کرنے کی کوشش کی تھی۔ اُس نے سائنائیڈ کو کیرائن مادے میں ملا کر کیپسول بھرے تھے۔ کیرائن حیرت انگیز چیز تھی۔ معدے کی رطوبتیں اُس پر قطعی اثر انداز نہیں ہوتی تھیں۔ یہ سفوف آنتوں میں پہنچ کر ہی ہضم ہو سکتا تھا جس میں کم از کم دو گھنٹے لگتے۔ کیرائن آنتوں میں حل ہو کر سائنائیڈ کو آزاد کرتا اور انکل جون ہمیشہ کے لیے قبر میں جا سوتا۔

جوزف دل ہی دل میں حساب لگانے لگا۔ آج بدھ کی رات تھی۔ سینما ہاؤس میں ڈریکولا کی فلم لگی ہوئی تھی جسے انکل جون کبھی نہیں چھوڑتا تھا۔ یقیناً رات کے کھانے سے فارغ ہو کر وہ فلم دیکھنے جائے گا۔ فلم کے اختتام پر سینما کا چوکیدار اُسے باہر بھیجنے آتا، تو اُسے مردہ پاتا۔ لوگ یہی سمجھتے کہ فلم کے دوران دل کے دورے نے اس کی جان لے لی۔

اچانک باہر سے دردناک چیخ سنائی دی اور جوزف اُچھل پڑا۔ ایک لمحے کے لیے اس نے متوحش نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا پھر باہر دوڑ پڑا۔ غلے کی دُکان کے سامنے لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ جوزف نے اسٹور کھلا ہی چھوڑا اور ہجوم کی طرف بڑھ گیا۔ ہجوم کے بیچ میں انکل جون پڑا ہوا تھا۔ جوزف نے پہلی نظر میں بھانپ لیا کہ اُس کا دم نکل چکا۔

قصبے کا مارشل ویب کین جوزف کو دیکھتے ہی لپک کر اس کے قریب آ گیا۔ اس نے جوزف کے شانے پر ہاتھ رکھا اور ہمدردانہ لہجے میں بولا۔ ''بہت بُرا ہوا جوزف، تمہارے انکل جون چل بسے۔''

''اُن کا دل. . .'' جوزف کے حلق سے گھٹی گھٹی آواز نکلی۔

''دل کی وجہ سے یا شاید کسی اور وجہ سے''۔ مارشل نے تیز نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ لگتا تھا جیسے وہ اُس کے ذہن کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے۔

''ممکن ہے اُس نے کوئی ایسی چیز کھائی جس سے موت اس قدر جلد واقع ہو گئی۔'' جوزف نے یہ کہتے ہوئے

شکی مزاج مارشل کی طرف سے منہ پھیر کر تھوک نگلا۔ اُسے یقین تھا کہ انکل جون کا دل ہی جواب دے گیا اور اس کی فوری موت کا سبب بنا۔ اس کے علاوہ کوئی اور بات نہیں ہو سکتی۔ اگر اس نے سائنائیڈ والا کیپسول نگلا ہوتا، تو دو گھنٹے بعد ہی مرتا۔

اچانک اس کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اُس سے بڑی حماقت سرزد ہو چکی تھی۔ کاش وہ کچھ دیر اور صبر کر لیتا اور فطرت کو اپنا کام کرنے کی مہلت دیتا مگر اب تو وہ بڑے خطرے میں پڑ چکا تھا۔ اُسے ہر قیمت پر پولیس والوں سے پہلے انکل جون کی جیب سے کیپسول کی شیشی نکالنا تھی۔ ورنہ وہ بڑی مشکل میں پڑ جاتا۔

انکل جون کی لاش اٹھائی جانے لگی تو جوزف کو اس کا موقع بھی مل گیا۔ اُس نے لاش کو سہارا دیتے وقت آہستگی سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور کیپسول کی شیشی نکال کر مٹھی میں چھپا لی۔ اپنے اسٹور میں آ کر وہ شیشی جلتے چولہے میں ڈالنے ہی والا تھا کہ اطلاعی گھنٹی بج اُٹھی۔ وہ چولہے سے دور ہٹ گیا۔ وہ مارشل کین تھا جو اُس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ ”میں نے تمھیں دیکھ لیا تھا۔“ اُس نے ایک انگلی جوزف کی طرف اُٹھا کر ملامت آمیز لہجے میں کہا۔ ”میں نے تمھیں دیکھ لیا تھا کہ تم نے جون کی جیب سے کوئی چیز نکالی ہے۔ وہ کیا چیز تھی“؟

جوزف سکڑا ہوا اپنے کاؤنٹر کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔ اُس کا جسم کانپ رہا تھا۔ لباس کے نیچے سرد پسینہ بہ رہا تھا۔ اُسے جلد از جلد اس منحوس شیشی سے چھٹکارا حاصل کرنا تھا۔ ترچھی نظروں سے اُس نے کاؤنٹر اور دیوار کے بیچ میں آدھ انچ کا خلا دیکھا اور آہستگی سے شیشی اس میں ڈال دی۔ اُس کی حرکات ایسی تھیں جیسے وہ کاؤنٹر صاف کر رہا ہو۔ اُسے یقین تھا کہ مارشل کین اُسے شیشی گراتے نہیں دیکھ سکا۔ پھر اُس نے سنبھل کر کہا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا تم کس چیز کا تذکرہ کر رہے ہو۔“

”تم اچھی طرح سمجھ رہے ہو۔“ مارشل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”جون کی موت کے بعد تمھیں پچاس ہزار ڈالر ملنے والے ہیں۔“ اس نے اسٹور کی طرف ہاتھ لہرایا۔ ”اور یہ اسٹور بھی اب تمھاری ملکیت ہے۔ مگر میں لاش کا پوسٹ مارٹم کرا کر ثابت کر دوں گا کہ تم نے اُسے زہر دیا۔“

اس نے پھر جوزف کے لباس کی تلاشی لی مگر کچھ ہوتا تو نکلتا۔ وہ پیر پٹختا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کے قریب رکھے شوکیس پر ایک خالی بوتل رکھی ہوئی تھی۔ وہ اُسے اٹھا کر یوں دیکھنے لگا جیسے بوڑھے جون کو اس میں سے زہر دیا گیا ہو۔

جوزف کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ خوف اُس کے رگ وپے میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔ اُسے معلوم تھا جب پولیس نے لاش کا پوسٹ مارٹم کیا تو زہر کے اثرات مل جائیں گے۔ انکل جون کچھ عرصے سے کسی بیماری کی وجہ سے آرسینک کی خوراکیں لے رہا تھا۔ وہ یہ خوراک کسی ڈاکٹر کے مشورے کے بغیر اپنی مرضی سے لے رہا تھا۔ چونکہ اُسے آرسینک لیے خاصا عرصہ گزر گیا تھا، اسی اس لیے اس نے خوراک کی مقدار بڑھا دی۔ مگر جسم عادی ہو جانے کی وجہ سے زہر نے کوئی خراب اثر نہیں دکھایا۔

جوزف کی پسینے میں بھیگی قمیص کمر سے چپک گئی۔ اگر وہ اُسے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیتے تو جو وہ کرنا چاہتا تھا، نہ کر پاتا۔ یہ اُس کے خیال میں بڑی ناانصافی تھی۔ اُسے اپنی قسمت پر رونا آ گیا۔ شاید لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں، اس نے سوچا کہ آدمی جرم کر کے سزا سے کبھی نہیں بچ سکتا۔ نہیں... نہیں وہ دو بار پہلے بھی چھوٹے موٹے جرائم کر کے سزا سے

صاف بچ نکلا تھا۔ شاید اُسے اپنے جرائم کی سزا مل رہی ہے۔ مگر وہ ایسا نہیں ہونے دے گا۔ اُس کے جبڑے بھنچ گئے۔ اُس نے سر اٹھا لیا۔ ”وہ پوسٹ مارٹم ہرگز نہیں ہونے دے گا۔“ جوزف نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا۔ پھر ذرا سی دیر بعد وہ کارولز کے دفتر میں داخل ہوا تو اپنے لیے لائحہ عمل تیار کر چکا تھا۔

پستہ قد کارولز اُسے دیکھتے ہی اُٹھ کھڑا ہوا پھر اس کی بات سن کر حیران رہ گیا ”نہیں۔“ اس نے کہا۔ ”یہاں کوئی پوسٹ مارٹم نہیں ہو رہا۔ کم از کم مجھے تو اس کی اطلاع نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ مارشل کین بہت جوش میں ہے مگر انکل جون کی لاش دیکھ کر پہلی نظر میں ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ قدرتی موت مرا۔“

لمبے تڑنگے سرمئی سوٹ والے سراغ رساں نے مسکرا کر اپنے گلاس سے آخری گھونٹ بھرا اور گلاس میز پر رکھ دیا۔ اسمتھ کا گلاس جوں کا توں بھرا ہوا تھا۔ ”تو یہ ہے وہ داستان۔ جوزف کو ورثے میں پچاس ہزار ڈالر مل گئے پھر اس نے میڈیکل اسٹور بھی بیچ دیا اور کسی شہر کی طرف نکل گیا۔ اس کی بیوی کے رشتے داروں نے نجی طور پر میری خدمات حاصل کی تھیں۔ انکل جون کی موت کے چند ہی روز بعد جوزف کی بیوی سیڑھیوں سے گر کر مر گئی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اتفاقی طور پر نہیں گری بلکہ اُسے دھکا دیا گیا تھا۔ مگر ہم جوزف کے خلاف کبھی یہ بات ثابت نہیں کر سکے۔“ اس نے ایک طویل سانس لی۔

”یقیناً اس سے پہلے ہمیں میڈیکل اسٹور سے جوزف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ مل گیا تھا جس میں اُس نے سائنائیڈ کے ساتھ کیپرائن ملا کر کیپسول تیار کیے تھے اور انھیں انکل جون کی وٹامن والی شیشی میں رکھ دیا تھا۔ بعد میں ہمیں کاؤنٹر اور دیوار کے بیچ خلا میں سے وہ شیشی بھی مل گئی۔“

اچانک اُس نے حیرت آمیز نگاہوں سے اسمتھ کی طرف دیکھا اور پوچھا ”تم پی کیوں نہیں رہے“؟ اسمتھ نے نفی میں سر ہلایا تو سراغ رساں نے اُس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور انگلی سے اُس کے کنارے سہلانے لگا۔

”تم نے کہا ہے کہ یہ نو سال پرانی داستان ہے۔“ اسمتھ نے پہلی بار زبان کھولی۔ ”تو کیا تم اب بھی جوزف کو پہچان سکتے ہو“؟

سراغ رساں دھیرے سے مسکرایا اور بولا ”یقین کرو، میں کسی چہرے کو ایک بار دیکھنے کے بعد قیامت تک نہیں بھول سکتا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ جوزف نے کیسے اپنا حلیہ بدلا ہو گا۔ بال رنگ لیے، چہرہ پھُلا لیا ہو گا یا کچھ اور ہو گا مگر انگلیوں کے نشانات کوئی نہیں بدل سکتا۔ ہمارے پاس کیپسول کی شیشی پر اُس کی انگلیوں کے واضح نشانات موجود ہیں۔“

وہ اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔ ”ایک منٹ کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔ مجھے ایک فون کرنا ہے، ابھی آیا۔“ اس نے رومال اٹھایا اور باہر نکل گیا۔

اسمتھ کے ہونٹ خشک ہو گئے تھے۔ اُس نے زبان پھیر کر انھیں تر کیا۔ اُس کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ رنگ دار بال، پھولا ہوا منہ، انگلیوں کے نشانات، اُس نے میز پر رکھے اپنے گلاس پر نگاہ ڈالی۔ یقیناً گلاس پر بھی اس کی انگلیوں کے نشانات موجود تھے۔ اُسے یاد آیا، سراغ رساں نے اس کے ہاتھ سے بڑی احتیاط سے گلاس لیا اور پھر اپنا رومال اٹھایا تھا۔ ”اوہ“ حقیقت کا ادراک ہوتے ہی اُس کی آنکھیں خوف سے پھٹ گئیں۔ شاید وہ پولیس کو فون کرنے گیا ہے۔ اُس نے سوچا پھر تیزی سے حرکت میں آ گیا۔

شہر میں گھومتے ہوئے اُس نے تین بار ٹیکسیاں بدلیں۔

اپنے گھر میں وہ صرف اتنی دیر رکا کہ کچھ رقم اور ایک ہفتے پرانا اخبار لے سکے جس میں اُس نے پینتیس سالہ نوجوان کی شادی کا اشتہار دیا تھا۔ اخبار کے ساتھ وہ جواب میں آنے والا سوسن نامی لڑکی کا خط لینا نہیں بھولا تھا۔ اس کا میڈیکل اسٹور نیویارک شہر میں تھا جہاں انسان بڑی آسانی سے پولیس کو دھوکا دے کر کہیں بھی گم ہو سکتا ہے۔

اُس نے عظیم ٹرمینل کے گیٹ نمبر گیارہ کی طرف دیکھا۔ اس وقت سوسن کو پہنچ جانا چاہیے تھا۔ اُسے اُمید تھی کہ وہ اُسے کسی بہانے سے راضی کر لے گا پھر اُسے بھی ساتھ لے کر یہاں سے نکل جاتا۔ اتنا شاندار موقع وہ کسی بھی قیمت پر گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ سوسن تمام بیویوں میں زیادہ مال دار اور منافع بخش ثابت ہو سکتی تھی۔

وہ گیٹ نمبر گیارہ کی طرف بڑھا۔ پھر اُس کے قدم جیسے زمین نے تھام لیے۔ سُرمئی سوٹ والا لمبا تڑنگا سراغ رساں گیٹ سے نکل رہا تھا۔ اسمتھ فوراً سنبھل گیا اور ہجوم کی طرف دوڑا۔ مگر سراغ رساں گولی کی طرح اُس کے تعاقب میں آ رہا تھا۔ اسمتھ نے محسوس کیا جیسے کسی نے عقب سے اُس کا کوٹ پکڑ کر کھینچا ہو۔ وہ تیزی سے گھوما اور پوری قوت سے سراغ رساں کے چہرے پر گھونسا مارا مگر سراغ رساں ہوشیار تھا۔ اُس نے جھکائی دے کر خود کو بچا لیا اور اسمتھ کے پیٹ میں لات ماری۔ اسمتھ کو یوں محسوس ہوا جیسے اُس کا ایک پیر قبر میں اور دوسرا کیلے کے چھلکے پر رکھا ہوا ہو۔

جب وہ بمشکل فرش سے اٹھا تو خود کو پولیس کے جوانوں کے نرغے میں دیکھ کر اُس کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ پھر اُس کی نگاہ سراغ رساں کے چہرے پر پڑی جو بڑے دلکش انداز میں مسکرا رہا تھا۔ ’’احمق کی دُم‘‘ وہ بولا۔ ’’تمہیں ہرگز فرار نہیں ہونا چاہیے تھا۔ تم اگر بار میں ہی بیٹھے رہتے تو میں کبھی تمہیں پکڑ نہ پاتا۔ تم نے شاندار میک اپ کر رکھا ہے۔ تمہارا چہرہ اور انداز بدلے ہوئے ہیں۔ انگلیوں کے نشانات کا تو میں نے محض ڈھونگ رچایا تھا۔ اُس میں کوئی حقیقت نہیں تھی۔ بس ایک جھانسا تھا جس میں تم کسی بچے کی طرح پھنس گئے۔ میں صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔ تم بھاگتے ہو یا نہیں۔ اگر تم وہیں بیٹھے رہتے تو ہم زندگی بھر تمہیں شناخت نہ کر پاتے۔‘‘

سراغ رساں بولے جا رہا تھا۔ اس طرح شاید وہ زیادہ سے زیادہ لطف لینا چاہتا تھا۔ اسمتھ کو چکر آ رہے تھے۔ اُسے لگ رہا تھا جیسے وہ بھنور میں پھنس چکا۔ آخر اُس نے خود کو سنبھالا اور سراغ رساں کی آنکھوں میں دیکھا۔

’’پھر تم آخر مجھ تک کیسے پہنچے‘‘؟ اُس نے حیرت سے پوچھا۔ ’’مجھے اپنی صلاحیتوں پر پورا یقین اور اعتماد تھا۔ میں نے کوئی سراغ نہیں چھوڑا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، میں نے بعد ازاں شیشی پر سے اپنی انگلیوں کے نشان مٹا ڈالے تھے۔ اور بھیس بھی انتہائی شاندار بدل رکھا تھا۔ پھر تم نے کیسے میرا پتہ لگایا؟ مجھ تک کیسے پہنچ گئے؟

سراغ رساں کی مسکراہٹ کچھ اور کشادہ ہو گئی۔ ’’اُس اشتہار کے ذریعے جو تم نے ایک ہفتے قبل اخبار میں دیا تھا۔‘‘ وہ بولا۔ ’’کیا تم اب بھی نہیں سمجھے؟ اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

اسمتھ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ ’’ارے بے وقوف‘‘ سراغ رساں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ’’میں وہی سوسن ہوں جس سے تم شادی کرنا چاہتے ہو۔ مجرم کتنا ہی چالاک ہو وہ قانون سے نہیں بچ سکتا۔‘‘

عالیہ فاطمہ

مُسکراہٹ دِلکش بنا لیجیے

دانتوں کی تندرستی و صفائی کے لیے تیر بہدف نسخے

سفید دانتوں کی چمک سے اپنی مسکراہٹ پُرکشش بنانا کس کی خواہش نہیں ہوتی؟ لاتعداد خواتین و حضرات اس مقصد کے لیے ہزاروں روپے ماہرین دنداں کو دے کر ان کی صفائی کرواتے ہیں۔ تاہم کیا آپ نے کبھی ایسے قدرتی طریقے یا غذائیں استعمال کرنے کا سوچا جو آپ کے دانت موتیوں کی طرح سفید کر سکتی ہیں؟

درحقیقت موتیوں جیسے چمکتے دانت آج کے دور میں خوبصورتی کا جزو بن چکے جیسے بال رنگوانا، بھنویں بنوانا وغیرہ۔ اچھی بات یہ کہ اپنی مسکراہٹ جگمگانے کے لیے آپ کو بہت زیادہ خرچہ کرنے کی ضرورت نہیں، درحقیقت اسٹرابیری سے لے کر پاپ کارن تک یہ کام بخوبی کر سکتے ہیں۔ چند چیزوں کے بارے میں جانیے جو آپ کی خوبصورتی کو چار چاند لگانے میں مددگار ثابت ہوں گی۔

بیکنگ سوڈا

اپنے باورچی خانے سے بیکنگ سوڈا (کھانے کا سوڈا) نکال کر غسل خانے میں منتقل کر دیں۔ جی ہاں، یہ سفید سفوف جو بیشتر ٹوتھ پیسٹوں کا حصہ ہوتا ہے، قدرتی طور پر دانتوں کی سفیدی واپس لانے میں مددگار بنتا ہے۔ چوتھائی چمچ بیکنگ سوڈا پانی میں ملائیے اور پھر اپنے دانتوں پر ٹوتھ برش کی مدد سے لگائیے۔ اس سے دانتوں کی سفیدی بتدریج بحال ہونے لگتی ہے۔ معمول بنا لینے سے کچھ عرصے میں دانت موتیوں کی طرح چمکنے لگتے ہیں۔

اسٹرابیری

اس پھل کے داغ ہو سکتا ہے کہ کپڑوں سے تو نہ ہٹ سکیں مگر دانتوں پر ان کا اثر بالکل مختلف ہوتا ہے۔ دراصل اس پھل میں شامل مالیس ایسڈ قدرتی طور پر دانتوں کی چمک بحال کرنے میں مدد کرتا ہے۔ تاہم پھل کو کھا لیجیے، اسے دانتوں پر چپکنے نہ دیں کیونکہ اس سے ان کی سطح کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔

نمکین گرم پانی

یہ قدرتی ٹانک نہ صرف دانتوں کو قدرتی طور پر صاف کرتا بلکہ مسوڑھے صحت مند رکھنے میں بھی مددگار ثابت ہوتا

ہے۔ اس سے فائدہ اٹھانے کی خاطر کے لیے ایک چمچ نمک ایک کپ گرم پانی میں شامل کیجیے۔ پھر اسے ٹھنڈا کر کے ماؤتھ واش کے طور پر استعمال کریں۔

پنیر کا استعمال

یہ بھی دانتوں کی صفائی کے لیے ایک زبردست قدرتی غذا ہے جو دانت بھی مضبوط کرتی ہے۔ پنیر میں کیلشیم موجود ہوتا ہے جو دانتوں کی مضبوطی کے لیے ضروری ہے۔ خاص طور پر سخت پنیر میں، جیسے چیڈر چیز وغیرہ۔

ناریل کا تیل

ایک چمچ ناریل کے تیل سے دانت کو دھولیں کیونکہ یہ عمل انھیں داغ دھبوں سے بچاتا ہے۔ دانتوں کی صفائی کا یہ عمل جس حد تک ممکن ہو، دیر تک کریں۔ خاص طور پر پندرہ منٹ مثالی وقت ہے۔ اس سے بیکٹیریا کے خاتمے اور اس پر گندگی ہٹانے میں مدد ملتی ہے۔

دودھ کا زیادہ استعمال

اس فطری تحفے میں موجود کیلشیم دانتوں کی سطح اور مجموعی ڈھانچا مضبوط کرتا ہے جبکہ جبڑوں کی ہڈی بھی سخت ہوتی ہے۔ دودھ کے علاوہ لیموں، پانی یا ٹانک واٹر بھی دانتوں کی جگمگاہٹ بڑھانے میں مددگار ثابت ہوا ہے۔

پاپ کارن

اس کو صفائی والی غذا کے طور پر بھی جانا جاتا ہے۔ دراصل پاپ کارن کے سخت کونے دانتوں پر سے جراثیم ہٹانے یا صفائی کرنے کا کام انجام دیتے ہیں۔ اگر کسی وجہ سے رات کو آپ اپنے دانتوں پر برش نہیں کرسکتے تو کوشش کیجیے کہ آخری غذا کے طور پر پاپ کارن کی کچھ مقدار کھالیں۔

روزانہ ایک سیب

یہ منفرد پھل ''قدرت کا ٹوتھ برش'' بھی کہلاتا ہے۔ ماہرین طب کی رو سے سیب دانتوں کی صفائی کے لیے بہترین ذریعہ ہے۔ اگر کسی وجہ سے آپ دانتوں کی صفائی نہیں کرسکتے تو ایک سیب کھالیں۔ اسی طرح کچی گاجریں یا کھیرا بھی بہترین متبادل ثابت ہوسکتے ہیں۔

چیونگم

والدین بچوں کو منع کرتے ہیں کہ وہ چیونگم نہ کھائیں۔ تاہم یہ دانتوں کی صفائی کرنے میں اس طرح مدد کرتی ہے کہ کونوں یا سوراخوں میں پھنس جانے والے ذرات نکال باہر کرتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ تھوک کی مقدار بڑھاتی ہے جس سے ایسا قدرتی تیزاب دانتوں کی سطح کو ملتا ہے جو ان کی مضبوطی کا باعث بن جائے۔ چینی سے پاک چیونگم کا استعمال زیادہ بہتر ہے۔

زبان کی صفائی مت بھولیں

ہماری زبان خوراک جیسے چائے اور کافی کے ذرات اپنے نیچے دبا لیتی ہے۔ نتیجے میں اگر اس جگہ کی صفائی نہ کی جائے تو دانتوں کی بیماریوں کا سامنا ہوسکتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ اس صورت میں دانتوں کے امراض کے باعث بننے والے بیکٹیریا کی تعداد میں دس گنا اضافہ ہوجاتا ہے۔ اس مسئلے سے بچنے کا حل بہت آسان ہے یا تو اپنا برش زبان پر پھیرلیں یا زبان کی صفائی کے لیے ملنے والا آلہ گھر لے آئیے۔

ویسلین

کچھ مقدار میں ویسلین خواتین کے ہونٹوں پر لگی لپ اسٹک دانتوں میں منتقل ہونے سے روکتی ہے۔ یاد رہے، لپ اسٹک کچھ عرصے بعد دانتوں پر داغ دھبوں کا باعث بن کر انھیں بدنما بنا دیتی ہے۔

معمولی سی توجہ اور درج بالا گھریلو ٹوٹکوں سے آپ اپنے دانتوں کو حسین و جمیل مسکراہٹ دے سکتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ کسی مہنگے دندان ساز کے ہی پاس جا کر، بھاری بھرکم فیس ادا کر کے دانتوں کو چمکایا جائے۔ یہ سب قدرتی طریقوں سے ممکن ہے اور سہل بھی۔ ♦♦♦

باغ کا راز

ابوالفرح ہمایوں

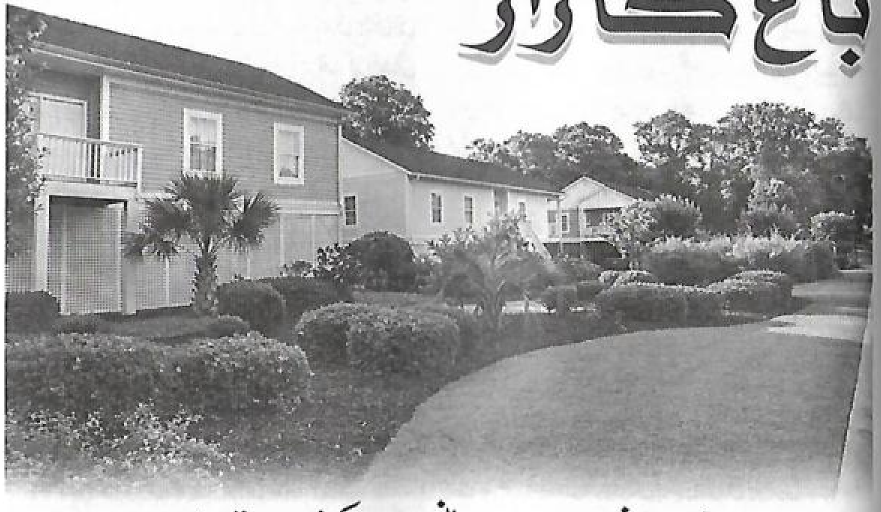

ایک خوش مزاج اور ہنس مکھ خاتون کا ماجرا جو دیکھتے ہی دیکھتے چڑچڑی اور بدمزاج بن گئی

بیگم افضال نہایت ہی خلیق، مہربان اور ملنسار خاتون ہیں، لیکن جب سے بلدیہ عظمیٰ نے انھیں اطلاع دی ہے کہ ایک بڑی شاہراہ تعمیر کرنے کے سلسلے میں انھیں اپنے وسیع و عریض باغ کے ایک حصے سے ہاتھ دھونے پڑیں گے، تب سے وہ انتہائی چڑچڑی اور بدمزاج ہوگئیں۔ نجانے انھیں کیا ہوگیا ہے، بات بات پر کاٹ کھانے کو دوڑتی ہیں۔

وہ گزشتہ آٹھ سال سے میری پڑوسن ہیں، بلکہ دراصل میں ان کا پڑوسی ہوں، کیونکہ وہ موجودہ مکان میں بیس سال سے رہائش پزیر ہیں، جبکہ مجھے اس علاقے میں آئے ہوئے آٹھ سال ہوئے ہیں۔ میں اس بات کا برملا اعتراف کروں گا کہ میں نے ان جیسی ہنس مکھ اور خوش اخلاق خاتون نہیں دیکھی۔ وہ انتہا درجے کی ہمدرد اور غمگسار بھی ہیں۔ آس پاس کے تمام لوگ ان کے گن گاتے ہیں۔

وہ ہیں بھی ایسی ہی! ہر ایک کے غم کو اپنا غم سمجھنے والی اور ہر کسی کی مصیبت میں کام آنے والی۔ میں جن خوبیوں کا تذکرہ کر رہا ہوں، وہ بلدیہ کا نوٹس آنے سے پہلے کا ذکر ہے۔ اب تو ایسا لگتا ہے کہ اس خوش مزاج عورت میں جیسے کوئی بدرُوح حلول کرگئی ہو۔ اُن کی اس ذہنی تبدیلی نے ہر ایک کے چہرے کی رونق کو اُداسی میں تبدیل کردیا ہے۔ ہر دل سے اُن کے لیے یہی دعا نکل رہی ہے کہ اللہ کرے اُن کی پریشانیاں دُور ہوجائیں اور وہ دوبارہ اپنے اصلی روپ میں واپس آجائیں۔

بیگم افضال ایک معاملے میں بڑی ہی بدقسمت واقع ہوئی

تھیں، حالانکہ اس قسم کے اچھے لوگوں کو کوئی دُکھ اور پریشانی نہیں ہونی چاہیے، لیکن قدرت کی مصلحت اُوپر والا ہی بہتر جانتا ہے۔ بہرحال واقعہ یہ ہے کہ اُن کی گھریلو زندگی بڑی ہی ناکام اور قابلِ افسوس تھی۔ بظاہر تو یہی نظر آتا تھا کہ افضال صاحب بڑے ہی شریف اور نیک شخص ہیں اور ساری تلخیوں کی واحد ذمے دار صرف اور صرف اُن کی بیگم ہیں، لیکن...

اصل حقیقت کیا ہے، یہ راز کبھی نہ کھل سکا۔ کسی کا دل یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا کہ بیگم افضال جیسی خوش مزاج اور ہنس مکھ خاتون گھر میں سوائے لڑنے جھگڑنے اور بک بک جھک جھک کرنے کے اور کچھ نہیں کرتیں۔ بہرحال، ایک بات تو ماننی پڑے گی کہ گھر میں خواہ کچھ بھی ہوتا رہے، وہ لوگ باہر کے کسی آدمی سے اس موضوع پر بات نہیں کرتے تھے اور یہی دکھاتے کہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔

افضال صاحب کی شادی کو تیس سال گزر چکے تھے۔ اللہ جانے کس طرح اُنھوں نے اتنی طویل ازدواجی زندگی گزاری، لیکن شاید آخری عمر میں ان کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ چند ماہ قبل اُنھوں نے اپنا بوریا بستر سمیٹا اور اپنے گھر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ گئے۔ تمام اہلِ محلہ کے لیے سخت حیرت اور تعجب کی بات تھی کہ اُنھوں نے کسی سے کچھ بھی نہ کہا اور نہ جاتے وقت کسی سے الوداعی ملاقات کی۔ خاص طور پر مجھے تو یہ بات بڑی ہی شاق گزری۔ ہمارے اچھے تعلقات کی مناسبت سے ان کا یہ اخلاقی فرض بنتا تھا کہ کم سے کم مجھ سے تو ملاقات کر لیتے۔

وہ چلے گئے تو دوسرے دن بیگم صاحبہ نے مجھے اور دوسرے لوگوں کو اطلاع دیتے ہوئے بتایا ''افضال صاحب نے یہ طے کیا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے آخری ایام عبادت میں گزاریں گے۔ وہ ایبٹ آباد میں اپنے بھتیجے کے پاس رہیں گے۔ وہاں وہ پورے اطمینان اور یکسوئی سے عبادت کر سکتے ہیں۔''

ایک ہفتے بعد میں ان کی مزاج پُرسی کے لیے پھر وہاں چلا گیا۔ چائے ہمارے سامنے دھری تھی اور بیگم افضال ساکت و جامد چھت کو گھور رہی تھیں۔ پھر یکایک جیسے وہ کسی خیال سے چونک پڑیں۔ اُنھوں نے میری طرف نگاہ ڈالی اور بولیں، ''چلو اچھا ہوا۔ افضال صاحب جہاں رہیں خوش رہیں۔ اب میں بھی اپنی عمر کا آخری حصہ اطمینان و سکون سے گزار سکوں گی۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ ہماری گھریلو زندگی خوشگوار نہیں تھی۔''

ان کی آواز میں بے انتہا کرب تھا۔ مجھے اپنا دل ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ میں سوائے زبانی دلجوئی کے اور بھلا کر بھی کیا سکتا تھا۔ بہرحال میں نے دل میں طے کر لیا کہ اب میں ان کا خاص خیال رکھوں گا اور جو بھی مدد ہو سکے، کرتا رہوں گا۔ چنانچہ جب وہ اپنے باغ کے ایک حصے کو کھو دینے کے غم میں بے حد ملول اور دل گرفتہ تھیں تو میں اُن کی ہر طرح سے مدد کرنے کے لیے کمربستہ ہو گیا۔

''میرے باغ کا وہی حصہ سب سے زیادہ زرخیز ہے جس پر وہ قبضہ کرنا چاہ رہے ہیں۔ اگر وہ کوئی اور حصہ مانگتے، بلکہ زیادہ رقبہ بھی طلب کرتے تو مجھے کوئی اعتراض نہ تھا، لیکن وہ میری بیش قیمت زمین کوڑیوں کے مول زبردستی چھین لینا چاہتے ہیں۔ میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔ کسی قیمت پر بھی نہیں۔'' اُن کا چہرہ شدتِ جذبات سے سرخ ہو گیا اور پھر فوراً ہی وہ سسکیاں بھرنے لگیں۔

اُن کی مظلومیت کا احساس کرتے ہوئے میرا دل بھی بھر آیا۔ ''آپ بالکل بھی فکر نہ کریں بیگم افضال! آپ کی مرضی کے بغیر وہ زمین کا ایک چپّہ بھی نہیں حاصل کر سکتے۔ میں آج ہی بلکہ ابھی انتہائی سخت قسم کا خط انتظامیہ کو لکھتا ہوں۔ مجھے قوی اُمید ہے کہ وہ آپ کی زمین کے بجائے کوئی اور متبادل راستہ تلاش کر لیں گے۔'' میں نے ان کی ڈھارس بندھائی اور انھیں اللہ حافظ کہہ کر اپنے گھر آ گیا۔

گھر میں بیٹھ کر میں نے اس مسئلے پر سوچنا شروع کیا۔ جتنا بھی غور کیا، اتنا ہی مجھے یقین ہوتا گیا کہ میری کوشش فضول ثابت ہو گی۔ آخر بلدیہ کی انتظامیہ نے بہت اچھی طرح سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا ہو گا کہ شاہراہ کہاں سے گزرے گی۔ وہ لوگ بھلا ایک عورت کی خوشی کے لیے اتنا بڑا منصوبہ یکسر تبدیل کرنے سے تو رہے۔ بہرحال پھر بھی میں نے ایک موہوم سی اُمید کا سہارا لے کر درخواست داغ دی، صرف بیگم افضال کی تسلی کی خاطر۔

اور پھر وہی ہوا، جس کا مجھے ڈر تھا۔ میری درخواست کا جواب آ گیا۔ لکھا گیا تھا کہ اگر آپ کی تجویز پر عمل کیا جائے تو کروڑوں روپے برباد ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ دوبارہ نئی اسکیم ترتیب دینے اور اس کی منظوری میں نجانے کتنا عرصہ لگ جائے۔ اپنے دل پر جبر کرتے ہوئے میں نے بیگم افضال کو اس فیصلے کی اطلاع دے دی۔

میں نے سوچا کہ بیگم صاحبہ پڑھی لکھی سمجھدار خاتون ہیں، وہ بلدیہ کا نکتۂ نظر ٹھنڈے دل سے سن کر اپنی ضد چھوڑ دیں گی، لیکن میری توقع کے برعکس وہ تو یہ سنتے ہی چراغ پا ہو گئیں اور مغلظات بکنے لگیں۔ میں نے اُنھیں اس قدر شدید غصّے کا اظہار کرتے ہوئے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ان کا چہرہ شدتِ جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔ منہ سے کف جاری ہو گیا اور کھچڑی بالوں کی لٹیں ان کے چہرے کے گرد پھیل کر ایک عجیب ہیبت ناک منظر پیش کر رہی تھیں۔

دانت پیستے ہوئے انھوں نے ایک زوردار مُکا میز پر مارا اور گرجدار آواز میں چلائیں ''وہ ذرا میری زمین کو ہاتھ تو لگا کر دیکھیں۔ ایک ایک کا وہ حشر کروں گی کہ اگلے جہان میں بھی فریاد کرتے رہیں گے۔ بلڈوزر اگر میری زمین کی حدود میں داخل ہوا تو وہ میری لاش پر سے گزر کر ہی اندر آئے گا اور مسٹر صفدر!'' اُن کے غصّے کا رُخ اچانک میری طرف مڑ گیا۔ ''میں تمھاری چالاکی سمجھ رہی ہوں۔ تم مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہو۔ میں اچھی طرح جان گئی ہوں کہ درپردہ تم بلدیہ والوں سے ملے ہوئے ہو۔ بہتر ہو گا کہ تم میری نظروں سے دُور ہو جاؤ اور آئندہ کبھی یہاں آنے کی کوشش نہ کرنا۔''

ان کی زبان درازی کا طویل سلسلہ شاید میرے آنے کے بعد بھی ختم نہ ہوا۔ بہرحال میں بے حد شکستہ دل ہو گیا، لہٰذا میں نے دوبارہ ان سے ملنے کی ہمت نہیں کی۔

لیکن بیگم افضال کی ہمت کی میں داد دیے بغیر نہ رہ سکوں گا۔ مجھ سے تعلقات ختم کر لینے کے بعد بھی وہ اپنے محاذ پر تنہا ڈٹی رہیں۔ مقامی کونسلر، ایم پی اے اور ایم این اے وغیرہ کو مسلسل درخواستیں دے دے کر اُن کا ناطقہ بند کر دیا۔ ان باتوں کا فائدہ ایک حد تک یہ پہنچا کہ فیصلے پر عمل درآمد میں تھوڑی سی تاخیر ہو گئی، لیکن نتیجہ بالآخر وہی ڈھاک کے تین پات۔ فیصلہ یہی ہوا کہ بیگم افضال خوامخواہ واویلا مچا رہی ہیں۔ ان کی ذاتی مصلحت کی خاطر رفاہ عامہ کے کام کو پس پشت نہیں ڈالا جا سکتا۔ اس فیصلے کے فوراً بعد ہی بلا تاخیر جبری خریداری کا چیک بیگم افضال کے نام جاری کر دیا گیا۔

اور پھر وہ افسوسناک اور المناک گھڑی آ ہی گئی۔ جسے اپنے سے دُور رکھنے کے لیے بیگم افضال نے نجانے کتنی دعائیں مانگی تھیں اور نجانے کتنے وظیفے پڑھے تھے۔ بلدیہ والے ایک صبح بلڈوزر لے کر آن دھمکے۔ اگرچہ یہ صورت حال ہم سب کو ناگوار اور ناپسند تھی، لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ میں بھی تماش بینوں کی صف میں شامل تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں بیگم افضال کے خوبصورت اور دلکش باغ کا ستیاناس ہو چکا تھا۔ دلفریب پھولوں اور خوشنما پھلدار درختوں کی جگہ اب مٹی کے ڈھیر نظر آ رہے تھے۔ بیگم افضال کا چہرہ عجیب وحشت ناک ہو رہا تھا اور وہ پاگلوں کی طرح دونوں بازو اٹھائے فریاد کرتے ہوئے دیوانہ وار ادھر سے اُدھر بھاگ رہی تھیں۔ اُن کی کربناک التجائیں ہر دل کو

خون کے آنسو رُلا رہی تھیں۔

"رُک جاؤ! اللہ کے واسطے رُک جاؤ۔ ان نازک پھولوں اور پھل دیتے ہوئے درختوں کو مت برباد کرو۔ میں کہتی ہوں۔۔۔ اللہ کے واسطے مجھ پر رحم کرو۔ یہ زمین تمہاری نہیں ہے۔ تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ کسی کی زمین یوں بے رحمی سے روند ڈالو۔"

ان کی ہچکیاں بندھ گئیں اور اگلے ہی لمحے وہ بلڈوزر کے سامنے لیٹ گئیں۔ شاید اُن کا پیر اچانک پھسل گیا تھا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ اپنے باغ کی پامالی کا صدمۂ عظیم برداشت نہیں کر پائیں۔ بلڈوزر کی ظالمانہ کارروائی روکنے کا یہی آخری طریقہ اُن کی سمجھ میں آیا۔

بلڈوزر ڈرائیور نے مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے جلدی سے بریک پر پاؤں رکھ دیا، ورنہ بیگم افضال کے کچلے جانے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔ اس نے نیچے اتر کر بیگم صاحبہ کو شانوں سے پکڑ کر کھڑا کیا اور بڑے انکسار سے اُنھیں سمجھانے لگا۔ شاید وہ بھی اُن کی ذہنی کیفیت سمجھ رہا تھا۔

"محترم خاتون! یقین کیجیے میں بالکل بے قصور ہوں۔ مجھے تو بس اپنی ذمے داری نبھانی ہے۔ میں اپنے فرض سے مجبور ہوں۔" یہ کہہ کر وہ دوبارہ بلڈوزر پر جا بیٹھا۔

لیکن بیگم افضال پر تو غصّے کا بھوت سوار تھا۔ اُنھوں نے بلڈوزر کے سامنے سے ہٹنے سے صاف انکار کر دیا اور اُن کی زبان سے مغلظات کا طوفان اُمنڈ پڑا۔ آپریٹر یقیناً کوئی شریف آدمی تھا۔ وہ بیگم صاحبہ کو یونہی بکتا جھکتا چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ پڑوس کے ایک مکان سے اُس نے اپنے کسی افسر کو فون کیا اور کہا کہ ان حالات میں وہ اپنا کام جاری نہیں رکھ سکتا۔ لہٰذا بیگم صاحبہ کو وہاں سے ہٹانے کا کوئی معقول بندوبست کیا جائے۔

اُس افسر نے پولیس سے رابطہ کیا اور تھوڑی ہی دیر میں ایک پولیس انسپکٹر دو سپاہیوں کے ہمراہ موقع پر آن موجود ہوا۔ چند پڑوسی عورتوں کی مدد سے پولیس انسپکٹر نے بیگم صاحبہ کو ایک کمرے میں بند کر دیا تاکہ وہ سرکاری کام میں مداخلت نہ کر سکیں۔ بند کمرے میں بھی بیگم افضال کا احتجاج جاری رہا۔ وہ دروازے کو یوں پیٹ رہی تھیں جیسے اسے توڑ کر ہی دم لیں گی۔ اُن کی گوہر فشانیوں کا سلسلہ بھی جاری رہا لیکن اب کسے پروا تھی۔

کھدائی کا کام پورے زور و شور سے جاری تھا۔ اچانک آپریٹر نے بلڈوزر ایک طرف کھڑا کیا اور خود لمبے لمبے ڈگ بھرتا کہیں غائب ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ پولیس کی ایک گاڑی سپاہیوں سے بھری ہوئی آن وارد ہوئی۔ بلڈوزر آپریٹر بھی اُن کے ہمراہ تھا۔ اُنھوں نے آتے ہی بیگم افضال کو بند کمرے سے باہر نکال لیا۔ سب لوگ یہی سمجھے کہ حفظ ماتقدم کے طور پر وہ بیگم صاحبہ کو کہیں اور منتقل کر رہے ہیں، تاکہ زمین پر قبضے کا کام مکمل یکسوئی سے انجام دیا جا سکے۔ کام مکمل ہوتے ہی انھیں رہا کر دیا جائے گا۔

پھر بھی احتیاطاً میں نے آگے بڑھ کر پولیس افسر سے دریافت کیا کہ وہ لوگ بیگم صاحبہ کو کہاں اور کیوں لے جا رہے ہیں اور ان کی واپسی کب تک متوقع ہے؟ پولیس افسر کے جواب نے مجھے اور وہاں پر موجود لوگوں کو حیران و ششدر کر دیا۔ وہ کہہ رہا تھا، "آپ لوگ غلط سمجھ رہے ہیں۔ ہم بیگم افضال کی مدد کو آئے ہیں نہ ہمیں کسی اور کی طرف داری کرنی ہے۔ ہم انھیں گرفتار کر رہے ہیں۔ کھدائی کے دوران ایک انسانی لاش برآمد ہوئی ہے اور ہمیں شبہ ہے کہ یہ مسٹر افضال کی لاش ہے۔ مزید تفصیل آپ لوگوں کو اخبارات کے ذریعے مل جائے گی۔"

اب ہم سب لوگ جان گئے کہ مسٹر افضال ایبٹ آباد نہیں گئے تھے بلکہ بیگم افضال نے اپنے شوہر نامدار کو عدم آباد روانہ کر دیا تھا۔ بدقسمتی یہ ہوئی کہ انھوں نے لاش اسی قطعہ اراضی میں دفن کر دی جو اب بلدیہ عظمیٰ کو درکار تھا۔ ●●●

فلٹر والا فلرٹ

محبت سے مُکر جانا ضروری ہو گیا تھا
پلٹ کر اپنے گھر جانا ضروری ہو گیا تھا

عافیہ مقبول جہانگیر

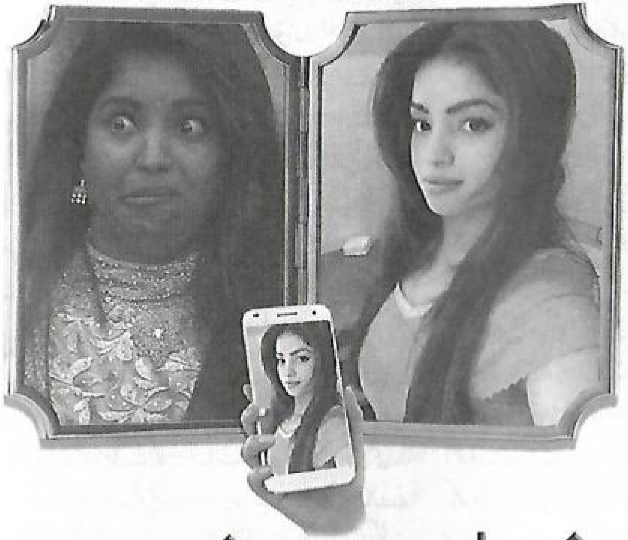

اماں! چلو بھی نا۔ کتنی دیر ہو چکی۔ وہاں وہ لوگ ہمارے انتظار میں سوکھ رہے ہوں گے۔ زبیر کو ایک پل چین نہ تھا۔ ہوتا بھی کیسے؟ جب سے فیس بک پر اس پری وش، مہ وش، حور، ملکۂ حسن کا شاہکار اپنی گناہ گار آنکھوں سے دیکھا تھا تب سے دلِ بے قرار پھڑک پھڑک کر باہر کو یوں آ رہا تھا جیسے وہ اپنی شادی کے لیے لڑکی دیکھنے نہیں، سٹیج پر گویا میڈل جیتنے کے بعد دنیا کے سامنے تقریر کرنے جا رہا ہو۔ خواتین و حضرات، یہ میری بیگم میں نے ایسے ہی حاصل نہیں کیں۔ ہزاروں اکاؤنٹ بنا ڈالے۔ طرح طرح کے ناموں سے نقلی آئی ڈیز بنا کر انھیں پھنسانے، میرا مطلب ہے رجھانے لبھانے کے بعد جا کر کہیں ان محترمہ نے تھوڑی سی لفٹ کروائی۔

لفٹ بھی کیا خاک کروائی، جھولٹھ مار انداز میں آپ کون؟ کیا کام ہے؟ جیسے "بداخلاق" جملے بول کر گویا دل ناتواں ذبح کر ڈالا، مگر زبیر میاں بھی گنوں کے پورے تھے۔ مجال ہے جو ذرا شکن ہونے دیا ہو کہ وہ بالکل انجان، حیران، پریشان آدمیوں کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

بہت اعتماد سے دو چار ادبی، علمی باتیں گھڑ کر محترمہ کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو ہی گئے کہ موصوف انتہائی اشرفیہ خاندان کے اکلوتے چشم و چراغ ہیں اور نہ صرف یہ خود بلکہ ان کا پورا خاندان جدی پشتی تعلیم ہتھیلی پر یوں لیے گھومتا ہے کہ کیا ہی کوئی بہادر جان لیے گھومتا ہوگا۔

بس پھر کیا تھا؟ محترمہ ان کی شکل و صورت کو قطعاً گھاس

نہ ڈالتے ہوئے صرف ان کے علمی ''رتبے'' پر ہی دل وجان سے فدا ہوگئیں۔ بات چیت کا سلسلہ آگے بڑھتا گیا اور باتوں باتوں میں ہی پتہ چلا کہ محترمہ کے گھر والے آج کل ان کے لیے کسی موزوں شریف زادے کی تلاش میں اتنے چراغ لیے گھوم رہے ہیں کہ اب تو ان کے محلے والوں کو لوڈ شیڈنگ کا بھی چنداں غم نہیں رہا۔ کیونکہ بتی جائے نہ جائے، ان کے گھر کا ہر فرد چراغاں کرتا محسوس ہوتا ہے۔

ادھر زبیر نے بھی اپنی سب سے بہترین تصویر، جو بقول صرف اُسی کے، ہو بہو پرانے زمانے کے چاکلیٹ ہیرو وحید مراد سے کچھ ملتی جلتی تھی، وہی ڈی پی لگا ڈالی۔ (شکر ہے وحید مراد حیات نہ تھے ورنہ لوگ مرنے والے کا ماتم کیا کرتے ہیں وحید مراد کو اپنے زندہ ہونے پر پچھتاوے کا ماتم کرنا پڑتا)۔

خیر ہمیں موضوع سے بھٹکنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ زبیر میاں کا بھٹکنا ہی کافی ہے اور وہ بھی در بدر۔ اس دربدر کی سمجھ آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اور جب تک آئے گی زبیر میاں اس بھٹکنے کے نتیجے میں اپنا سر پٹک رہے ہوں گے۔ تو ہوا کچھ یوں کہ ادھر ان محترمہ نے زبیر کی تصویر دیکھتے ہی اپنا دل کھویا تو وہاں زبیر نے ان کی ڈی پی دیکھتے ہی اپنا بل کھویا۔ جی ہاں فون کا بل جو پہلے صرف چند سو روپے تک محدود ہوتا تھا، اب ہزاروں میں بھرا جانے لگا کیونکہ اب بات آگے بڑھ چکی تھی۔

تصاویر کو شرفِ قبولیت دونوں جانب سے بخشے جانے کے بعد فون نمبرز کا تبادلہ ہوا اور پھر گفتگو لامحدود ہوتی چلی گئی۔ کس کے گھر میں کیا پکا، سے لے کر کس نے کتنی روٹیاں کھائیں اور کس نے گھر والوں سے جوتے ڈانٹ پھٹکار، سبھی کچھ ایماندار محبوب ایک دوسرے سے شیئر کرنے لگے۔

عشق ومحبت کی رومانوی باتوں میں وہ سچائی اور حقیقت پسندی کہاں، جو گھر والوں کی لعن طعن ایک دوسرے کو سنانے میں ہے۔ محبوب کی جھوٹی سچی تعریفوں میں زمین وآسمان کے قلابے ملانے سے لے کر ہر شاعر کی شاعری خود پر فٹ کرنے میں وہ مزا کہاں جو گھر کے راز ایک دوسرے کو بتانے میں اپنائیت تھی۔ آج اماں نے کتنی بوٹیاں چھوٹے بھائی کو کھلائیں، ابا نے سستی اور لاپروائی پر بیچارے زبیر کو سوتیلی اولاد جیسا رویہ رکھنے تک کے طعنے دے مارے، یہ سب اپنی حور پری کو بتاتے ہوئی زبیر یوں آبدیدہ ہو جاتا جیسے واقعی وہ ابا کی سوتیلی اولاد ہو یا ایسا لے پالک ہو جو کسی دور کے غریب رشتے دار نے صلہ رحمی وخوفِ خدا کے ڈراوے اور اپنی غربت کے واسطے دے کر ابا کی جھولی میں ''پھینک'' دیا ہو۔

مہ وش، (جی ہاں محترمہ کا نام بھی مہ وش ہی تھا)، زبیر کے ان ظالم گھر والوں کے ظلم وستم پر زبیر کے دکھوں میں برابر کی شریک ہوتی اور اسی آہ زاری وسسکیوں میں وعدے وعید کیے جاتے کہ جس دن میں آپ کے گھر آ گئی، آپ کو ماں کا پیار باپ کی بپتا بھائی کا لاڈ اور بہن کا (نہیں نہیں توبہ توبہ) بہن کے سوا باقی سب پیاروں کی کمی محسوس تک نہ ہونے دوں گی۔ زبیر ٹھنڈی آہیں بھرتا اور جلد ہی اماں ابا کے ساتھ مہ وش کے گھر آنے کی یقین دہانی کرواتا۔

زبیر کی تو مانو عید ہوگئی جس دن ابا میاں نے اسے پاس بٹھا کر اس کے مُردوں سے شرط لگا کر سونے کی عادت سے پریشان ہو کر، خلافِ عادت پچکارتے ہوئے پوچھ ہی لیا کہ آخر اسے روگ کیا ہے؟ اب یہ اور بات کہ زبیر کو وہ پچکار کچھ کچھ سانپ کی پھنکار جیسی لگی جسے اس نے اپنا واہمہ سمجھ کے جھٹک دیا۔ ابا بیچارے سمجھتے تھے کہ وہ تمام دن چارپائی پر پڑا سویا رہتا ہے تو کہیں یہ کوئی بیماری تو نہیں؟ انھیں کیا خبر کہ زبیر سوتا نہیں بلکہ چادر کے اندر ایک عدد موبائل فون چھپا کر، گھر کی ذمہ داریوں سے آنکھیں بند کیے اپنی مہ وش کو اپنے نادیدہ دکھوں کا حال بتانے میں مشغول ہوتا ہے۔ باپ تو پھر باپ ہوتا ہے۔ ابا میاں کو بھی اپنی اس ناخلف اولاد پر ترس آ ہی گیا اور انھوں نے زبیر کی اماں سے صلح مشورہ کر کے حل یہ نکالا کہ برخوردار شدید قسم کی تنہائی کا شکار ہو چکے۔ اس سے

پہلے کہ یہ بیماری ان کے سپوت کو کہیں کا نہ چھوڑے (یا شاید ابا میاں کو کہیں منہ دکھانے لائق نہ چھوڑے) کیوں نہ زبیر کی شادی کر دی جائے۔ زبیر سے اس کی پسند پوچھی گئی تو اس نے جھٹ سے کہا کہ اس کے ایک دوست کے جاننے والے ہیں۔ ان کو بھی اپنی بیٹی کے لیے کسی مناسب بَر کی تلاش ہے۔ تو کیوں نہ انھیں مناسب کے بجائے ''بہترین'' ملے۔ غریب ہیں تو کیا، بہترین پر غریب کا حق پہلے ہوتا ہے۔ گھر والے زبیر کی اس اعلیٰ ظرفی پر خوشی سے نہال ہوگئے۔ ابا میاں کو اچانک ہی اپنی یہ اولاد اللہ کا انعام لگنے لگی جو انھیں ضرور کسی نیکی کے عوض ملی تھی اور جو انھیں جنت لے جائے گی۔

ہاں زبیر نے اتنا ضرور بتا دیا کہ اس نے لڑکی کو کبھی نہیں دیکھا صرف ایک آدھ تصویر دیکھی ہے، وہ بھی بس دوست نے فیس بک پر دکھائی تھی۔ ابا میاں کیا جانیں فیس بک کس بلا کا نام ہے۔ وہ تو اسے غیبی مدد سمجھے اور چلنے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ زبیر نے مہ وش سے کہا کہ اگلی اتوار زبیر مع ابا اماں ان کے گھر آئے گا اور پھر ایک حسین زندگی کی شروعات ہوگی۔

☆☆☆☆☆

زبیر اماں ابا کے ساتھ مہ وش کے گھر ہونقوں کی طرح منہ کھولے سامنے بیٹھی لڑکی کو تک رہا تھا جو کسی طور مہ وش کی تصویر سے میل نہیں کھاتی تھی۔ کہاں وہ نیلی آنکھوں والی حسین نین نقش کی مالک دبلی پتلی، کمان سے ابرو، لامبی گھنیری پلکیں، حسین وشادابی رنگت، ملکوتی لب ورخسار اور کہاں یہ سامنے بیٹھا گوشت کا پہاڑ۔ رنگت توے سے بس تھوڑی ہی الگ، جیسے برتن دھونے والی لوہے کی جالی رگڑ رگڑ کر کالے بھجنگ توے کو گہرا بھورا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ چڑیا کے گھونسلے نما بال، جو زلفیں کم اور جلا ہوا بھوسا زیادہ لگ رہے تھے۔ زبیر کی آنکھوں کے سامنے مہ وش کی لمبی دراز ریشمی زلفیں لہرانے لگیں۔ چھوٹا سا قد، بے تحاشہ وزن دار، موٹے موٹے بھدے نین نقش لیے یہ لڑکی نما چیز کسی طور مہ وش نہیں ہو سکتی تھی۔

اس کے حلق سے بے ساختہ چیخ نما آواز نکلی، ''نہیں ں ں ں۔''

''ہاں ہاں بیٹا! میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں کہ ہم جہیز نہیں لیں گے۔'' ابا میاں اپنا ہی راگ آلاپ رہے تھے۔

''ابا!!!! اب کی بار زبیر باقاعدہ کراہا۔

''کیا ہے؟'' ابا نے خشمگیں نگاہوں سے بیٹے کو گھورا۔ انھیں ڈر لاحق ہوا کہ کہیں زبیر اس معصوم سی اللہ میاں کی گائے، (گائے کی تشبیہہ ابا کا صحیح اندازہ تھا) سے شادی کرنے سے مکر گیا تو اچھا بھلا ہاتھ آیا نیکی کا موقع ضائع ہو جائے گا۔ اُن کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اگر (خدانخواستہ) وہ غیر مذہب کے ہوتے تو اسی وقت زبیر کا انگوٹھا کیک کاٹنے والی چھری سے چیر کر چلاّتے، ''اُٹھ بیٹا، میری ہونے والی بہو رانی کی مانگ بھر دے۔'' انھیں اس بات سے کیا سروکار کہ وہ بہو کم اور بچوں کو ڈرانے والا ہوّا زیادہ لگ رہی تھی۔

''اماں...... یہ وہ نہیں ہے۔'' ابا کی طرف سے مایوس ہو کر اماں کو مدد کے لیے پکارا۔

''اے کیا وہ نہیں ہے، وہ نہیں ہے کی رٹ لگا رکھی ہے۔'' اماں نجانے کیوں بیزار بیٹھی تھیں۔

مہ وش نے موٹی موٹی بھینس جیسی آنکھیں گھمائیں اور زبیر کی طرف دیکھ کر غیر ضروری شرمانے کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی:

''زوبی، یہ میں ہی ہوں تمھاری مہ وش۔ دیکھو تو کیسے کہہ رہے ہو کہ مجھے نہیں جانتے۔ کہو تو ثبوت دے دوں۔ یاد کرو، پچھلے منگل ہی تم نے بتایا تھا کہ ٹینڈے کھانے سے تمہارا پیٹ خراب ہو گیا تھا اور تم ساری رات غسل خانے کے چکر کاٹتے رہے تھے۔ آیا یاد؟''

مہ وش نے ایسا گھٹیا راز سب کے سامنے کھول کر زبیر پر گھڑوں پانی ڈال دیا۔ اماں، ابا نے چونک کر زبیر میاں کی طرف دیکھ کر کلستے ہوئے سوچا، ''ناہنجار کہتا تھا کبھی بات نہیں

ہوئی لڑکی سے‘‘، اُوپر سے ’’ایسی‘‘ پریم کہانی؟ یہ بھی کوئی باتیں ہیں بتانے والی۔ دُرفتے منہ......

’’ہوسکتا ہے مہ وش نے تمھیں ساری باتیں بتائی ہوں۔ ہوسکتا ہے تم اس کی کوئی دوست ہو اور اپنے ہونے والے بہنوئی سے مذاق کررہی ہو۔ ابھی سے شرارتیں شروع......؟‘‘ زبیر نے شرماتے ہوئے کہا۔

’’اُفوہ! اب میں تمھیں کیسے یقین دلاؤں؟ اچھا سنو! دیکھو ابھی میں اپنی ایک سیلفی اتارتی ہوں۔ تم خود جان جاؤ گے کہ وہ میں ہی ہوں۔‘‘

مہ وش کسی معجزے کی بات کررہی ہے۔ یہ شاید پاگل ہے یا مجھے بنا رہی ہے۔ زبیر نے سوچا۔

مہ وش نے کھٹاک سے اپنی ایک عدد سیلفی کھینچی اور مسکراتے ہوئے اپنا موبائل زبیر کو تھما دیا۔

’’دیکھو اب اس تصویر کو اوپن کرو۔‘‘

’’ہاں کیا......؟‘‘ زبیر نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کی ہدایت پر عمل کرنے میں ہی عافیت جانی۔ اب کچھ تو کرنا ہی تھا اس مخمصے سے نکلنے کے لیے۔

’’اب فلٹر اوپن کرو۔‘‘

زبیر کو اس کی ذہنی حالت پر ایک بار پھر شبہ ہوا۔ یہاں اس کی جان پر بنی تھی اور اسے تماشے سوجھ رہے تھے۔ اماں ابا چپکے بیٹھے تھے۔ صرف لڑکی کی ماں مطمئن انداز میں بیٹھی چائے کے سڑپ سڑپ گھونٹ بھرتی اپنی بیٹی کو فخریہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

’’اب فلٹر نمبر ایک منتخب کرو۔‘‘ مہ وش نے اگلی ہدایت دی۔

ہاں کردیا...... ہیں! یہ کیا؟ تصویر میں موجود چہرے کی رنگت یک دم چاند سے بھی دودھیا ہوچکی تھی۔

’’اب فلٹر نمبر دو دباؤ۔‘‘ اگلا حکم آیا۔

’’جی جی، دبایا۔‘‘ زبیر نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

یہ کیا؟ غبارے جیسا پھولا چہرہ ایک دم دبلا پتلا کسی سترہ اٹھارہ سال کی نازک دوشیزہ میں تبدیل ہوگیا تھا۔

’’اب فلٹر نمبر تین میں جاؤ۔‘‘

زبیر نے تین پر کلک کیا۔ اب یہ کیا......؟ آنکھیں ایک دم نیلی نیلی اور ہرنی جیسی بڑی چمکدار ہوگئیں۔

زبیر کبھی موبائل کی اسکرین دیکھتا تو کبھی سامنے بیٹھی جیتی جاگتی بھوتنی کی طرف۔ بے یقینی سے اس کے جسم پر لرزہ طاری تھا۔

’’اب فلٹر نمبر چار پر جاؤ۔‘‘ مہ وش نے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

اب کی بار زبیر نے بغیر کچھ کہے نمبر ۴ کلک کردیا۔ لمبی گھنی زلفیں اس چمکتے دمکتے حسین چہرے کا طواف کرنے لگیں۔

’’اچھا اب آخری بٹن، فلٹر نمبر پانچ دباؤ، پھر دیکھنا جادو۔‘‘ مہ وش جوش سے بولی۔ (اب تک جو ہورہا تھا، وہ کون سی حقیقت تھی، جادو ہی تو تھا)

؎ تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں، ہم بیزار بیٹھے ہیں

آخری فلٹر دباتے ہی تصویر میں موجود بے ڈول ڈھول جیسا جسم کسی خوبصورت جل پری کے سراپے میں ڈھل چکا تھا۔ زبیر میاں کے ماتھے پر آئی پسینے کی بوندیں موبائل اسکرین پر ٹپک ٹپک کر اس حسینہ کے چہرے پر شبنم کے قطروں کا کام دے رہی تھیں۔ ابا میاں، جو اس ساری کارروائی کے دوران زبیر کے گھٹنے سے اپنا گھٹنا جوڑے بیٹھے یہ سارا ’’ڈیجیٹل انسان‘‘ وجود میں آتا دیکھ رہے تھے، اب ساری بات سمجھ چکے تھے۔

انھوں نے گہرا سانس لیا اور غرّا کر زبیر سے کہا۔

’’گھر چل...... تیری شادی اب اِسی سے ہوگی۔‘‘

’’پر ابا......؟؟‘‘ زبیر میاں کھڑے ہوتے ہوتے لڑکھڑا گئے۔

’’ہاں ہاں، اسی سے ہوگی...... موبائل سے۔‘‘

وادی کاغان کا بلند ترین دلکش مقام

رانا محمد شاہد

درہ بابوسر

ہمارا پیارا وطن اپنی خوبصورتی اور دلکشی کی وجہ سے دنیا بھر میں پہچان رکھتا ہے، خصوصاً پاکستان کے شمالی علاقے اور کشمیر سیاحتی مقامات میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ وادی کاغان پاکستان کے شمالی علاقہ جات کے دل کی دھڑکن ہے۔ برف کے بلند و بالا پہاڑ اور خوبصورت پھولوں سے آراستہ سرسبز میدان، آبشاروں سے گرتا پانی، ہرے بھرے جنگل، دل کے تاروں چھوتے خوبصورت اور سب سے بڑھ کر پرندوں کی میٹھی بولیاں اس دلکش وادی کی پہچان ہیں۔ اس خوبصورت وادی کا ایک دلکش نظارہ درہ بابوسر ہے۔ اس کو ’’بابوسر ٹاپ‘‘ بھی کہتے ہیں۔

یہ خوبصورت پہاڑی درہ سطح سمندر سے تقریباً ۱۳۶۹۱ فٹ بلند ہے۔ اس سے آگے چلاس کا مقام ہے جو ۴۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ بالاکوٹ سے درہ بابوسر کا فاصلہ تقریباً ۱۵۹ کلومیٹر ہے۔ چاروں طرف موجود پہاڑ اور جنگلات اس درے کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں۔ حیرت انگیز نظارے دل موہ لیتے ہیں۔ مختلف رنگوں کے خوبصورت پہاڑ اور ان وادیوں کے درمیان دریا کے ساتھ ساتھ چلتی اور بل کھاتی سڑک اور ہی دنیا میں لے جاتے ہیں۔

ایک وادی سے نکل کر دوسری وادی میں داخل ہونے کے لیے چڑھائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس سے گھوم کر اوپر جائیں تو ایک نئی دنیا آپ کی منتظر ہوتی ہے۔ یوں وادیوں کا ایک کوہ در کوہ سلسلہ چلتا ہے۔ وہاں پہاڑوں کی خوبصورتی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ مختلف رنگوں سبز، سرخ، سرمئی اور گلابی رنگ کے پہاڑ یوں سجے نظر آتے ہیں گویا قوس قزح کے رنگ ہوں۔ مختلف جگہوں پر پگھلتی برف، بہتے چشمے اور آبشاریں آپ کو خوابوں کی دنیا میں لے جائیں گے۔

درہ بابوسر سے آگے چلاس اور گلگت کا علاقہ شروع ہوجاتا ہے۔ اس علاقے میں سفر کرتے اونچے سرسبز درخت اور جنگل، گھاس جابجا نظر آتی ہے۔ شاہراہ ریشم سے پہلے یہ راستہ پاک چین تجارت و آمدورفت کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ ہزاروں فٹ نشیب میں اترتا چلاس کا راستہ مانسہرہ سے جدا ہونے والے بالاکوٹ کاغان وادی کے اس راستے کو دوبارہ شاہراہ ریشم سے جوڑ دیتا ہے۔ وادی کاغان کے اس آخری خوبصورت اور بلند ترین مقام تک جانے کے لیے یہ راستہ جولائی ستمبر عام ٹریفک کے لیے کھلا رہتا ہے۔ تاہم مون سون میں لینڈ سلائیڈنگ کی وجہ سے بند بھی کردیا جاتا ہے۔

کوہ ہمالیہ کا وہ پہاڑی سلسلہ جو کشمیر سے مانسہرہ اور وادی کاغان سے گزرتا ہے، بابوسر ٹاپ یا بابوسر پاس اس کا بلند ترین مقام ہے۔ موسیٰ کا مصلیٰ یہاں کی ایک اور بلند چوٹی ہے

جس کی بلندی تقریباً ۱۳۳۷۸ فٹ ہے۔ یہ چوٹی اس درے کی طرف آنے والے سیاحوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتی نظر آتی ہے وہ یوں کہ اچانک کسی موڑ پر سامنے آجاتی ہے۔ تب اس کے سر پر پڑی سفید برف اور دھوپ آنکھوں کو چندھیاتی ہے۔ تاہم یہ اس کے حُسن میں بھی اضافہ کرتی ہے۔

درہ بابوسر ایک برفانی پہاڑی درہ ہے۔ اس لیے یہاں اسٹیشن کی سہولت نہیں۔ ہر طرف بلند و بالا پہاڑ اور برف سے ڈھکی چوٹیاں دکھائی دیتی ہیں۔ درے کے آس پاس آبادی نہیں جس کی وجہ سے کھانے پینے اور دیگر ضرورت کی اشیاء نہیں ملتیں۔ چنانچہ آپ وہاں جائیں تو کھانے پینے اور دیگر ضرورت کا سامان ساتھ لے کر جائیں۔

یہ درہ اپنے برفانی حسن کی وجہ سے مشہور ہے۔ وادی کاغان سے چلاس اور گلگت میں داخل ہونے کا راستہ بابوسر ہی ہے۔ ہوسکتا ہے کسی دور میں اس کا استعمال زیادہ ہو، تاہم اب اس درے کی اہمیت کم ہے۔ آبادی اور راستوں کی سہولتیں نہ ہونے کی وجہ سے سیاح بہت کم اس طرف کا رخ کرتے ہیں۔

بابوسر بہت اونچائی پر واقع ہے۔ سردیوں میں یہ درہ مکمل طور پر برف سے ڈھک جاتا ہے۔ جبکہ گرمیوں میں دھوپ کی وجہ سے برف پگھل جائے تو راستہ کھل جاتا ہے۔ کہر اور بادل اکثر اس علاقے کو گھیرے رکھتے ہیں جس کی وجہ سے بارش بھی ہوتی رہتی ہے۔ زیادہ عرصے تک یہ درہ برف کی چادر اوڑھے رکھتا ہے۔ تاہم سیزن کے دوران یہاں ہر طرف ہریالی نظر آتی ہے۔ اس درے کے آس پاس گھنے جنگل ہیں جہاں موجود پہاڑی پرندے اس علاقے کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں۔ مرغ زریں اور کستوری یہاں کے مشہور پرندے ہیں۔ یہاں جنگلی جانور بھی پائے جاتے ہیں۔

بابوسر سے تھوڑا پہلے نانگا پربت سے اوپر کی طرف اٹھتا اور پھیلتا ایک میدان نظر آتا ہے۔ یہ میدان انسان کو فطرت اور اس کی رعنائیوں میں محو کر دیتا ہے۔ یہ اس وادی کا آغاز ہے۔ جو بلندی سے آہستہ آہستہ نیچے اترتی وادی کا سلسلہ متعین کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ اس درے کا موسم بہت خوشگوار ہے۔ بادل، بارش اور برف باری یہاں کا موسم خوشگوار بنا دیتے ہیں۔ چونکہ یہاں آبادی نہیں لہٰذا آنے والے سیاح عموماً خیموں وغیرہ میں ٹھہرتے ہیں۔ اس خوشگوار موسم میں آپ کے کھانے میں گرم گرم پکوڑے، سموسے اور چائے ہو تو سیاحت کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

اس درے کے راستے میں جھیل لولوسر بھی آتی ہے۔ جو لوگ جھیل لولوسر کا نظارہ کرنے آئیں، وہ اس خوبصورت درے کے دلکش نظارے اپنی آنکھوں میں سمو لیتے ہیں۔ وادی کاغان کی سرحد کے قریب واقع اس جھیل کی خوبصورتی کو دیکھنے کے لیے ہر سال ہزاروں سیاح ادھر کا رُخ کرتے ہیں۔ یہ جھیل ٹراؤٹ مچھلی کی افزائش کے حوالے سے بھی مشہور ہے۔ مرغابیوں کی ایک کثیر تعداد نقل مکانی کر کے یہاں آتی ہے۔ مر وہ اس جھیل کی خوبصورتی و دلکشی میں اضافے کا باعث بنتی ہیں۔

سحر انگیز نظاروں سے بھرپور یہ ایسا علاقہ ہے جس کی خوبصورتی سیاحوں کو کھینچ لاتی ہے۔ یہاں کئی خوبصورت نظارے چھپے ہوئے اور عموماً نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ ان سے واقف ہونے کی خاطر آپ کو مقامی گائیڈ کی خدمات حاصل کرنا پڑتی ہے۔ اس جھیل کے قریب ہی وہ مقام ہے جہاں سینکڑوں مجاہدین کو شہید کیا گیا تھا۔ اس مقام کو ''پوربی ناز'' کا نام دیا جاتا ہے۔

ذرائع نقل و حمل بہتر نہ ہونے سے سیاحوں کی کم تعداد اس درے کا رُخ کرتی ہے۔ اگر درۂ بابوسر کو سیاحتی حوالے سے اہمیت دی جائے تو نہ صرف سیاحوں کی بڑی تعداد ادھر کا رُخ کرے گی بلکہ لوگوں کو روزگار بھی مہیا ہوگا۔ یوں مجموعی طور پر قومی ملکی معیشت ترقی کرے گی۔ ◆◆◆

بلیک فرائی ڈے

معاشرے کے بدلتے رجحانات کی عکاسی کرتی تحریر

ہاجرہ رضا

صبح بیدار ہوئی تو اپنے سامنے ایک انجان وجود کو دیکھ کر خوف زدہ ہوگئی۔ خوف کے مارے سانس تیز ہوگئی۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ بستر سے چھلانگ لگا کر کمرے سے بھاگ جانے کا ارادہ کیا۔ عمل درآمد کرنے کے لیے بیڈ سے چھلانگ لگا دی۔ قدم اُٹھایا ہی تھا کہ ایک گرج دار آواز نے ہلنے نہیں دیا۔

خبردار! کہیں نہیں جاسکتیں۔ تم ہمیشہ مجھ سے فرار اختیار کرتی آئی ہو لیکن آج میں تمہیں کہیں بھی جانے نہیں دوں گا۔ جب تک تم میرے تمام سوالوں کے جواب مجھے نہیں دے دیتیں میں تمہیں اس جگہ سے ہلنے نہیں دوں گا۔

میں نے اُسے اللہ کے واسطے دینا شروع کیے مجھے جانے دو میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ میں تو تمہیں جانتی بھی نہیں۔ تم کون ہو؟ تمہارا نام کیا ہے؟ تم یہاں کیسے آئے؟ میرا تعارف سن کر تم رفوچکر ہو جاؤ گی۔ پہلے تم میرے سوالوں کے جواب دو پھر میں اپنا تعارف کرواؤں گا۔ اب سکون سے بیٹھ جاؤ۔

میں ڈرتی کانپتی بیڈ پر بیٹھ گئی اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

''کیا تم جانتی ہو یہ کائنات کس کے لیے بنائی

گئی ہے؟ آسمان کا شامیانہ لگایا گیا۔ زمین کا فرش بچھایا گیا۔ موسم بدل کر، سورج چمک کر، بادل برس کر کس کو فائدہ پہنچا رہے ہیں؟ وجود نے سوال کیا۔

میں ہمت کرتے ہوئے گویا ہوئی۔ ''ظاہری بات ہے انسان کو فائدہ پہنچا رہے ہیں۔ کائنات انسان کے لیے ہی بنی ہے''۔

جواب سنتے ہی اگلا سوال کیا گیا۔ ''انسان کا مرکز کیا ہے؟''

کچھ سوچتے ہوئے میں نے جواب دیا۔ انسان کا مرکز روح ہے۔

''کچھ وضاحت کریں گی آپ؟''

میں تقریری دلائل اپنے ذہن میں لائی اور اپنے مد مقابل کو چت کرنے کی غرض سے گویا ہوئی۔ انسان کے جسم سے اگر روح نکل جائے تو وہ وجود ناکارہ ہو جاتا ہے۔ خواہ وہ جسم کسی ڈاکٹر، انجینئر، وکیل یا کسی ملک کے وزیرِ اعظم کا ہی کیوں نہ ہو۔ چار کندھوں پر اُٹھا کر اُسے سپردِ خاک کر دیا جاتا ہے۔

میرا مد مقابل قائل ہو گیا تھا یا نہیں۔ اس کے ردعمل سے میں جان نہیں پائی۔ اس کی مسکراہٹ معنی خیز تھی۔ اب وہ خاموش تھا۔ یہ وقفہ مجھے چبھ رہا تھا۔ وقفہ بدستور جاری تھا۔ اگلا سوال ابھی تک نہیں کیا گیا تھا۔ در حقیقت میں ان سوالوں سے محظوظ ہو رہی تھی۔

''کل تمہاری نوکرانی کی بیٹی کی شادی تھی۔'' سوال کچھ غیر متوقع تھا۔ میں کسی فلسفیانہ سوال کے انتظار میں تھی۔ جس پر میں دلیلیں قائم کر سکتی۔ میں نے مایوسی سے کہا

''ہاں''۔

''کل سارا دن تم نے کیا کیا؟'' وجود نے پوچھا۔

مجھے اس سے باتیں کرنا اچھا لگ رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے کا خوف یکسر غائب ہو گیا تھا۔

''کل سارا دن شاپنگ کی تھی۔ بہت تھک گئی تھی۔ ہر جگہ سیل لگی تھی۔ کل بلیک فرائی ڈے تھا نا۔'' میں نے تفصیل سے جواب دیا۔

''یہ بلیک فرائی ڈے کیا ہوتا ہے؟'' وجود نے سوال کیا۔

میں نے پُر جوش انداز میں بتانا شروع کیا۔ ''۲۴ نومبر کو ہر دکان پر سیل لگتی ہے۔ چیزوں کی قیمتیں کم کر دی جاتی ہیں۔ برانڈ کی دکانوں پر بھی قیمت کم کی جاتی ہے۔''

''پھر تو اسے گولڈن فرائی ڈے کہنا چاہیے۔'' وجود نے کہا۔

''اسے بلیک فرائی ڈے کیوں کہتے ہیں؟'' ذرا گوگل تو کرو؟ یہ سن کر میں سوچ میں پڑ گئی۔ مجھے اس کیفیت میں دیکھ کر وجود نے راہ دکھائی۔

میں نے بیڈ پر پڑے موبائل کو اُٹھایا اور (History of Black Friday) کو گوگل پر سرچ کیا۔ میرے سامنے جو معلومات آئیں میں انھیں بغور پڑھ رہی تھی۔

۲۴ ستمبر کا واقعہ ہے، جب نیو یارک کی گولڈ مارکیٹ کو برباد کرنے کی سازش کی گئی۔ سازش کرنے والے دو ساتھی Jay Gould ,James Fisk تھے۔ ان دونوں نے زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کی غرض سے مارکیٹ سے سونا اُٹھا لیا۔ اس خریداری کے نتیجے میں مارکیٹ تباہی کے دہانے پر تھی۔ امریکی صدر Ulysses.S Grant نے نازک صورتحال سے نمٹنے کے لیے چار ملین ڈالر سونے کی منڈی میں فراہم کرنے کا حکم جاری کیا۔ اس حکم نے امریکی معیشت کو بڑی تباہی سے بچا لیا۔

یہ دن جمعہ مبارک کا تھا اور پہلی مرتبہ بلیک فرائی ڈے کہا گیا۔ یہ دن منافع خوروں کے خلاف احتجاج کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اس نام کو تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی پر کوئی بھی نیا نام عوام میں مقبول نہ ہو سکا۔

''تم نے کیا خریدا؟''

''میں نے بیگز، جوتے اور کچھ کپڑے خریدے۔'' یہ

کہتے ہوئے شاپنگ بیگز اس کے سامنے رکھ دیے۔ ممی نے بھی چیزیں خریدی تھیں وہ ان کے کمرے میں ہیں۔'' میں نے اسے آگاہ کیا۔

اس نے میری شاپنگ دیکھنے میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ مجھے مایوسی ہوئی۔ جس خریداری پر میں نے اتنا وقت لگایا تھا۔ وجود نے اس پر ایک نظر ڈالنا بھی پسند نہ کیا۔

اب وہ میری الماری کھول رہا تھا۔ ایک ایک کر کے الماری کے دروازے میرے سامنے کھلتے چلے گئے۔ مجھے اپنے کپڑے، بیگز، جوتے اور الماری میں رکھی ہر چیز ایک ساتھ نظر آ رہی تھی۔ وجود نے ایک شرٹ نکال کر میرے سامنے کی۔ ''یہ قمیص کتنی بار پہنی ہے تم نے؟''

میں نے ذہن پر زور دیا۔ یاد کرنے کی کوشش کی۔

''یہی کوئی تین چار مرتبہ۔'' اس طرح اس نے دو تین قمیصیں نکال کر اپنے سوال کو دہرایا۔ میں کچھ سوچ کر اسے جواب دیتی گئی۔ کوئی بھی کپڑا ایسا نہیں تھا جسے میں دسویں بار پہن چکی ہوں۔ ایک بیگ اُٹھا کر وجود نے کہا۔ ''یہ تو بالکل نیا ہے۔''

میں نے جواب دیا ''میں نے یہ بیگ استعمال نہیں کیا۔''

''تم پھر دو بیگ لے آئی ہو؟'' وجود نے کہا۔

''وہ تو سیل لگی ہوئی تھی۔'' میں نے توجیہہ دی۔

پھر اس نے میرے لائے ہوئے جوتوں پر ایک نظر ڈالی۔ اس کے بعد جوتے کا ایک ڈبہ میری الماری سے نکالا اور اس پر لکھا ہوا نام باآواز بلند پڑھا۔ اس کے بعد میری طرف پشت کیے اس نے الماری میں موجود ہر چیز کے نام پڑھنا شروع کیے۔ اس فہرست میں بہت سے ملکی اور غیر ملکی برانڈ کے نام شامل تھے۔ ''تم نے کوئی بھی چیز کسی عام دکان سے نہیں خریدی۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟''

''اس بات پر تو مجھے فخر ہے کہ میں برانڈڈ چیزیں استعمال کرتی ہوں۔'' میں نے اکڑی ہوئی گردن کے ساتھ جواب دیا۔ ابھی کچھ اور کہتی اس نے میری تنی ہوئی گردن دیکھ کر کہا، ''اکڑی ہوئی چیز جلد ٹوٹ جاتی ہے۔''

''کل کتنے پیسے خرچ کیے؟''

میں نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ ''مجھے نہیں معلوم۔ بل کریڈٹ کارڈ سے ادا کیا تھا۔'' مجھے خود بھی بل دیکھنے کا شوق ہوا۔ میں نے بیگ کھول کر بل تلاش کیا۔ بیگ کھولتے ہی بیگ میں رکھے برگر پر نظر پڑی جو کل کھانا کھانے کے دوران بچ گیا تھا۔ میں نے اسے بیگ میں ہی رکھ لیا تھا۔

میرے ہاتھ میں برگر دیکھ کر وجود نے پوچھا۔ ''خراب ہو گیا؟'' میں نے برگر کھولا۔ سردی کی وجہ سے برگر ٹھیک تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ وجود نے کہا ''شکر ہے۔''

وجود کی سوئی بل پر ہی اٹکی تھی۔ ''بل کتنا تھا؟'' میں نے اپنے سارے بل جمع کرتے ہوئے رقم بتائی۔ بل بناتے ہوئے ایک لمحے کو رکی۔ چونکہ رقم میری توقع سے زیادہ تھی۔ سیل ہونے کے باوجود بل اٹھارہ ہزار سے کچھ زیادہ بنا تھا۔

مجھے اس وقت ٹشو کی ضرورت تھی۔ آنسو صاف کرنے کے لیے نہیں بلکہ کل سے ہونے والے زکام کی وجہ سے۔

حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ

☆ جو سچائی جھوٹ کے مشابہ ہو، اسے اختیار نہ کرو۔
☆ خوف گناہوں سے بچاتا ہے۔
☆ سچائی کو کبھی نہ چھپاؤ۔
☆ کبھی تنگ نہ کرنا کسی بے گناہ کو۔
☆ جھوٹ رزق کو کھا جاتا ہے۔
☆ طمانیت قلب چاہتے ہو تو حسد سے دور رہو۔

اچھی بھلی تھی میں۔ کل زمین پر بیٹھ بیٹھ کر زکام ہو گیا۔ میں نے خود کلامی کی۔ ٹشو تلاش کرتے ہوئے میں نے عادتاً ثریا کو آواز دی۔ ثریا میری نوکرانی کی بیٹی ہے۔ جس کی کل شادی تھی۔ ٹشو کا ڈبہ میری طرف بڑھاتے ہوئے وجود نے پوچھا۔ ''زمین پر کیوں بیٹھی تھیں؟''

''رش بہت تھا۔ ہم نے بہت سے کپڑے چیزیں اُٹھا لی تھیں تاکہ کوئی دوسرا نہ اُٹھالے۔ خواتین کی دیکھا دیکھی ہم بھی زمین پر بیٹھ گئے اور اپنا سامان منتخب کرنے لگے''۔

''صحیح کہتے ہیں عورت ناقص العقل ہوتی ہے۔'' وجود نے تبصرہ کیا۔ میں ابھی غصے کا اظہار کرتی کہ اگلا سوال داغا گیا۔

''ثریا کو شادی کا تحفہ کیا دیا؟''

'میری بہت سی چیزیں جواب میں استعمال نہیں کرتی۔''

''کوئی نئی چیز نہیں دی؟ پیسے نہیں دیے؟ تاکہ وہ اپنی مرضی سے کچھ لے سکتی۔ میں خاموش ہو گئی کیونکہ میرے علم میں نہیں تھا کہ ممی نے اسے کچھ دیا ہے یا نہیں۔ مجھے ثریا یاد آ گئی۔

پچھلے کئی برس سے وہ میرے سارے کام خاموشی سے کرتی آئی تھی۔ چار دن سے وہ مجھے نظر نہیں آئی تھی۔ اس کے ہوتے ہوئے میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں اسے اتنا یاد کروں گی۔ وہ چپ چاپ میرے اور گھر کے ہر فرد کے کام کرتی تھی۔ وجود کی موجودگی کو یکسر فراموش کر کے اب میں ثریا کے بارے میں سوچتی چلی گئی۔ نادم و پشیمان ہوتی گئی۔ میں نے اس خاموش مددگار کے لیے ایک تحفہ بھی نہ خریدا۔ اس کی شادی میں جانے کا خیال بھی مجھے نہیں آیا۔

اٹھارہ ہزار ایک دن میں خرچ کر دیے۔ ثریا اور اس کی ماں کو ہمارے گھر سے ملنے والی اجرت اٹھارہ ہزار سے کافی کم تھی۔ احساسِ ندامت کہوں یا احساسِ جرم، جو بھی تھا مجھے دکھ دے رہا تھا۔ میری سوچوں کا سلسلہ موبائل پر آنے والے میسج کی آواز سے ٹوٹ گیا۔ میں نے سر اُٹھایا تو کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ ابھی میں جس سے بات چیت میں مصروف تھی وہ کہاں گیا۔ میں ڈر گئی۔ بالکل ویسا ہی خوف طاری ہوا جیسے اچانک اس کی آمد سے مجھ پر طاری ہوا تھا۔ انسان بھی کیا چیز ہے۔ جن چیزوں سے خوف کھاتا ہے کچھ ہی دیر میں ان چیزوں سے ایسا مانوس ہو جاتا ہے کہ ان کی غیر موجودگی اچھی نہیں لگتی۔

میں وجود کو تلاش کرنے کمرے سے باہر نکلی۔ لاؤنج میں دیکھا۔ ہر جگہ اسے تلاش کیا پر وہ کہیں نہیں تھا۔ گیٹ تک گئی پر وہاں کوئی نہیں تھا۔ ممی سے پوچھا ''کوئی آیا تھا؟''

انھوں نے جواب دیا ''نہیں بیٹا کوئی نہیں آیا تھا۔'' ممی مجھے کہہ رہی تھیں۔ اُٹھ گئی ہو تو اب ناشتا کر لو۔ ثریا کی ماں کو بتا دو جو کھانا ہے۔ ثریا ہی تمہارا ناشتا بناتی تھی۔ اسے تو تمہاری پسند کا پتا تھا۔ اس کی ماں بھی سیکھ جائے گی۔ صبح سے دس مرتبہ میں ثریا کو آواز دے چکی ہوں۔

اس کی ماں سے کہا ہے میں نے کہ، ثریا کے شوہر سے پوچھ لو۔ اگر وہ اجازت دے تو ثریا پھر سے آنا شروع ہو جائے۔ مجھے ثریا کی عادت بہت پسند ہے۔ چپ کر کے سارا کام کرتی ہے۔ اپنی ماں کی طرح ہزار سوال نہیں کرتی۔

مجھے سوچوں میں گم دیکھ کر ممی نے پوچھا ''تمہیں کیا ہوا ہے؟''

میں نے پھر ممی سے کہا ''کوئی تو آیا ہوگا؟''

ممی مجھے حیرت سے تک رہی تھیں۔ میں نے چند قدم اُٹھائے پھر ٹھٹک کر ٹھہر گئی۔ آواز کو میں پہچان سکتی تھی۔ کہا جا رہا تھا۔

''تم نے مجھے بہت تھپک تھپک کر سلایا تھا۔ پر اب میں بیدار ہو گیا ہوں۔ اب میں تمہیں کسی ثریا کی شادی پر سکون و اطمینان سے بلیک فرائی ڈے منانے نہیں دوں گا۔'' •••

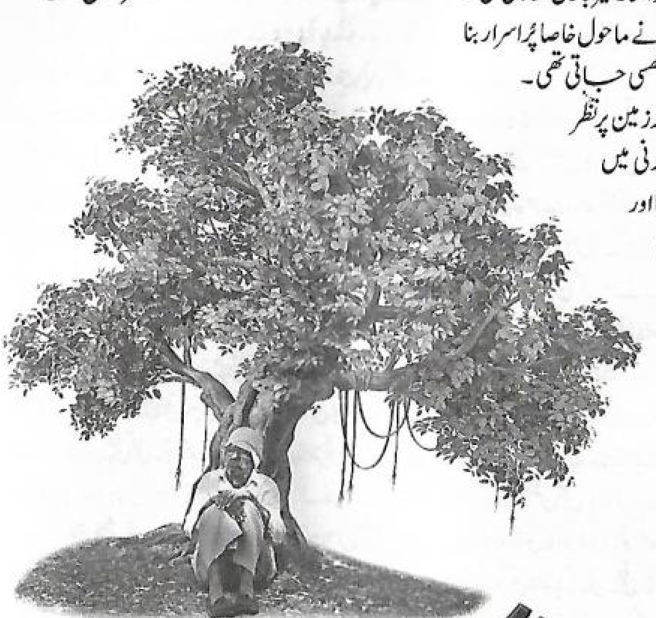

برگد

ڈاکٹر خلیل مبین

والدین اولاد کو قربانیاں دے کر پروان چڑھائیں، تو اولاد کا بھی فرض ہے کہ وہ ان کے لیے گھنی و ٹھنڈی چھاؤں بن جائے

رات کا گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ تیز بارش ہو رہی تھی۔ بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گرج نے ماحول خاصا پُراسرار بنا دیا تھا۔ سخت سردی ہڈیوں میں گھسی جاتی تھی۔

بادلوں کے چھٹ جانے پہ چاند زمین پر نظر ڈالتا تو برگد کا ایک درخت چاندنی میں کسی بوڑھے کے مانند بھیگتا اور کپکپاتا دکھائی دیتا۔ اس کی داڑھی زمین کو چھو رہی تھی۔ اس نے ساری زندگی انسانوں کو سایہ فراہم کیا تھا مگر اب وہ تھکا تھکا سا نظر آتا۔

☆☆☆

سرکاری کینسر اسپتال میں داخل بستر نمبر تین پر لیٹے نور محمد کو پھر کھانسی کا دورہ پڑا۔ وہ پھیپھڑوں کے سرطان میں مبتلا تھے۔ پچھلے کئی ہفتوں سے کوئی انھیں ملنے نہیں آیا تھا۔ بستر نمبر آٹھ پر لیٹے مریض نظام الدین کے بیٹے نے نرس کی منت سماجت کی تب وہ نور محمد کو دیکھنے آئی۔ انجکشن لگنے پر نور محمد کو قدرے آرام ملا۔ وہ نظام الدین کے بیٹے کی طرف پر تشکر نظروں سے دیکھنے لگے۔

وارڈ دورے کے دوران انچارج ڈاکٹر سلیم کو نرس نے بتایا کہ لواحقین نے نور محمد کو داخل کروانے کے بعد دوبارہ اسپتال کا رخ نہیں کیا۔ فون نمبر اور پتا بھی غلط لکھوایا۔ ڈاکٹر نرس سے بولا ''علاج شروع کرنے سے پہلے کچھ مزید ٹیسٹ کروانا ضروری ہیں ورنہ اس کا سرطان پھیل جائے گا۔''

''سر یہ مریض تنہا اور غریب ہے۔ رقم کے لیے زکوٰۃ سے انتظام کیا جا سکتا ہے مگر اس میں بھی شناختی کارڈ کی ضرورت ہوتی ہے۔ بابا کے پاس نہ شناختی کارڈ ہے اور نہ ہی وہ کچھ بتاتا ہے۔'' نرس بولی۔

نور محمد کمبل اوڑھے لیٹے سوچ رہے تھے ''میری بیماری تو

بڑھ گئی ہوگی۔ جس طرح برگد کا درخت دوسروں کو آرام پہنچاتا ہے اسی طرح میں نے بھی زندگی بھر سبھی کو سکون پہنچانے کی کوشش کی مگر آخری وقت کوئی میرے کام نہ آیا۔“

وہ سوچوں میں گم تھے کہ کسی نے ان کے پیر پر ہاتھ رکھ دیا۔ منہ سے چادر ہٹا کر دیکھا کہ نظام الدین کی چار سالہ پوتی سلمٰی سگریٹ کے خالی پیکٹوں سے بنا کھلونا ٹرک ہاتھ میں لیے کھڑی تھی جس میں کولڈ ڈرنک کے ڈھکنے والے پہیے لگائے گئے تھے۔

”یہ لو بابا! میں تمھارے لیے لائی ہوں۔“ ننھی بولی۔

نور محمد نے پیار سے اس کی طرف دیکھا اور اُسے کچھ پیسے دینے کی خاطر تکیے کے نیچے پیسے ٹٹولنے لگے مگر وہاں کچھ ہوتا، تو نکلتا۔ انھوں نے نگاہیں نیچی کرلیں۔ ننھی سلمٰی بھاگ کر اپنے دادا کے پاس چلی گئی۔ نور محمد نے نظام کے بستر کی طرف دیکھا اور سوچا:

”کتنا خوش نصیب ہے نظامو۔ ہر وقت اس کے پاس تیماردار موجود ہوتے ہیں۔“ وہ حسرت و یاس میں ڈوب گئے۔ ”مگر نہیں“ ان کے دماغ میں ایک دم آیا۔ ”میری تیمارداری کے لیے بھی میرے خاندان والے جمع ہیں۔“

انھوں نے بستر کے نیچے بلی کے بچوں کو کھیلتے دیکھا جو میاؤں میاؤں کرتے ادھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ زیادہ شرارت کرنے پر ماں مارتی تو وہ اس کے پاس دبک جاتے۔ انھوں نے پھر بستر پر رینگتے کھٹملوں کو دیکھا۔ تنہائی کا مارا بدنصیب بوڑھا حیوانوں اور کیڑے مکوڑوں کو ہی اپنا ہمدرد سمجھنے لگا تھا۔ سچ ہے، دوسروں کی بے اعتنائی کا احساس کسی بھی انسان کو نیم پاگل بنا سکتا ہے۔

☆☆☆

نور محمد کو نیند نہیں آرہی تھی۔ انھوں نے سلمٰی کا دیا ہوا ٹرک نکالا اور اس کے پہیے گھمانے لگے۔ انھیں گھماتے گھماتے گویا وہ ٹائم مشین میں بیٹھ کر برسوں پیچھے چلے گئے۔ تب ان کی زندگی سکون سے گزر رہی تھی۔ وہ اپنے کنبے کا بہت خیال رکھتے۔ اچھے سے اچھا کھانا پینا۔ کپڑے سال میں تین دفعہ بنائے جاتے۔ بیوی بچوں کی ذرا سی تکلیف پر وہ تڑپ جاتے۔

ریٹائرمنٹ پر ملی رقم سے انھوں نے اپنے بیٹے آفتاب کو اچھے مستقبل کی غرض سے اعلیٰ تعلیم دلانے یورپ بھیج دیا۔ کچھ عرصے بعد آفتاب نے وہاں شادی کرلی۔ پیسا بھیجنا تو درکنار اس نے گھر والوں کی خبر تک نہ لی۔ بیوی کے سرطان کا علاج کروانے کے لیے انھوں نے ملنے جلنے والوں سے رقم ادھار لی۔ سوچا تھا کہ بیٹا رقم بھجوائے گا تو وہ واپس کردیں گے۔

مگر کوئی رقم نہ آئی۔ بیوی کا انتقال ہوگیا اور وہ اکیلے رہ گئے۔ کئی دفعہ بیٹے سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوسکے۔ پنشن بھی پابندی سے نہیں ملتی تھی۔ جب لوگوں نے ادھار واپسی کا تقاضا کیا تو انھوں نے ملنے جلنے والوں سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ کئی ماہ سے کرایہ نہ دینے کے باعث مالک مکان نے ایک دن انھیں گھر خالی کرنے کا کہہ دیا۔

دوسرے بیٹے مہتاب کے آوارہ دوستوں نے اسے کہیں کا نہ چھوڑا تھا۔ وہ نشہ کرنے لگا۔ کئی سالوں سے اس کی بھی کچھ خبر نہ تھی۔ تنہائی اور اندھیرا اب بھی دونوں ان کے ساتھی تھے۔

وہ کچھ عرصہ رشتہ داروں کے گھر رہتے رہے۔ پھر مسلسل کھانسی کی وجہ سے انھیں خیراتی اسپتال میں داخل کروادیا گیا۔ بعدازاں ان لوگوں نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ رشتہ داروں نے اسپتال میں اپنا پتا بھی غلط لکھوایا تھا۔

☆☆☆

”تیاری مکمل ہے؟“ ڈاکٹر اسلم نے نرس سے پوچھا۔

”جی سر“ نرس نے جواب دیا ”میں نے خاکروب، وارڈ بوائے اور مالی سے کہہ دیا ہے۔ وہ دس پندرہ رشتے داروں کو

لے آئیں گے۔ ان کے ساتھ تیماردار بھی ہوں گے۔“

”خیال رکھیں، وزیراعظم کا دورہ ہے۔ کوئی گڑبڑ نہ ہو اور ہاں، صفائی کا خاص خیال رکھیے گا۔“ ڈاکٹر صاحب بولے۔

”آپ فکر نہ کریں سر، کام پکا ہوگا۔“ نرس نے جواب دیا۔

”کیا مریضوں کو این۔ جی۔ او کی طرف سے دیے گئے ٹیکے لگا دیے گئے ہیں؟“ ڈاکٹر اسلم نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

”جی سر“ نرس نے مسکرا کے جواب دیا۔

”مریض کو پتا بھی نہیں چلتا کہ اسے اصل دوا کی جگہ گلوکوز کا انجکشن لگا دیا گیا ہے۔“ نرس فخر سے بولی۔ ”نظام الدین کے گھر والے بڑے کائیاں بنتے ہیں۔ میں ان کی آنکھوں میں بھی دھول جھونک دیتی ہوں۔“

ڈاکٹر صاحب نے نرس کو ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا ”یہاں مریض قسمت ہی سے ٹھیک ہوتے ہیں۔“

”سر میرے لڑکے نور محمد کے بیٹے بن کر ساتھ بیٹھ جائیں گے۔“ نرس بولی۔ ”میں نے انھیں سمجھا دیا کہ پوچھنے پر انھیں وزیراعظم سے کیا کہنا ہے؟“ نرس نے پھر لڑکوں سے کہا ”ڈاکٹر صاحب کو سبق سناؤ۔“

”سر یہاں مریضوں کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔ ہمارے ابا کی طبیعت پہلے سے بہتر ہے۔ دوا اور کھانا وقت پر دیے جاتے ہیں۔ صفائی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔“ لڑکے طوطوں کی طرح بولنے لگے۔

”شاباش نرس۔“ ڈاکٹر اسلم مسکرائے۔

☆☆☆

رات کو نور محمد نے ٹرک کے پہیے گھمائے، تو پھر یادوں کی پٹاری کھل گئی اور وہ ماضی میں پہنچ گئے۔

رات کے بارہ بج رہے تھے۔ ”نور محمد اٹھو“ بیوی کی گھبرائی آواز آئی۔ ”دیکھو آفتاب کی سانس کتنی زور سے چل رہی ہے۔ رنگ بھی نیلا پڑ رہا ہے۔“

نور محمد نے اٹھ کر جگر گوشے کو دیکھا تو لگا کہ ان کا رنگ بھی نیلا ہوگیا۔ وہ گھبرا کے باہر بھاگے اور پڑوس کا دروازہ پیٹنے لگے۔ پڑوسی شہریار آنکھیں ملتا ہوا باہر آیا۔

”کیا ہوا چاچا؟ خیریت تو ہے!“ اس نے پوچھا۔

”بیٹا......وہ......میرے بچے کی طبیعت بہت خراب ہے۔ جلدی سے موٹر سائیکل نکالو۔ ڈاکٹر کے پاس چلنا ہے۔“ نور محمد گھبرائے ہوئے تھے۔

”چاچا پریشان نہ ہوں، اللہ خیر کرے گا۔“ شہریار نے انھیں تسلی دی۔ نور محمد آن واحد میں آفتاب کو کمبل میں لپیٹ گود میں لیے باہر آئے۔ منٹوں میں وہ بستی کے مشہور ڈاکٹر قطب الدین کے کلینک پہنچ گئے۔ وہاں مریضوں کا ہر وقت ہجوم رہتا۔ بستی والوں کے مطابق اللہ نے اس کے ہاتھ میں شفا رکھی تھی۔ اس وقت بھی مطب میں مریض موجود تھے۔

”ڈاکٹر صاحب......ڈاکٹر صاحب!“ نور محمد گھبراتے ہوئے بولے ”میرا بچہ بہت بیمار ہے۔ پہلے اس کو دیکھ لیں۔“

قطب الدین دوسرے مریضوں کو چھوڑ کر بچے کا معائنہ کرنے لگا۔ نور محمد کو تسلی دی۔ بچے کو آکسیجن لگائی اور انجکشن دیا۔ نور محمد گھبراہٹ میں بغیر جوتی اور جرسی پہنے ڈاکٹر کے پاس چلے آئے تھے۔ کچھ دیر بعد آفتاب کی طبیعت بہتر ہوئی تو وہ اُسے گھر لے آئے۔ نور محمد اور بیوی نے سکھ کا سانس لیا۔ اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے شہریار کے بھی احسان مند ہوئے۔ اگلے روز نور محمد نمونیا کا شکار ہوگئے مگر انھیں اپنی پروا نہیں تھی۔ وہ مطمئن تھے کہ ان کا بچہ صحت یاب ہوگیا۔

☆☆☆

اچانک وارڈ میں کھلبلی مچ گئی۔ نظام الدین کے سینے میں شدید درد اُٹھا تھا۔ وہ درد سے تڑپنے لگا۔ بیٹا دوڑتا ہوا ڈاکٹر کو

بلانے گیا۔ ڈاکٹر بڑبڑاتا اور آنکھیں ملتا ہوا آیا:

''کیا ہوگیا ہے۔ تم لوگ سکون سے سونے بھی نہیں دیتے۔'' وہ غصے سے بولا۔

''ڈاکٹر صاحب، ابا کے سینے میں شدید درد ہو رہا ہے۔'' نظام الدین کے بیٹے نے گھبراتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر نے نبض دیکھی، سینے پہ اسٹیتھو اسکوپ لگایا اور بولا ''انھیں دل کے اسپتال لے جاؤ۔ لگتا ہے دل کا دورہ پڑا ہے۔''

ڈاکٹر نے ایمبولنس منگوانے کے لیے فون گھما دیا۔ نظامو کے گھر والے رونے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ایمبولنس آ گئی۔ مریض کو دل کے اسپتال منتقل کر دیا گیا۔ نور محمد نے نظامو کی صحت کے واسطے دعا مانگنے کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ وہ بھی پریشان ہوگیا تھا۔

صبح وارڈ بوائے نے نور محمد کو نظام الدین کے انتقال کی اطلاع دی۔ انھیں لگا جیسے کسی نے ان کا دل آہنی پنجے میں دبا دیا ہو۔ ''نظام الدین تو صحت یاب ہو رہا تھا۔ یا اللہ یہ کیا ہوگیا؟'' انھوں نے اپنے آپ سے کہا اور رونے لگے۔

☆☆☆

عرس کا تیسرا دن تھا۔ لوگ مزار پہ منتیں ماننے اور چڑھاوے چڑھانے آئے ہوئے تھے۔ ''تاجدار حرم۔ ہو نگاہ کرم''...... محفل سماع زوروں پر تھی۔ لوگوں کا جم غفیر تھا اور کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔

''ماسی، کتنی تھیلیاں باقی رہ گئی ہیں؟'' ایک آدمی نے پوچھا

''صاحب جی، پانچ چھ ہوں گی۔'' ماسی نے ٹوکرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بیگم! جلدی بانٹو، رش بہت ہوگیا ہے۔'' آدمی نے بیوی سے کہا۔

''یہ لو بابا...... یہ لو بیٹا...... یہ لو اماں۔'' آدمی کہتا جاتا۔

''بیگم صاحبہ یہ آخری تھیلی ہے۔'' ماسی بولی

عورت نے وہ تھیلی گردن جھکائے ایک بوڑھے کو دی اور اپنے شوہر سے بولی ''آفتاب، چاول کی تھیلیاں ختم ہوگئی ہیں۔ جلدی واپس چلیں۔ رش بہت ہے۔ میرا ہاتھ پکڑ لیں۔''

بوڑھے کے بے ترتیب اور مٹی سے اَٹے بالوں نے اس کا چہرہ ڈھانپ لیا تھا۔ بے ہنگم ڈاڑھی سینے تک بڑھ گئی تھی۔ آفتاب کا نام سن کر دل زور سے دھڑکا۔ اس نے سر اٹھا کے واپس جاتے جوڑے کو دیکھا۔ بچے کھچے آنسو نیم وا آنکھوں سے نکلے اور گالوں کے پیالوں میں گم ہو گئے۔ اسے لگا وہ نماز پڑھ کے عیدگاہ سے باہر نکل رہا ہے۔ ننھے آفتاب کو اس نے کندھوں پر اُٹھایا ہوا ہے کہ کہیں وہ ہجوم میں گم نہ ہو جائے۔

یہ بوڑھا نور محمد تھا۔ نظام الدین کی موت کے بعد جب سرکاری اسپتال میں اس کا کوئی والی وارث نہ رہا، تو وہ ایک رات چپکے سے یہاں چلا آیا۔ اب یہ مزار ہی اس کی جائے پناہ تھا جہاں اُسے کھانا بھی مل جاتا اور کوئی ڈانٹ ڈپٹ نہ کرتا۔

اب وہ اپنے بیٹے کو پہچان تو گیا مگر غیرت نے اُسے نافرمان بیٹے کا دامن پکڑنے سے باز رکھا۔ پدرانہ شفقت کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ ضرور بول اٹھا: ''سنبھل کے جانا بیٹا۔'' جذبات نے بوڑھے کو اتنا مغلوب کر دیا کہ اُسے اپنے دل کی دھڑکن مدہم ہوتی محسوس ہوئی۔ دھیرے دھیرے اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔

☆☆☆

بستی میں آئے شدید طوفان باد و باراں نے برگد کو بھی زمین بوس کر دیا۔ پرندے دوسرے آشیانے کی تلاش میں برگد کو تنہا چھوڑ گئے۔ کچھ دیر تک تو اس کی شاخیں سیلابی پانی کے اُوپر یوں نظر آتی رہیں جیسے وہ مدد کے لیے چیخ رہا ہو پھر سیلاب نے اُسے بھی اپنے دامن میں چھپا لیا۔ ●●●

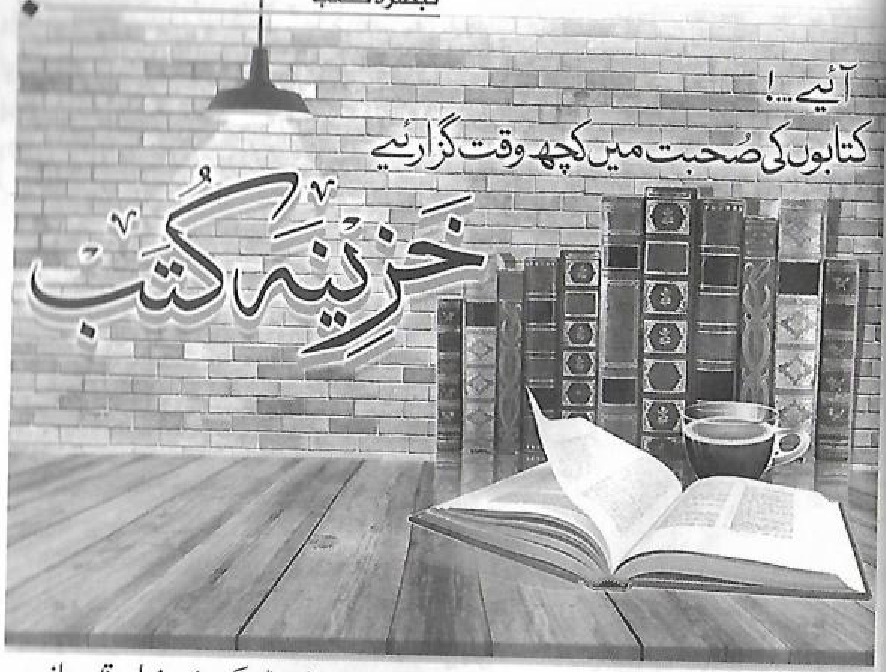

نام کتاب: دیدِ اُمید کا موسم۔ مصنف، میاں محمد آصف۔ ناشر: باب حرم پبلی کیشنز، بلاک ایکس، نیو سیٹلائٹ ٹاؤن، سرگودھا۔ فون نمبر: ۲۲۲۶۶۶-۳-۰۴۸۔ قیمت: ۵۰۰ روپے۔

حج دین اسلام کا ایک اہم رکن ہے جس کے ذریعے مسلمان اللہ تعالیٰ کے گھر، خانہ کعبہ حاضری دیتے اور عبادت الٰہی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ جو مسلم عاقل و بالغ ہو اور اس کے پاس سفر کا خرچ موجود ہو، تو اُس پر حج فرض ہو جاتا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب حج کا سفرنامہ ہے۔

جناب میاں محمد آصف اعلیٰ پولیس آفیسر رہے ہیں۔ انھوں نے بڑے جذبے اور روحانی کیفیت میں یہ سفرنامہ حج لکھا ہے۔ وقتاً فوقتاً حج کرنے کا طریقہ بھی بڑے سہل انداز میں بتایا ہے۔ ان مفید معلومات نے سفرنامے کو چار چاند لگا دیے ہیں۔

سفرنامہ حج لکھنا بڑا کٹھن کام ہے کیونکہ معمولی سی غلطی بھی کیے کرائے پر پانی پھیر دیتی ہے۔ تاہم مصنف نے یہ ذمے داری کامل طور پر نبھائی ہے۔ سفرنامہ پڑھ کر قاری کو کسی قسم کی تنگی کا احساس نہیں ہوتا۔ کتاب کے پانچ حصے ہیں جن میں حج سے وابستہ ہر پہلو کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

یہ کتاب عمدہ کاغذ پر طبع ہوئی ہے۔ تین سو سے زائد صفحات پہ

مشتمل کتاب کی قیمت مناسب ہے۔ چھپائی عمدہ ہے اور پیشکش بہت معیاری۔ اس بابرکت کتاب کو اپنے کتب خانے کا حصہ ضرور بنائیے۔

نام کتاب: ڈاکٹر نذیر قتل کیس۔ ترتیب: چودھری محمد یوسف ناشر: اخوان پبلی کیشنز۔ جہانگیر کالونی، کھوکھرکی، گوجرانوالہ۔ قیمت ۲۵۰ روپے۔ فون نمبر: ۰۳۳۱-۴۶۰۲۶۲۴

۱۹۷۰ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی کی پتنگ چڑھی ہوئی تھی۔ روٹی کپڑا اور مکان کے نعرے نے عوام کو اپنے جال میں پھنسا لیا تھا۔ یہی وجہ ہے، پیپلز پارٹی نے مغربی پاکستان میں بیشتر نشستیں جیت لیں۔ تاہم ضلع ڈیرہ غازی خان میں جماعت اسلامی امیدوار، ڈاکٹر نذیر احمد نے پیپلز پارٹی کے امیدوار اور مرحوم صدر، فاروق لغاری کے والد کو شکست دے دی۔

ڈاکٹر نذیر احمد ہومیو پیتھ تھے اور ضلع کے غریب لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ اسی سماجی خدمت کے بل بوتے پر وہ رکن قومی اسمبلی بننے میں کامیاب رہے۔ قومی اسمبلی میں پھر ڈاکٹر صاحب نے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی پالیسوں کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ اکثر وہ اپنے دلائل سے حکومتی وزرا کو زچ کر دیتے۔

بھٹو صاحب کی انا کسی ناقد کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ چنانچہ خیال ہے کہ ان کے اشارے پر جون ۱۹۷۲ء میں ڈاکٹر نذیر احمد کو قتل کر دیا گیا۔ زیر تبصرہ کتاب میں اسی قتل اور متعلقہ پولیس مقدمے کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

جرم و سزا کے موضوع سے دلچسپی رکھنے والے اس کتاب کو معلومات افروز پائیں گے۔ کتاب کی طباعت اور کاغذ معیاری ہے۔

نام کتاب: خراج تحسین عبدالستار ایدھی با تصویر۔ مصنف: مقصود احمد چغتائی۔ ناشر: ولید پبلشرز، ۳۹۴۔ بلاک G-4، ایم اے جوہر ٹاؤن لاہور۔ قیمت: ۲۰۰۰ (ہدیہ ایدھی فاؤنڈیشن کو جائے گا) فون نمبر: ۰۳۳۳۴۲۵۴۳۹۴

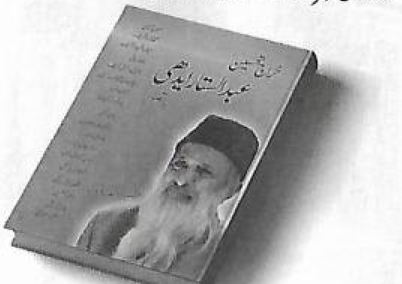

ممتاز ادیب، عالمی سیاح اور اسکاؤٹ لیڈر مقصود احمد چغتائی کی عالمی شہرت یافتہ سماجی راہنما عبدالستار ایدھی کے حوالے سے اس تصنیف میں ہمارے مسیحائے انسانیت سے گورتک کا اپنا سفر کس طرح شروع کیا سے لے کر ان کے بارے میں جن دیگر مشہور شخصیات نے قلم اُٹھا کر ایدھی بابا کو خراج تحسین پیش کیا، سب کے مضامین کو اس ایک کتاب میں یکجا کر دیا گیا ہے۔ سب سے عمدہ اور بہترین خوبی یہ ہے کہ اس کتاب کا معاوضہ اگرچہ زیادہ ہے لیکن اگر اسے معاوضے کی نظر سے نہ دیکھا جائے تو یہ ایدھی ٹرسٹ کو جانے والے معمولی سے ہدیے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس کے علاوہ اس کتاب کے مطالعے سے آپ جانیں گے کہ عبدالستار ایدھی کو نوبل انعام کیوں نہیں دیا گیا؟ ان کے صاحبزادے فیصل ایدھی کو ٹرسٹ میں چندے کے حوالے سے کن رکاوٹوں کا سامنا ہے اور ان کے تحفظات کیا ہیں؟ یہ معلوماتی کتاب ایدھی صاحب کی تصویر کے خوبصورت سرورق سے مزین ہے اور اسے یقیناً آپ کی لائبریری کا حصہ بننا چاہیے۔

نام کتاب: کشف المحجوب اور اکیسویں صدی۔ مصنف: ڈاکٹر عازم بیگ قادری۔ پبلشر: جیلانی اینڈ کمپنی، زیر مسلم مسجد بیرون لوہاری گیٹ، لاہور۔ قیمت ۷۰ روپے رابطہ: ۰۳۲۴-۴۰۰۷-۲۰۱۱

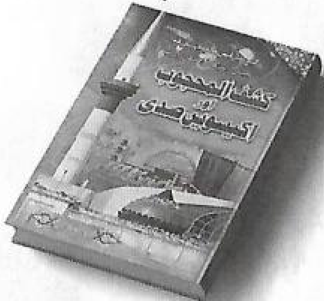

کچھ سال پہلے میں نے کشف المحجوب کا ایک اُردو زبان میں نسخہ بہت شوق سے خریدا تا کہ اس جدید دور میں بھی آسان زبان میں ایک ایسی نافع کتاب کا مطالعہ خیر کا باعث بن سکے۔ لیکن پوری کتاب پڑھ ڈالنے کے بعد بھی، بہت سے اسرار و رموز ایسے تھے جن سے پردہ اُٹھانے کے لیے غیر معمولی ذہانت اور وسیع علم کا ہونا بہت ضروری امر تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ عام علم اور احساسات و محسوسات کے حامل انسان کے لیے کشف المحجوب پڑھنا تو شاید آسان ہو مگر اس کے اندر پوشیدہ ایک جہان کو کھوجنا عام انسان کے بس کی بات ہرگز نہ تھی۔ تب مجھے ''کشف المحجوب اور اکیسویں صدی'' پڑھنے کا موقع ملا گویا میرے دل کی مراد بر آئی۔ اس مختصر مگر جامع متن کی حامل اپنے آپ میں مکمل کتاب نے جیسے کشف المحجوب کے مشکل اسرار و رموز عام فہم کر دیے۔ مصنف محمد امین عازم بیگ قادری جیسی گراں قدر اور چلتی پھرتی یونیورسٹی کا درجہ رکھنے والی شخصیت نے کشف المحجوب کی گویا نہ صرف تلخیص کر دی بلکہ اصل نسخے کی خوبصورتی کو بھی چار چاند لگا دیے۔ میری ذاتی رائے میں ہر گھر میں اس کتاب کا ہونا از حد ضروری ہے۔ خاص طور پر نوجوان نسل کے لیے بحیثیت مسلمان اور اچھا انسان بننے میں یہ کتاب بے حد نافع ہے۔

کمپیوٹر اور ذرائع ابلاغ کے اس تیز رفتار بے ہنگم دور میں اپنے دین پر قائم رہنا اور اپنے اسلاف کو پہچاننا بے حد ضروری ہے۔ لہٰذا یہ تلخیص نما کتاب حضرت عازم بیگ قادری کے لیے صدقہ جاریہ کا درجہ رکھتی ہے۔ جنہوں نے ہر عمر اور علم کے ہر درجے کے انسان کے لیے کشف المحجوب تک رسائی کو ممکن بنایا اور اس کی تعلیم کو نہ صرف بڑوں بلکہ بچوں کے لیے بھی آسان پیرائے میں منتقل کر دیا۔ اللہ جل شانہ محمد امین عازم بیگ قادری صاحب کو صاحب دین کی اس راہ پر قدم بہ قدم کامیابی و کامرانی عطا فرمائے اور وہ یونہی بنی نوع انسان کو آسانیاں بانٹتے رہیں۔ (آمین)

نام کتاب: ریڈیو پاکستان میں تیس سال۔ مصنف: انور سعید صدیقی۔ ناشر: توکل اکیڈمی، دکان نمبر ۳۱، نوشین سینٹر، نیو اردو بازار، کراچی۔ فون ۰۳۱-۳۲۲۱۷۴۷۱۔ قیمت ۷۹۵ روپے۔

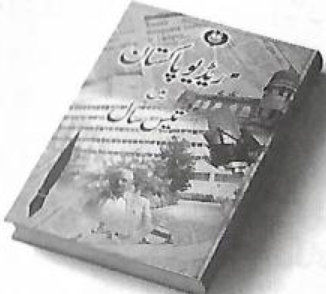

یہ دلچسپ اور رنگارنگ واقعات سے بھرپور آپ بیتی ہے جس میں ریڈیو پاکستان کی تاریخ بھی جستہ جستہ ملتی ہے۔ مصنف نے ۱۹۷۷ء میں ریڈیو پاکستان سے ناتا جوڑا اور کنٹرولر نیوز کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ تیس سالہ پیشہ ورانہ زندگی کے دوران انور سعید صدیقی صاحب جن تجربات اور واقعات سے گزرے، وہ انھوں نے اپنی اس خودنوشت میں بیان کر دیے۔

آپ بیتی کے کئی واقعات سبق آموز ہیں۔ مصنف نے ان علمی، ادبی، سیاسی شخصیات اور فنکاروں کا بھی تذکرہ کیا ہے جن سے دوران ملازمت ملاقات ہوئی۔ ان ہستیوں کے مختصر

خاکوں میں بھی دلچسپ اور پڑھنے کے لائق معلومات ملتی ہیں۔ مصنف نے بعض واقعات تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ معلومات کی فراوانی کے سبب انھیں پڑھنا بوجھل نہیں لگتا۔

جنرل مشرف کے دور میں انور سعید صاحب کو صوبہ سندھ میں شعبہ صحافت میں بدعنوانیاں پکڑنے کی مہم کا انچارج بنایا گیا تھا۔ اس مہم کی تفصیل بھی انھوں نے قلمبند کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ تب چار ہزار ''ڈمی'' اخبار بند کیے گئے۔ یعنی یہ اخبار مارکیٹ میں نہیں جاتے تھے، بس ان کی طبع شدہ چند کاپیاں صوبائی محکمہ اطلاعات کے دفتر پہنچادی جاتیں۔ ان ڈمی اخبارات کے مالکان سرکاری اداروں سے کروڑوں روپے کے اشتہار لے رہے تھے۔

اس دور کا ایک انوکھا واقعہ بھی مصنف نے لکھا ہے۔ ایک ڈمی اخبار کے مالک کہنے لگے ''میں مانتا ہوں میرا اخبار ڈمی ہے۔ لیکن میری بیٹی ایم اے فائنل میں ہے۔ اسی طرح ایک بیٹا ایم بی بی ایس کے آخری سال میں ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میرا اخبار ایک سال جاری رہے۔ یوں میرے بچوں کی تعلیم مکمل ہوجائے گی۔

انور سعید صاحب نے دریافت کیا کہ انھیں اخبار کے لیے کتنی رقم کے اشتہار ملتے ہیں؟ انھوں نے بتایا: ''محکمہ اطلاعات کی جانب سے ایک لاکھ روپے کے اشتہار ملتے ہیں۔ ستر ہزار روپے محکمہ اطلاعات کے افسروں کی جیب میں جاتے ہیں۔ تیس ہزار روپے مجھے ملتے ہیں۔''

یہ واقعہ عیاں کرتا ہے کہ اطلاعات کے صوبائی محکموں میں کرپٹ افسر کس طرح کرپشن کرتے ہیں اور اشتہاروں کی بندر بانٹ کیونکر ہوتی ہے۔ کتاب عمدہ انداز میں شائع ہوئی ہے۔ کاغذ معیاری ہے۔ گوناگوں خوبیوں کے سبب اس آپ بیتی کو اپنی لائبریری کا حصہ ضرور بنائیے۔

نام کتاب: حرمت مسلم اور مسئلہ تکفیر، تالیف: محمد یوسف ربانی، ناشر: دارالاندلس، ۴ لیک روڈ، چوبرجی لاہور، فون نمبر: ۰۰۹۱-۴۲-۳۷۲۳۰۵۴۹۔ قیمت درج نہیں۔

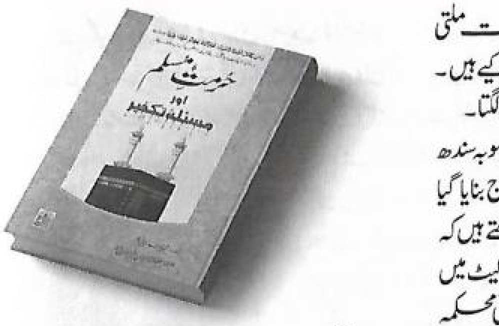

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: جس نے ایک جان کو کسی جان کے (بدلے کے) بغیر یا زمین میں فساد کیے بغیر قتل کیا تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کردیا اور جس نے اُسے زندگی بخشی تو گویا اس نے تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔ (المائدہ۔۳۲) یہ آیت واضح کرتی ہے کہ جو مسلمان کسی واضح شرعی وجہ کے بغیر کسی بھی انسان کو قتل کرے، تو یہ ایک سنگین جرم ہے اور یہ گناہ انجام دینے پر جہنم ٹھکانا بنے گی۔

بدقسمتی سے بیسویں صدی میں مخصوص مفادات کے تحت بعض علماء نے اختلاف کرنے والے مسلمانوں یا مسلم حکمرانوں کے خلاف ہتھیار اٹھانا جائز قرار دے ڈالا۔ اس روش نے جلد ہی عالم اسلام میں فتنے کی شکل اختیار کرلی جو مذہبی اصطلاح میں ''تکفیر'' کہلاتی ہے۔ تکفیر کے باعث پاکستان، عراق، یمن، صومالیہ اور دیگر اسلامی ممالک میں مسلمانوں کی باہمی لڑائیوں کے باعث ہزارہا مسلمان لقمہ اجل بن چکے۔

زیر تبصرہ کتاب میں وطن عزیز کے معروف داعی وخطیب، مولانا محمد یوسف ربانی نے عام فہم انداز میں مسئلہ تکفیر کو بیان کیا ہے۔ انھوں نے قرآن وسنت کی روشنی میں بتایا ہے کہ خون مسلم کی عظمت وحرمت کیونکر اہم ہے لہٰذا تمام مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قتال سے حتی الامکان پرہیز کرنا چاہیے۔ یہ تصنیف عام مسلمانوں کو فتنہ تکفیر کے جال میں پھنسنے سے بچاتی ہے۔

کتاب سفید کاغذ پر عمدہ انداز میں شائع ہوئی ہے۔ مسئلہ تکفیر کی تاریخ اور حیثیت سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ●●●

قارئین کے تبصروں، مشوروں اور باتوں سے سجا کالم

تصویر کا دوسرا رخ

کچھ عرصہ قبل عاصمہ جہانگیر کے زیر زمین چلے جانے کے بعد پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا میں اُن کی اتنی خوبیاں بیان کی گئیں جیسے اُن میں کوئی خامی ہی نہیں اور وہ فرشتہ تھیں حالانکہ اُن کی زندگی کا سرسری جائزہ بھی لیا جائے تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اُن کے نظریات اور ظاہری اعمال کئی حوالوں سے قابل اعتراض تھے، خصوصاً اسلام اور پاکستان کے بارے میں اُن کا نقطہ نظر! وہ تقسیم ہند کی بنیاد، دوقومی نظریے کے سخت خلاف تھیں۔ اس حوالے سے اُن کی کئی تقریریں اور تحریریں آن ریکارڈ ہیں۔

عاصمہ جہانگیر بلاشبہ جرأت مند اور بے باک خاتون تھیں۔ اپنے پروفیشن (وکالت) اور آئین وقانون کی پاسداری میں اُن کا بڑا نام تھا۔ انسانی حقوق خصوصاً عورتوں کے ضمن میں اُن کی خدمات تاریخ کا حصہ ہیں۔ تاہم یہ ساری خصوصیات یوں محل نظر ہیں کہ اُن کی اپنی مخصوص سوچ اور رائے تھی۔ وہ جھوٹ اور سچ کو اپنے معیار پر پرکھتیں۔ اُنھوں نے جابر سلطان کے سامنے وہی کلمہ حق کہا جسے وہ خود حق سمجھتی تھیں۔ حکمرانوں کو للکارنے کا بھی اُن کا اپنا انداز تھا۔

جہاں تک انسانی حقوق کا تعلق ہے، اُنھیں پاکستان میں اقلیتوں کے حقوق تو نظر آتے تھے لیکن مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں پر بھارتی فوج کے مظالم کی اُنھوں نے کبھی بھارت کا نام لے کر مذمت نہیں کی۔ توہین رسالتؐ کے مرتکب سلامت مسیح کے حق میں تو آواز اُٹھائی مگر امریکا میں بے گناہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے والی عافیہ صدیقی کے

لیے اُن کی زبان پر تالے لگے رہے۔ نہتے فلسطینیوں پر اسرائیل کے جبر وتشدد اور افغانستان پر روس کے غاصبانہ قبضے کے وقت بھی وہ خاموش رہیں۔ کیا وہاں انسانی حقوق کی خلاف ورزی نہیں ہو رہی تھی؟

وہ خواتین کے حقوق کی علمبردار تھیں لیکن زیادہ تر اُن عورتوں کی جو ماں باپ کی مرضی کے بغیر شادی کرنا چاہتی تھیں چنانچہ گھر سے بھاگ کر آنے والی نوجوان لڑکیوں کے لیے اُن کا گھر اور دفتر پناہ گاہ تھے۔ بے شک اسلام نے بالغ لڑکی کو اپنی شادی کے معاملے میں پسند و ناپسند کا اختیار دیا ہے تاہم اس سلسلے میں والدین کے بھی کچھ حقوق ہیں جنھیں نظر انداز کرنا دین و دنیا دونوں کی نظروں میں ناپسندیدہ فعل ہے، جبکہ عاصمہ جہانگیر نے عمر بھر ایسی متعدد لڑکیوں کی حوصلہ افزائی کی اور اُنھیں قانونی امداد فراہم کر کے اُن کے محبان سے ملوایا۔

ہمارے ازلی دشمن بھارت کے ساتھ تعلقات کی بحالی بلکہ دوستی اُن کی دیرینہ خواہش تھی۔ بھلا ۱۵ / اگست کو واہگہ بارڈر پر جا کر بھارت کا یوم آزادی منانا اور بھارتی فوجیوں کے ساتھ بھنگڑے ڈالنا کسی پاکستانی کو زیب دیتا ہے؟

اسی پر بس نہیں، جب وہ بھارت گئیں تو اُنھوں نے انتہا پسند ہندو راہنما بال ٹھاکرے جیسا لباس پہن کر اور ماتھے پر تلک لگا کر اُس سے ملاقات کی۔ گاندھی کی تصویر کو ہندوانہ انداز میں پرانام کیا۔ اپنی تقاریر اور ٹی وی ٹاک میں پاکستان اور پاکستانی فوج کے بارے میں بالواسطہ یا بلا واسطہ ہندوستان کے نقطہ نظر کی تائید کی اور انسان دوستی کے نقاب میں وطن عزیز کی سالمیت پر حملے کیے۔ کہاں تک سنو گے، کہاں تک سناؤں۔

(محمد عارف قریشی، بھکر)

قومی بیداری و خود اعتمادی

قومی بیداری اور خود اعتمادی میں وہی رشتہ ہے جو شعر اور تخیل میں ہوتا ہے۔ دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ قومی بیداری کا مطلب ہے کہ ایک ایسا معاشرہ جو اعتماد کی دولت سے مالا مال ہو۔ اس طرح ساری کی ساری قوم مختلف الاعضاء ہونے کے باوجود جسم واحد ہو جاتی ہے، اس کی روح میں ایسی یکسانی آ جاتی ہے کہ اس کی آواز اور پرواز دونوں میں یک رنگی ہو۔ قدم اٹھتے ہیں تو ایک ساتھ، ہاتھ بڑھتے ہیں تو ایک ساتھ بڑھتے ہیں۔ بانہیں کھلتی ہیں تو ایک ساتھ کھلتی ہیں۔ دل بولتے ہیں تو ایک ساتھ بولتے ہیں، دماغ سوچتے ہیں تو ایک ساتھ سوچتے ہیں اور یکساں سوچتے ہیں۔

مرکز ایک ہے، قیادت ایک ہے، مقصد ایک ہے، موقف ایک ہے، نصب العین ایک ہے، حمد و ستائش صرف ایک اللہ کے لیے اور تعریف و تبریک ان کے لیے جو اللہ کے لیے لڑتے ہیں۔ ہر طرف بازوؤں میں ضرب کلیمی اور دلوں میں شیوہ ابراہیمیؑ ہے، بچے معوذؓ اور معاذؓ ہیں۔ جوان خالدؓ جانباز ہیں۔ بوڑھے ابوعبیدہؓ اور عبدالرحمن بن عوفؓ ہیں۔ غرض ایک نئی دنیا پیدا ہو جاتی ہے۔ معاشرہ کا ہر فرد اپنے فرض جان جاتا ہے۔

آج ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی بیداری کی پوری حفاظت کریں۔ خود اعتمادی کی عمارت کو متزلزل نہ ہونے دیں۔ غنیم سر پر بیٹھا ہو تو اپنے نفس کی حفاظت کرنا بھی جہاد ہے۔ یہ عمر جو ہم گزار رہے ہیں، بلاشبہ فانی ہے۔ دوام صرف عمل کو ہے اور انھی قوموں کو دوام حاصل ہوتا ہے جو اپنی انا اور خودی کو بقا دے سکتی ہیں۔

پاکستان نتیجہ ہے خاص قسم کے نظریات و تصورات کا، جب تک یہ چیزیں باقی رہیں گی اس وقت تک پاکستان کا وجود ہر خطرے اور خدشے سے محفوظ رہے گا۔ اگر اسی نظریے اور اس تصور ہی کو اپنی جگہ سے ہلا دیا جائے اور ان کی جگہ

دوسرے نظریات کو راہ دی جائے تو ظاہر ہے کہ دماغ بدل جانے سے جسم بدل جاتے ہیں۔ ایک قوم یا ملک اس وقت تک پنپ سکتے ہیں جب تک وہ اپنی آئیڈیالوجی اور اپنی خودی سے رشتہ استوار رکھتے ہیں۔ جب یہ تصور اور یہ خودی جھٹکا کھانے لگتی ہے تب ان کی دیوار کے بیٹھ جانے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر فکری موت کا نتیجہ ملی موت ہوتا ہے۔

خیبر سے لاہور تک اور لاہور سے کراچی تک نوے فیصد لوگ مایوسیوں کا شکار ہیں۔ ان کے جذبات دکھتے پھوڑے کی طرح ہیں۔ وہ مثبت سے زیادہ منفی خیالات پر سوچتے اور ایک ہزیمت خوردہ انسان کی طرح گرد و پیش پر نظر ڈالتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہر چیز دھوپ چھاؤں کی طرح ہے۔ ایسے حالات میں ہمیں ضرورت ہے اپنی قومی بیداری اور خود اعتمادی کو جگانے کی۔ جس طرح ہم نے ۱۹۶۵ء میں ثابت کیا تھا کہ ہم ایک قوم ہیں، ایک ملت ہیں، جسم واحد ہیں، اسی طرح آج پھر دنیا کو بتلانے کی ضرورت ہے کہ ہم ایک قوم ہیں اور ہم ۶۵ء کی طرح ہی جسم واحد ہیں۔ ہم اپنے پیارے ملک پاکستان کے لیے اپنی ذاتی لڑائی جھگڑوں کو چھوڑ کر ایک قوم ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح معنوں میں ایک قوم بنائے۔ آمین ثم آمین

(حافظ محمد عدیل عمران)

قارئین کی آراء

اُردو ڈائجسٹ ایک مثالی جریدہ ہے۔ اپنی تحریروں سے وہ جس طرح انسانیت کی فلاح و اصلاح کے لیے سرگرم عمل ہے، اس پر رشک آتا ہے۔

(عائشہ خان، لاہور)

☆☆

شمارہ جنوری ۲۰۱۸ء میں ڈاکٹر محمد رفیق کی سرگرمیوں کے بارے میں پڑھا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب اور ان کی ٹیم کے حوصلے بلند رکھے۔ (سید ارشاد وارث، اسلام آباد)

☆☆

گل رنگ تحریروں سے سجا شمارہ مارچ زیر مطالعہ رہا۔ الطاف حسن قریشی صاحب کا مضمون ”لہجہ تو شائستہ ہونا چاہیے“ ایک حقیقت کا عکاس تھا۔ سفر نامہ یمن، میری پہلی محبت، کرکٹر معین علی کی داستان اور خصوصی لوگوں پر مضمون پسند آیا

(اقراء کاشف زبیر، پشاور)

☆☆

اُردو ڈائجسٹ ایک معیاری رسالہ ہے۔ اس سے میری وابستگی کئی سال پرانی ہے۔ (نزاہت افشاں، گاؤں مہورہ ضلع اٹک)

☆☆

شمارہ مارچ میں ”اسپیشل“ لوگوں پر لکھا فیچر پسند آیا۔ ”کیمیکل دودھ“ والی تحریر نے دماغ سن کر دیا اور سوچا کہ ہم کیا پی رہے ہیں؟ (پروفیسر ڈاکٹر مجیب ظفر انوار، کراچی)

☆☆

اُردو ڈائجسٹ کا پرانا قاری ہوں۔ رسالے میں طبع شدہ عالمی اور قومی سیاست پر مضامین معلومات افروز اور کام کے ہوتے ہیں۔ (چودھری محمد اکرم، چک ۲۵ جنوری، ضلع سرگودھا۔)

☆☆

اُردو ڈائجسٹ میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ تمام تحریریں شوق سے پڑھتا ہوں۔ یہ رسالہ میرا دوست، فضل رحمن، سابقہ فورمین اے ایس ٹی (AST) دبئی، بھی پڑھتا تھا مگر اب وہ گمشدہ ہو چکا۔ شاید یہ خط پڑھ کر وہ مجھ سے رابطہ کر لے۔

(احسان الٰہی، سیالکوٹ)

کتاب سے بہتر دوست کہاں!!! جمہوری سے بہتر کتابیں کہاں!!!

الطاف حسن قریشی کی معرکہ آرا کتابیں

ملاقاتیں کیا کیا

نایاب قومی اور عالمی شخصیات کے انٹرویوز قیمت 1490 روپے

جنگِ ستمبر 1965ء کی یادیں

دفاعِ وطن کے 17 دنوں کی داستان

نادر تاریخ، پہلی مرتبہ کتابی صورت میں قیمت 1000 روپے

مجھے کیوں نکالا؟ نواز شریف کے فوج سے اختلافات

مصنف اسد اللہ خان

انکشافات سے لبریز کتاب۔ سول ملٹری کے تعلقات کے چشم کشا حقائق قیمت 640 روپے

پاکستان سے بنگلہ دیش۔ اَن کہی جدوجہد	شریف الحق دالیم	860	سلطنتِ عثمانیہ سے جمہوریہ ترکیہ		ضمیر احمد ہاشمی	400
بادشاہی سے جلاوطنی۔ بہادر شاہ ظفر	فرخ سہیل گوئندی	380	تاریخِ عالم		ڈاکٹر فیودر کرووکن	750
ترکی ہی ترکی سفرنامہ، تاریخ و تہذیب	فرخ سہیل گوئندی	480	اکہتر کے وہ دن (مشرقی پاکستان کے آخری 9 ماہ)		جہاں آرا امام	650
بکھرتا سماج	فرخ سہیل گوئندی	380	امریکہ کی عوامی تاریخ		ہاورڈ زِن	600
عالمی بینکاروں کی دہشت گردی	فرخ سہیل گوئندی	180	مسلمان اُندلس میں		سٹینلے لین پول	380
سکندرِ اعظم۔ دنیا فتح کرنے کی تاریخ	ہیرالڈ البرٹ لیمب	540	ناموس	ناول	ایلف شفق	650
سلیمان عالیشان۔ تاریخِ سلطنتِ عثمانیہ	ہیرالڈ البرٹ لیمب	520	رسولِ کائناتؐ (سیرتِ نبوی)		عبدالکریم ثمر	400
صلیبی جنگوں کی تاریخ۔ صلاح الدین ایوبی	ہیرالڈ البرٹ لیمب	590	سرخ میرا نام	ناول	اورحان پاموک	780
حیاتِ قائداعظم	ہیکٹر بولتھو	580	اُجڑے دیار	ناول	انطونیو توریس	500
ایم ٹی وی سے مکہ تک۔ اسلام نے کیسے میری کایا پلٹ دی	کرسٹیان بیکر	990	سرزمین	ناول	انطونیو توریس	300
سندھ ساگر اور قیامِ پاکستان	اعتزاز احسن	800	چلتا مسافر	ناول	الطاف فاطمہ	800
ایشیا کا مقدمہ (سابق وزیراعظم ملائیشیا کی کتاب)	مہاتیر محمد	300	خواب گر	ناول	الطاف فاطمہ	800
دہشت گردی۔ ایک فکری مطالعہ	سلمان عابد	780	شیشے کا آدمی (مختصر روسی افسانے)		ڈاکٹر نجم السحر بٹ	550

مردِ آہن۔ روسی صدر پوتن کی سنسنی خیز سوانح Rs.600

کہانی جلال الدین رومی کی

چالیس چراغ عشق کے (ترجمہ) ایلف شفق

Rs.880 **(The Forty Rules Of Love)**

Free Delivery ایک فون کال پر گھر بیٹھے کتاب خریدیے

جمہوری پبلیکیشنز۔ 2۔ ایوانِ تجارت روڈ، لاہور 042-36314140

www.jumhooripublications.com

ہری مرچیں

نوید ظفر کیانی

عقد کا وقوعہ تھا ایک خواب کی طرح
زندگی میں ڈال دیا اضطراب کی طرح
آگے سے گزر سکیں کیا چرا کے ہم نظر
وہ نظر ہے شعبہ احتساب کی طرح
جانتا ہے وہ ہمیں اک بٹیر دوستو
جس کا بھائی جان ہے اک عقاب کی طرح
اپنی سیٹ پر کھڑا کر دیا ہے پوت کو
اور سمجھتا ہے اسے انقلاب کی طرح
ایسے ڈیم فول پر چپ کا ڈیم کیوں نہیں
وہ جو بہتا جا رہا ہے چناب کی طرح
میرے پہلو میں تجھے دیکھتے ہی جل گیا
دل کسی کا ہوگیا پھر کباب کی طرح
عشق خبط بھر گیا، عقد کونڈا کر گیا
اک سوال کی طرح اک جواب کی طرح
بدنصیبی سے مری، وہ بلیک بیلٹ تھی
جو نزاکتوں میں تھی کچھ گلاب کی طرح
میتھ کی کتاب ہے ازدواجی زندگی
عشق تو ہے سرسری، انتساب کی طرح
ووٹروں میں لیڈروں میں ہے فرق تو یہی
یہ ہیں گائے کی طرح وہ قصاب کی طرح
مفتیوں سے پوچھیئے حد لگے گی یا نہیں
پی رہے ہیں چائے بھی ہم شراب کی طرح
وہ جو گھر جوائی کے عہدے پر ازل سے ہے
اس کی فرصتیں بھی ہیں میری جاب کی طرح

☆☆☆

امجد علی راجا

دل میں ایک لہر سی اٹھی ہے ابھی
اک غزل میں نے بھی کہی ہے ابھی
چھوڑ دوں میں ابھی وزارت کیوں
اک تجوری فقط بھری ہے ابھی
کیسے محفل میں حسن کو دیکھوں
سر پہ بیگم کھڑی ہوئی ہے ابھی
چور ڈاکو پہنچ گئے پہلے
جبکہ بستی نہیں بسی ہے ابھی
شادیاں چار ہو گئیں لیکن
جانِ من آپ کی کمی ہے ابھی
چھوڑ دے ڈانگ ہاتھ سے بیگم
دیکھ پسلی مری جڑی ہے ابھی
بینک سے لی تھی لیز پر گاڑی
بیچ کر قسط اک بھری ہے ابھی
بعد شادی کے آگ اگلے گی
وہ حسینہ جو پھلجھڑی ہے ابھی
مجھ کو طعنہ نہ دے بڑھاپے کا
تاڑ میں میری اک پری ہے ابھی
چھوڑ سکتی نہیں ابھی وہ مجھے
ایک کوٹھی میری بچی ہے ابھی
جاگ جائے گی قوم بھی اک دن
”غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی“

☆☆☆

TENDER NOTICE

1- Sealed tenders based on item rates on approved estimate (DNIT) are hereby invited for the works mentioned below from the Contractors/Firms enlisted/renewed with Communication & Works Department for current financial year 2017-18 in field of Highway Works/Bridge works and specialized in soil Investigation works.

2- Tender documents can be obtained from the date of publication of invitation to bides in the newspaper from any of the below mentioned offices, upon written requested accompanies with attested copies of enlistment/upto date renewal letter, PEC License, Identity Card of Contractor/Managing Partner/Director of the firm along with registered power of attorney and on payment of prescribed tender fee inform of CDR/Bank Draft/Cashier's Cheque of any schedules Bank.

i) Commissioner Lahore Division Lahore.

ii) Chief Engineer (Central Zone) Punjab, Highway Department 2-Lake Road Lahore.

iii) Superintending Engineer, Highway Circle, Lahore Office adjacent (Roads Research & material Testing Institute Canal Bank Lahore.

iv) The Deputy Commissioner, Sheikhupura.

v) Executive Engineer Highway Division/Sheikhupura.

vi) Assistant Commissioner Sheikhupura /Ferozewala.

3- Tendered rates and amounts should be filed in figures as well as in words & tenders should be signed as per general direction given in the tender documents, No rebate will be acceptable.

4- Tender will be received in the offices of Commissioner Lahore Division, Lahore and Chief Engineer (Central Zone) Punjab Highway Department 2-Lake Road Lahore and will be opened simultaneously on fixed date and time by the respective Tenders Opening Committee at the above venues in the presence of intending contractors or their representatives who opt to be present.

5- Conditional tenders and tenders not accompanied with Earnest Money @ 2% of the estimated cost in shape of CDR/Bank Drafts/Cashier's cheque of any scheduled Bank and attested copies of registered partnership deed and power of attorney in case of firms will not be entertained.

6-i) The Procuring Agency may reject all bids or proposals at any time prior to the acceptance of bids or proposals.

ii) The procuring Agency shall upon request communicate to any bidder, the grounds for its rejection of all bids or proposal, but shall not be required to justify those grounds.

Sr.	Name of Work	Estimated Cost (Rs.)	T.S No. & dated	Tender Price (Rs.)	Last date for submission of application to purchase tenders	Last date and time for receipt / opening of tenders
1.	Department of approach road, bridge and provision of Overhead Water Tank at Hiran Minar Sheikhupura. **(Construction o Pile Foundatio Bridge ove Sheikhupura Distributory) (Bridge Portio only)**	8.42	538/M/CB Dated 05.05.2018	10000	16.04.2018	**18.04.2018 upto 1.30 pm to 2.00 pm**
2.	Soil Investigation Bridge over Daik Nullah Thatha Waseeran including Bhattian Wala District Sheikhupura. Length 104 Rft.	0.400	2447/M/CB dated 17.08.2017	200	16.04.2018	**18.04.2018 upto 1.30 pm to 2.00 pm**

دانیہ صدیقی

بت گئی۔ اس مرتبہ
وڑی باندھی تھی۔
ر لگائی۔۔ مورا جوبن
دے ہے اپنے ہی۔۔۔
چی خانے میں ہی چلا
زے کی طرف پیٹھ
تھی۔ باورچی خانے
رہری مرچوں کی من
ی تھی۔
ے نے پیار سے اسے
ہٹ تھم گئی مگر وہ پائی
خانے میں سل بٹے کی
ٹ ابھرتی رہی۔ کرم

Sr.	Name of Work	Estimated Cost (Rs.)	T.S No. & dated	Tender Price (Rs.)	Last date for submission of application to purchase tenders	Last date and time for receipt / opening of tenders
3.	Soil Investigation of Proposed Bridge at Construction of Front Approach Road of QAAP Length 2.00 Km in District Sheikhupura (734.62 Kanal)	0.400	2535-41/Plg dated 08.05.2018	200	16.04.2018	**18.04.2018 upto 1.30 pm to 2.00 pm**
4.	Soil Investigation of 01 No. Bridge on Dualization of Road Jandiala Sher Khan Hiran Minar Road to Chico ki Mallian via Allama Mashraqi Park along Railway Line 11.16 Km.	0.400	3073/plg dated 17.04.2015	200	16.04.2018	**18.04.2018 upto 1.30 pm to 2.00 pm**
5.	Rehabilitation of Metalled Road from Rana Town G.T Road to Audhian PSO Petrol Pump in Tehsil Ferozewala District Sheikhupura (Group No.1) Section 0.00 to 1.524 Km) Length = 1.524 Km.	42.098	314/CDB dated 21.03.2018	**16.04.2018**	**18.04.2018 upto 1.30 pm to 2.00 pm**	**18.04.2018 upto 1.30 pm to 2.00 pm**

IPL - 3900

Executive Engineer
Highway Division Sheikhupura

Superintending Engineer
Highway Circle Lahore

دانیہ صدیقی

پودینے کی چٹنی

سیدھے سادھے معاشرے میں جینے والی عورت اپنی اولاد کے لیے بھلے ہی خود کو بدل ڈالے، اپنا سنہرا ماضی کبھی نہیں بھولتی

ایک ایسی ہی عورت کی دل گداز کہانی...

موہے اپنے ہی رنگ میں رنگ لے۔۔ تُو تو صاحب میرا محبوب الٰہی۔۔ ہماری چندریا۔۔ پیا کی پگڑیا

''رضیہ!!! او رضیہ!! میرا توشہ دان تو دے دے۔ دیکھ مجھے آج کام پر پھر دیر ہو جائے گی۔'' کرم دین کی آواز پر سل بٹے پر تیزی سے چلتے رضیہ کے ہاتھ ذرا سی دیر کو تھمے۔ اس نے پلو سے ماتھے پر آئے ہوئے پسینے کو پونچھا اور دوبارہ اپنے کام میں جت گئی۔ اس مرتبہ گنگناہٹ کی آواز تھوڑی بلند تھی۔

جو کچھ مانگے رنگ کی رنگائی۔۔ مورا جوبن گروی رکھ لے۔۔ موہے اپنے ہی۔۔۔

کرم دین مجبوراً باورچی خانے میں ہی چلا آیا جہاں رضیہ دروازے کی طرف پیٹھ کیے پیڑھی پر بیٹھی تھی۔ باورچی خانے میں لہسن، پودینے اور ہری مرچوں کی من موہنی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

''رضیہ!'' کرم دین نے پیار سے اسے پکارا۔ رضیہ کی گنگناہٹ تھم گئی مگر وہ پلٹی نہیں بس باورچی خانے میں سل بٹے کی مانوس سی کھٹ کھٹ ابھرتی رہی۔ کرم

چوہدری محمد افضل اینڈ سنز
نیوز ایجنسی لیاقت پور
0332-6901705, 0300-7325575

Last date and time for receipt / opening of tenders

18.04.2018 upto 1.30 pm to 2.00 pm

18.04.2018 upto 1.30 pm to 2.00 pm

18.04.2018 upto 1.30 pm to 2.00 pm

PL - 3900

ngineer Lahore

دین مسکرایا اور رضیہ کے قریب پیڑھی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ رضیہ سر جھکائے اپنے کام میں مصروف رہی۔ کرم دین نے شرارت سے اُس کے گالوں کو چھوتی بالوں کی لٹ کھینچ کر کہا۔

”میری طرف دیکھ!“ مگر رضیہ نے نظریں اٹھا کر اس کی جانب نہ دیکھا۔

”ابھی تک ناراض ہے کیا مجھ سے؟“ رضیہ نے شکوہ بھری نگاہیں اُس پر ڈالیں اور سل پر سے چٹنی سمیٹنے لگی۔ کرم دین نے تڑپ کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا، ”بول نا رضیہ! دیکھ اگر تُو مجھ سے یونہی ناراض رہے گی تو میرا دل کام پر بھی نہیں لگے گا۔ اچھا مجھے معاف کردے! کل دوستوں کی باتوں میں آکر زندگی میں پہلی اور آخری بار بیڑی کو ہاتھ لگا بیٹھا۔ میری توبہ، جو اَب اُس کی جانب دیکھوں بھی تو!“ کرم دین نے مزاحیہ انداز میں اپنے کان پکڑے تو رضیہ ہنس پڑی۔

”بس بس! رہنے دے کرم دین۔ جیسے میں تجھے جانتی نہیں! شادی ہوئے بیس سال ہونے کو آئے۔ اٹھارہ سال کا جوان بیٹا ہے ہمارا! اگر تُو ہی سگریٹ بیڑی کے شوق پال لے گا تو اُس پر کیا اثر پڑے گا۔ کبھی سوچا ہے تُو نے! ویسے ہی زمانہ کتنا خراب ہے۔ شکر ہے کہ ہمارے بیٹے کو کوئی بُری لت نہیں۔ بس تُو بھی باپ ہونے کے ناتے کچھ خیال کر لیا کر۔“

کرم دین نے مسکرا کر اپنی سمجھدار اور دوراندیش بیوی کی جانب دیکھا جس کے چہرے پر مامتا کا نور چھایا تھا۔

”ہاں ہاں جھلیے، میں بھی یہ سب باتیں سمجھتا ہوں۔ بس کیا کروں، کبھی کبھی دماغ کا کوئی پرزہ ڈھیلا ہو جاتا ہے۔ تُو ہے نا مجھے سمجھانے کے لیے۔ چل اب جلدی سے میرا توشہ دان دے تو میں کام پر نکلوں۔“

رضیہ پھرتی سے اُس کے لیے توشہ دان تیار کرنے لگی تو کرم دین چھیڑنے کی خاطر بولا، ”میرے لیے پودینے کی چٹنی بنائی ہے یا لاڈلے بیٹے کی ناراضگی میں وہ بھی بھول گئی؟“

رضیہ کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ”بھلا ایسا ہو سکتا ہے کہ میں تیرے لیے پودینے کی چٹنی نہ بناؤں۔ توشہ دان میں سب رکھ دیا ہے۔ بس، مصروفیت میں کھانا ہی نہ بھول جانا۔“

کرم دین کو رُخصت کر کے وہ کمر سیدھی کرنے ذرا سی دیر لیٹی ہی تھی کہ دروازے پر دستک اُبھری۔ رضیہ نے اُٹھ کر دروازہ کھولا تو منیر کھڑا تھا۔

”کیا ہوا منیر؟ آج تُو کالج سے اتنی جلدی کیسے واپس آ گیا؟“ رضیہ اُس کی بے وقت واپسی پر حیران ہوئی۔

”ارے کچھ نہیں اماں، کالج میں دو سیاسی جماعتوں میں جھگڑا ہو گیا تو انتظامیہ نے حالات کے پیش نظر کالج جلد بند کر دیا۔ اگر کھانا تیار ہو تو مجھے جلدی سے دے دے۔ بہت بھوک لگی ہے۔“

”ہاں ہاں، کھانا تو تیار ہے۔ تُو ہاتھ منہ دھو لے۔ میں اتنی دیر میں کھانا لگاتی ہوں۔“

رضیہ جب باورچی خانے سے کھانا لے کر آئی تو کٹورے میں موجود پودینے کی چٹنی دیکھ کر منیر بے اختیار ہنس پڑا۔

”کیا اماں آپ بھی نا! کل رات ہی آپ کی بابا سے کتنی بحث ہوئی۔ آپ کتنا لڑیں اُن سے، مگر آپ نے آج بھی توشہ دان میں پودینے کی چٹنی کے بغیر انھیں جانے نہیں دیا۔ کیونکہ آپ کو علم ہے کہ پودینے کی چٹنی کے بغیر بابا لقمہ حلق سے نہیں اُتارتے۔ بابا آپ کی اسی محبت کا فائدہ اٹھاتے ہیں بس!“

رضیہ چپ چاپ مسکراتی ہوئی کرم دین کا پھٹا ہوا کُرتا سینے میں مصروف رہی۔ وہ اب بیٹے کو کیا بتاتی کہ میاں بیوی کی یہی معمولی نوک جھونک اور چھوٹے موٹے جھگڑے زندگی میں چٹنی جیسے ہی ہوتے ہیں۔ جس طرح روکھی سوکھی روٹی تازہ مسالوں اور سبزی سے بنی سوندھی چٹنی کے ساتھ کھانے سے اس کا روکھا پن جاتا رہتا ہے بالکل ویسے ہی یہ چٹنی ان میاں بیوی کے بیچ مضبوط ڈور کے مانند تھی۔

جس کی سوندھی سوندھی خوشبو میں رضیہ کے ہاتھوں کی تھکاوٹ محبت بن کے رچی ہوتی تو دوسری طرف کرم دین اپنی بیوی کی اس درجہ توجہ اور خیال رکھنے کی عادت پر قربان ہو ہو جاتا۔ یہ چٹنی جیسے ان کی محبت کی زباں تھی۔

”ویسے ایک بات ہے اماں، آپ کے ہاتھ کی بنی اِس پودینے کی چٹنی کا کوئی جواب نہیں! کوئی شک نہیں کہ بابا کیوں اِس کے دیوانے ہیں۔ میں تو یہ سوچتا ہوں کہ آپ سے اِس چٹنی کے بڑے بڑے مرتبان بھروا کر ساری زندگی کے لیے ذخیرہ کر لوں۔“

رضیہ دھاگے کو دانتوں سے کاٹتی ہوئی بولی، ”کیوں... ذخیرہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تُو فکر نہ کر، میرے بعد تیری بیوی ایسی ہی مزیدار چٹنی بنا کر تجھے کھلایا کرے گی۔ میں خود اپنی بہو کو یہ چٹنی بنانا سکھاؤں گی۔“

یہ سن کر منیر نے زوردار قہقہہ لگایا، ”اماں اب ہر کوئی بابا کی طرح خوش قسمت تو نہیں ہوتا نا۔ ضروری نہیں کہ مجھے بھی ایسی ہی خیال رکھنے والی بیوی ملے۔ آپ تو بہت بھولی ہیں۔ اور ویسے بھی، وہ بنائے نہ بنائے، میں تو آپ کے ہی ہاتھ کی چٹنی تمام عمر کھاؤں گا۔“

رضیہ نے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا، ”کیوں نہیں بنائے گی۔ دیکھنا، وہ تجھے اپنے ہاتھوں سے بنا کر کھلائے گی۔“ منیر بدستور مسکرا رہا تھا۔

”میری پیاری اماں، بچپن سے لے کر آج تک مجھے نہیں یاد پڑتا کہ کبھی دسترخوان پر پودینے کی چٹنی موجود نہ ہو۔ یہاں تک کہ بیمار ہونے کے باوجود آپ نے کئی بار ضد کر کے سل بٹے پر ہی چٹنی پیسی جبکہ بابا نے آپ کو گرائنڈر بھی لا کر دیا، لیکن صرف اِس لیے کہ آپ جانتی ہیں بابا ہاتھ کی پسی چٹنی پسند کرتے ہیں، آپ نے گرائنڈر کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ مجھے کبھی کبھی حیرت ہوتی ہے کہ معمولی سی پودینے کی چٹنی کو آپ نے کس طرح اپنی وفاؤں اور چاہتوں کا پیمانہ بنا لیا ہے۔“

☆☆☆☆☆

”اماں، اماں!“ ردا بڑی دیر سے اپنی ساس کو آوازیں دے رہی تھی۔ بستر پر لیٹا استخوانی وجود سسکتا ہوا اپنے ماضی کی یادوں سے آہیں بھرتا باہر نکلا اور ذرا سی جنبش کے بعد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”اماں، یہ زوہیب اور نادیہ مجھے بہت پریشان کر رہے ہیں اگر آپ اِن کا ناشتا بنانے میں میری تھوڑی سی مدد کر دیں تو...“ آگے کا جملہ قصداً یوں ادھورا چھوڑ دیا گیا جیسے پوری اُمید ہو کہ اتنا کہنا ہی کافی ہو گا۔

”ہاں ہاں، کیوں نہیں بہو۔ تم بچوں کو سنبھالو میں ناشتا بنا لیتی ہوں۔“ ردا کی آنکھوں میں ساس کے لیے تشکر ہلکورے لینے لگا۔

تھوڑی ہی دیر میں ناشتا بن کر تیار ہو گیا۔ ردا بھی جلدی جلدی دفتر جانے کے لیے تیار ہو کر آ گئی تھی۔ اُس نے آتے ہی میاں کو آواز لگائی۔ ”آ جائیں بھئی، ناشتا تیار ہے۔ آج تو آپ نے مجھے دفتر بھی ڈراپ کرنا ہے۔“ ردا نے ڈبل روٹی پر مکھن لگایا اور بڑے بڑے لقمے توڑنے لگی۔

گھر میں ایک دم خاموشی کا احساس ہونے لگا تو رضیہ نے پوچھا، ”بہو، بچے اسکول چلے گئے؟“

”جی اماں، اُنھیں تو میں نے ناشتا کروا کر ڈرائیور کے ساتھ اسکول بھیج دیا۔ اصل میں آج اُن کی وین ہی نہیں آئی اِس لیے کام بڑھنے کی تھوڑی پریشانی ہو گئی ورنہ میں آپ کو ناشتا بنانے کی زحمت نہ دیتی۔“ (اُسے اماں بی کا اپنے باورچی خانے میں تسلط ہرگز پسند نہ تھا)۔ ردا نے دکھاوے کے معذرت خواہانہ لہجے میں میاں اور ساس کی جانب دیکھتے ہوئے اپنی بات مکمل کی تو رضیہ بول پڑی، ”کیسی غیروں والی باتیں کرتی ہو بہو، اپنے بچوں کے لیے کھانا بناتے ہوئے بھلا کوئی ماں تھکتی ہے؟ اب تم دونوں آرام سے ناشتا کرو میں سبزی فریج میں رکھتی ہوں۔“ اس نے جوش سے تازہ سبزی

بیٹی اور فریج کی طرف چل پڑی۔

کریلوں کو سلیقے سے جماتے ہوئے اچانک اُس کے نتھنوں سے مانوس سی خوشبو ٹکرائی اور بے اختیار اُس کے منہ سے نکلا، ''ارے بہو، میں نے کل ہی سبزی والے سے تازہ تازہ پودینہ خریدا تھا۔ دیکھو تو، کیسا خوشبودار ہے! فریج کھولتے ہی سارا باورچی خانہ مہک گیا۔ بیڑا غرق ہو اس جوڑوں کے درد کا ورنہ کل ہی اِس کی چٹنی پیس کر رکھ دیتی۔ رضیہ بیگم کی تو جیسے مراد بر آئی تھی باورچی خانے میں آتے ہی۔ ایسا کرتی ہوں کہ تمہارے میاں کو بھی میرے ہاتھ کی پودینے کی چٹنی بہت پسند ہے۔ میں اِس کی پتیاں الگ کیے دیتی ہوں تم اِنھیں۔ ۔ ۔''

''اُفوہ اماں! آپ بھی کس زمانے کی باتیں لے کر بیٹھ گئیں۔ مجھے اب اتنی فرصت کہاں کہ پسند اور ناپسند کے جھمیلوں میں پڑوں۔ بھلا چٹنی نہیں بناؤں گی تو منیر مجھے چھوڑ تھوڑی نہ دیں گے۔ ذرا سی چٹنی کے لیے کون اپنی جان جوکھم میں ڈالے۔ میرا مشورہ مانیں تو آپ بھی پودینہ مت خریدا کریں۔ بھلا بتاؤ، اِس کا فائدہ ہی کیا ہے۔ گنتی کے چند کھانوں میں ڈلتا ہے اور وہ بھی اگر نہ ڈالو تو گزارا ہو ہی جاتا ہے۔ اُوپر سے مہک اتنی تیز کہ دماغ پر چڑھ جائے۔ اچھا، آپ فکر نہ کریں۔ چٹنی ہی تو کھانی ہے نا۔ میں آج دفتر سے واپسی پر سپر اسٹور سے بنی بنائی پودینا چٹنی کی بوتل لیتی آؤں گی۔''

بہو کی بات مکمل ہوئی تو اُسے جیسے کوئی پرانی بات یاد آ گئی۔ ''(ماں۔ ۔ ۔ تیرے ہاتھ کی چٹنی میں ذخیرہ کر کے رکھوں گا)۔'' اُس نے چونک کر بیٹے کی شکل دیکھی جو اُسی کی جانب دیکھتا ہوا کھسیانا ہو رہا تھا۔ ردا اپنا پرس اٹھاتی کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''چلیں منیر، ویسے ہی مجھے دیر ہو رہی ہے۔ اب آپ جاتے ہوئے مجھے بھی دفتر چھوڑتے ہوئے جائیں۔'' پھر وہ چونک کر رضیہ کی جانب مڑی۔

''ارے ہاں اماں، بچے اسکول سے آجائیں تو اُنھیں کھانا کھائے بغیر سونے مت دیجیے گا اور زوہیب چاہے کتنی بھی ضد کرے آپ اُسے بھوکے پیٹ ہر گز مت سلائیے گا۔ بڑی پتیلی میں بچوں کے لیے نوڈلز تیار رکھے ہیں۔ کل شام ہی کو میں نے زوہیب کے لیے اُس کا پسندیدہ کیک بھی بیک کیا تھا۔ کھانے کے بعد وہ بھی ضرور اُسے دے دیجیے گا۔ میں نے نادیہ کے لیے ملک شیک بھی بنا کر فریج میں رکھا ہے۔ آپ تو جانتی ہی ہیں کہ مجال ہے اِس لڑکی کے حلق سے ملک شیک کے بغیر کھانا اُتر جائے۔''

ردا تیزی سے اپنی بات مکمل کرتی ہوئی باورچی خانے سے نکل گئی۔ منیر بھی کھسیائے انداز میں اُسے الوداع کہتا ہوا اُٹھ گیا۔ رضیہ اپنی سوچوں میں گھری باورچی خانے میں اکیلی کھڑی رہ گئی۔ اُس نے بڑھ کر فریج کھولا اور پودینے کی گٹھی ہاتھ میں ایسے احتیاط سے تھام لیا جیسے کوئی مقدس چیز ہو۔

پودینے کی نرم نرم پتیاں ہاتھ سے مسلتے ہوئے اُس کے رگ و پے میں نامعلوم سی تھکن اُترنے لگی یہاں تک کہ اُس کے پاؤں لرزنے لگے۔ وہ ہانپتی ہوئی کرسی گھسیٹ کر اُس پر ڈھیر ہو گئی۔ دھیرے دھیرے اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ ہری مرچوں، لہسن، سفید زیرے اور پودینے کی سوندھی سوندھی خوشبو اُسے اپنے حصار میں لینے لگی۔ آس پاس ہی کہیں کرم دین مسکرانے لگا۔

جانے کتنے ہی لمحے گزر گئے پھر اچانک جیسے چھناکا سا ہوا۔ رضیہ تڑپ کر اُٹھی۔ اُس نے پودینے کی گٹھی کو زور سے کوڑے دان میں پٹخا، اسٹینڈ پر سے پلیٹ اُٹھائی اور پتیلی سے نوڈلز نکال کر اُوپر تک بھر کر مزے سے میز پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے ندیدوں کی طرح نوڈلز کھانے لگی۔

آج کے تیز رفتار زمانے میں شاید کھانے کے بل بوتے پر دل جیتنے کا رواج نہیں رہا تھا۔ کرم دین اور رضیہ کی سوندھی محبت کی جگہ منیر اور اُس کی ملازمت پیشہ بیوی کے فاسٹ فوڈ نے لے لی تھی۔

زکریا نے حد پایا کھارا۔ ۔ ۔ جس دم وجیا عشق نقارا۔ ۔ ۔
دھریا سر تے تکھا آرا۔ ۔ ۔ کیتا ایڈ زوال۔ ۔ ۔ ایس نیونہہ دی اُلٹی چال ●●●

ناولٹ

صالحہ محبوب

جہنمی عورت

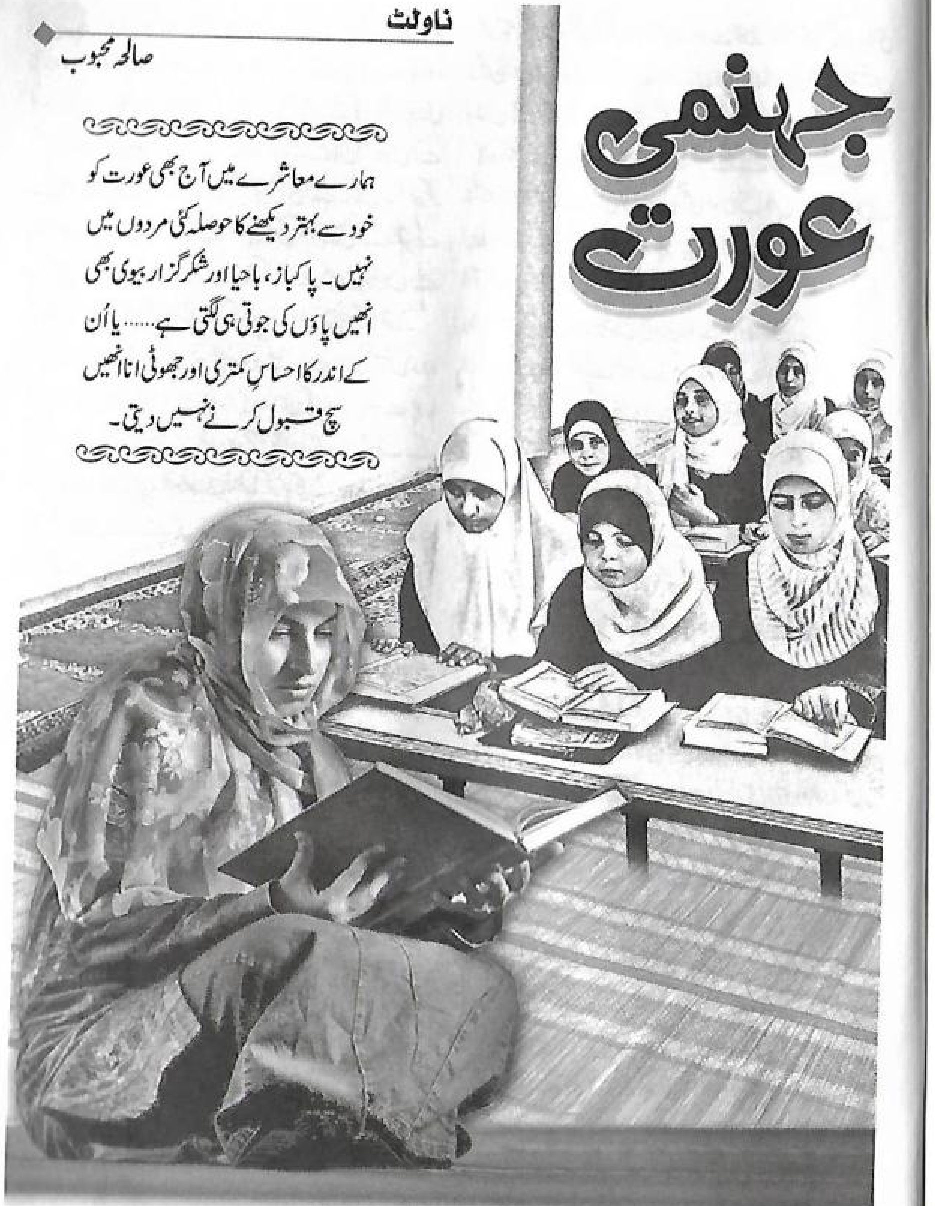

ہمارے معاشرے میں آج بھی عورت کو خود سے بہتر دیکھنے کا حوصلہ کئی مردوں میں نہیں۔ پاکباز، باحیا اور شکر گزار بیوی بھی اُنھیں پاؤں کی جوتی ہی لگتی ہے...... یا اُن کے اندر کا احساسِ کمتری اور جھوٹی انا اُنھیں سچ قبول کرنے نہیں دیتی۔

”اب تم تو بند کرو یہ ڈرامہ... سارا دن ہو گیا۔ پورے خاندان کے سامنے نمونہ بنا بیٹھا ہوں۔ کبھی یہ کپڑے پہنو، پھر سارے خاندان کے سامنے نائی نہلانے کی رسم پوری کرے گا۔ پھر سہرا باندھو... اللہ اللہ کر کے ان جھمیلوں سے جان چھوٹی تو اب تُو سامنے بندریا بنی بیٹھی ہے۔ چل جا اُٹھ کر منہ دھو۔ ڈھنگ کے کپڑے پہن۔ اتنی گرمی میں اتنے نخرے اور رسمیں۔“ غلام محمد جھلسا دینے والی گرمی میں پھول پتیوں سے سجے کمرے اور سیج پر بیٹھی نسیم کو دیکھ کر بُری طرح چڑ گیا تھا۔

”اچھا جی“... نسیم جو پچھلے دو گھنٹے سے اِس حبس زدہ کمرے میں لال جوڑا پہنے اور اپنی ساس کی زیرِ ہدایت پورا گھونگھٹ نکالے پسینے میں شرابور بیٹھی تھی، سہم گئی۔ خوف کے مارے اس نے اپنا گھونگھٹ اٹھا کر پلنگ سے اترنے کی کوشش کی۔ سامنے ہی غلام محمد ہاروں کے ڈھیر سے لدا، لال گوٹے والا دوپٹا کندھوں پر اوڑھے غصّے میں بھرا کھڑا تھا۔ گرمی، تھکن، پسینے اور کوفت نے اُسے چڑچڑا بنا دیا تھا مگر نسیم کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں اب غصے کے ساتھ ساتھ شدید حیرت بھی اتر آئی۔ سامنے سنگھار میز کے شیشے میں نسیم نے اپنی صورت دیکھی تو پہلے خود اس کی اپنی چیخ ہی نکل گئی۔ پسینے اور آنسوؤں نے اس کے چہرے کو خوفناک حد تک کالا کر دیا تھا۔ سرخ جوڑے میں سے جھانکتا وہ سیاہ کالا چہرہ واقعی ہیبت ناک لگ رہا تھا۔ رہی سہی کسر نتھ اور ٹیکے کے بڑے اور بے ڈھنگے سائز نے پوری کر دی تھی۔ اِس حیرت کے جھٹکے کے بعد دونوں دلہا دلہن ایک دوسرے کی حالت دیکھ کر ہنس پڑے۔ دونوں ہی کارٹون لگ رہے تھے۔ ان دونوں کے درمیان موجود تناؤ وقتی طور پر ہی سہی مگر کافی حد تک ختم ہو گیا۔

نسیم اور غلام محمد کی شادی شدید گرمی اور جاتے ساون کے شدید حبس میں دونوں کے بڑوں نے بہت جھگڑوں کے بعد طے کی تھی۔ دونوں آپس میں ماموں پھوپھی زاد تھے۔ غلام محمد نسیم کی پھوپھی امّاں کا اکلوتا سپوت تھا۔ غلام محمد سے بڑی تین بیٹیوں کو بیاہنے کے چکر میں اِس لاڈلے کی عمر پینتیس سال سے بھی زیادہ ہو چکی تھی۔ نسیم کی خوبصورتی کی وجہ سے پھوپھی امّاں نے یہ رشتہ بہت عرصے سے مانگ رکھا تھا۔ نسیم بمشکل سولہ برس کی ہوئی تھی اور اب اس کے آٹھویں جماعت میں فیل ہونے پر یہ شادی ہو رہی تھی۔ اگر نسیم آٹھویں جماعت پاس کر جاتی تو شادی دو سال بعد ہوتی مگر غلام محمد کی ماں اور بہنوں کی دن رات کی دعائیں رنگ لائیں۔ باقی پرچے تو ٹھیک ہوئے مگر وہ صرف حساب میں پانچ نمبروں سے فیل ہو گئی۔ اِس ناکامی کا نتیجہ اِس سڑی حبس زدہ گرمی میں شادی کی صورت نکلا تھا۔

معمولی شکل صورت والے غلام محمد نے پرچون کی ایک چھوٹی سی دکان گھر کے قریب ہی کھول رکھی تھی۔ ایک ساڑھے تین مرلے کا مکان بھی اُسے باپ کے مرنے کے بعد ملا تھا۔ دکان ہی اس کی آمدن کا واحد ذریعہ تھی۔ سو بہت مشکل سے اُس نے شادی کے دنوں میں دو دن کے لیے اُسے بند کیا تھا۔ اگلے روز ولیمہ تھا۔ دوپہر تک دعوت ولیمہ سے فارغ ہو کر اس نے دکان پھر سے کھول لی۔

نسیم کو اس کی اوقات کا احساس پہلے ہی روز دلا دیا گیا۔ اس کا حسن، کم عمری اور تعلیم اپنے باپ کے گھر یقیناً اہم ہوں گے مگر یہاں غلام محمد کی ساری محبت، اہمیت اور توجہ اپنی ذات اور پھر کاروبار پر تھی۔ پھوپھی امّاں کا یہ ایک ہی بیٹا تھا۔ لہٰذا بہو گھر پر حاوی ہو جائے، یہ ان سے ہرگز برداشت نہ ہوتا۔ سولہ سترہ سالہ نسیم کو بیک وقت دو محاذوں کا سامنا تھا۔ جہاں اس کی کم عمری، ناتجربہ کاری اور بے تحاشہ حسن سب سے بڑی کمزوری تھی۔ غلام محمد کے گھر کی روٹین لگی بندھی تھی۔ وہ صبح سویرے منہ اندھیرے اپنی دکان کھولتا۔ دہی اور انڈے اس وقت خوب بکتے۔ نو دس بجے وہ ناشتا کرنے گھر آتا۔ نسیم گھر صاف ستھرا کر کے چمکا چکی ہوتی۔ اس وقت ناشتا کیا جاتا جس

میں کچھ نقص نکالنا پھوپھی امّاں اپنا فرض سمجھتیں۔

”نسیم! روٹی موٹی پکائی ہے۔ غلام محمد کے لیے بل والے پراٹھے بنانا۔ آج چائے پتلی ہے۔ کل ہی انڈہ بنایا تھا، آج دہی منگوا لیتی“۔ رہی سہی کسر غلام محمد پوری کر دیتا۔ پھوپھی امّاں لاکھ اعتراضات کے باوجود نسیم کے ہاتھ کا بنا ناشتا رغبت سے کھا لیتیں۔ بقول نسیم کی ماں کے کہ ”تیری پھوپھی زبان کی کڑوی ہے مگر دل کی اچھی ہے“ مگر غلام تو زبان کا کڑوا ہونے کے ساتھ ساتھ دل کا بھی بہت سخت تھا۔ بچپن سے ہی اس نے تین بہنوں کے اکلوتے بھائی ہونے کا بہت فائدہ اُٹھایا اور اب رعب اور غصّہ اس کی فطرت کا حصّہ بن چکے تھے۔

نسیم فی الحال گھریلو کاموں میں بہت طاق نہیں تھی۔ اس نے تو بس اسکول میں خوب دل لگا کر پڑھا اور قرآن پاک کی قرأت بہت محنت سے سیکھی تھی۔ سو ان چولھے ہانڈی کے کاموں میں وہ گھبرا جاتی۔ نسیم کی خوبصورتی غلام محمد کے غصّے کو مزید بھڑکا دیتی اور اس کا احساسِ کمتری عود کر آتا۔ غلام محمد کے غصّے کی وجہ سے وہ شادی کے ابتدائی دنوں میں بھی سنگھار نہ کر سکی لیکن وہ اپنے سفید رنگ اور قدرتی گلابی گالوں کا کیا کرتی جو سادہ پانی سے بھی دھل کر نکھر اٹھتے۔ سادہ کپڑوں اور سیدھی چٹیا میں بھی وہ سب نندوں کے درمیان بیٹھی مور پری لگتی۔ سو صبح صبح غلام محمد اُسے دیکھ کر چڑ جاتا۔ کبھی پراٹھوں پر اعتراض ہوتا تو کبھی سالن پر... برتن روز پٹخے جاتے۔ شروع کی ڈانٹ ڈپٹ میں رفتہ رفتہ مار پیٹ بھی شامل ہونے لگی تھی۔

آس پاس محلّے کی عورتوں نے نسیم کی خوبصورت قرأت کی بارسنی تھی۔ انھوں نے پھوپھی امّاں سے اصرار شروع کیا کہ نسیم کو ہماری بچیوں کو قرآن پڑھانے کی اجازت دے دیں۔ غلام محمد تو نسیم کے کسی سے ملنے کے بھی حق میں نہ تھا مگر ماں کی سفارش اور قرآن کی تعلیم پر اس کو اجازت دینا ہی پڑی۔

”دیکھ نسیم! تو قرآن پڑھا دیا کر مگر میرے دکان پر جانے کے بعد بچیاں آئیں اور میرے آنے سے پہلے جا چکی ہوں“۔ غلام محمد نے شرط لگائی ”ٹھیک ہے۔ ایسا ہی ہوگا“ نسیم پُرجوش انداز میں بولی۔

”صبح فجر کے بعد بچیاں آیا کریں گی۔ پھوپھی امّاں کے سامنے ہی انھیں سبق دوں گی اور گھنٹا بھر میں سب واپس“ نسیم بولی۔

”دیکھ مجھے کوئی شکایت نہیں ملنی چاہیے۔“ اب غلام محمد ذرا سختی سے بولا۔ دراصل نسیم کا خوشی سے کھلا چہرہ اُسے فکرمند کر رہا تھا۔

”کسی بچی سے فالتو بات نہ کرنا۔“ اب وہ غرّایا

”معصوم بچیوں نے کون سی فالتو بات کرنی ہے“۔ نسیم سادگی سے بولی۔

”بس! یہ خاوندوں کے آگے زبان چلانے والی عورتیں ہی جہنمی ہوتی ہیں۔“ نسیم کے جواب نے غلام محمد کے تن بدن میں گویا آگ ہی لگا دی۔ وہ یک طرفہ بولتا رہا اور بہت لمبی تقریر کے بعد اس نے آخری جملہ یہ کہا۔

خاوندوں کی ناشکری کرنے والی عورتیں سیدھی دوزخ میں جائیں گی۔ اتنی لمبی تقریر سن کر نسیم کی بھوری کانچ سی آنکھیں خوف، حیرت اور دکھ سے پانیوں سے بھر گئیں۔ اس کی ناک مزید گلابی ہو گئی۔ غلام محمد کے اندر کے کمینے مرد کو عجیب سی تسکین ملی۔ اس کا دل اب اِس ملول زدہ لڑکی کو دیکھ کر مطمئن تھا۔ عمر میں بیس برس کا فرق اور نسیم کی بے نیازی و بےفکری، یہ وہ خوف تھے جو غلام محمد کو دن رات بے چین کیے رکھتے۔

اگلے روز فجر کے بعد جب غلام دکان پر چلا گیا تو محلّے کی مائیں اپنی بچیوں کو قرآن پڑھانے کے لیے لانا شروع ہو گئیں۔ دروازے کے سامنے ہی پھوپھی امّاں اپنی چارپائی بچھا کر بیٹھی تھی۔ ہر عورت پہلے ان سے دعا سلام کرتی اور پھر

نسیم کے پاس بچی چھوڑ جاتی۔ زمین پر چٹائیاں بچھا کر جگہ بنا لی گئی تھی۔

ساتھ والی محمد بخش کلرک کی بیوی اپنی دو بیٹیوں کو لائی، تو سامنے والی شریف صاحب کی بیگم اپنی تین پوتیوں کو لیے آ گئیں۔ دو گھر چھوڑ کر رہنے والی باجی طاہرہ بھی اپنی بھانجی کے ساتھ آن پہنچیں۔ شروع میں یہ چھ بچیاں قرآن پڑھنے آنے لگیں۔ نسیم نے نورانی قاعدے سے پڑھانا شروع کیا۔ صبح صبح ان کا صحن بچیوں کی آوازوں سے مہکنے لگتا۔

بچیاں الفاظ کی ادائگی سے زیادہ توجہ اپنی ایک لے رکھنے پر دیتیں۔ کبھی کبھی کوئی بچی نیند میں بھی ہوتی تو دوسری بچیاں اس کا مذاق اُڑاتیں۔ نسیم کی تلاوت کلام پاک واقعی بہت خوبصورت تھی۔ اکثر مائیں اور دادیاں بھی اس کی تلاوت سننے وہیں بیٹھ جاتیں۔ نسیم قرآن پڑھا کر آخر میں بہت دل سوزی سے دعا مانگتی۔ اس کا مقصد اس طرح بچیوں کو دعائیں یاد کروانا ہوتا۔ روز مائیں بھی اپنی دعائیں اِس دعا میں شامل کر دیتیں۔ وہ سب اِس دعا کے ذریعے ربّ کے ساتھ بھی جڑتی جا رہی تھیں اور آپس میں بھی ایک دوسرے سے محبت کے رشتے مضبوط ہوتے جا رہے تھے۔

کچھ عرصے بعد ماؤں کے اصرار پر اب عصر کے بعد بھی نسیم بچیوں کو قرآن پڑھانے لگی۔ یہ بچیاں صبح شام اس کے ساتھ مل کر گھر کے بہت سے کاموں میں مدد بھی کروا دیتیں۔ سبق یاد کرتے کرتے بہت سے کام ہو جایا کرتے۔ اب پھوپھی امّاں کا دل بھی اِس آمدورفت سے خوش رہتا۔ البتہ ایک غلام محمد تھا جس کے رویے میں کسی قسم کی تبدیلی کے کوئی آثار نہ تھے۔

نسیم کا پاؤں بھاری ہونا پورے گھر کے لیے خوشی کی خبر ثابت ہوئی۔ پھوپھی امّاں نے پہلے ہی روز نسیم کو دھمکی دے ڈالی کہ بیٹا ہی ہونا چاہیے۔ نسیم کی ماں بھی اس روز بیٹی سے ملنے آئی ہوئی تھی۔ اُسے یہ دھمکی بہت ناگوار گزری اور اس سے رہا نہ گیا۔

"آپا خود تو پہلے تین بیٹیاں پیدا کیں چوتھے نمبر پر غلام محمد پیدا ہوا تھا اور میری معصوم بچی کو پہلی بار میں یہ دھمکی۔۔۔؟"

پھوپھی امّاں بھاوج کے سامنے تو خاموش ہو گئیں مگر رات گئے غلام محمد کی آمد پر خوب دل کی بھڑاس نکالی اور بھاوج کی باتوں کا غصّہ بہو پر خوب اچھی طرح نکالا۔

اِس خوش خبری کا استقبال اِس بھیانک انداز میں ہو گا، یہ نسیم کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ آج تو غلام محمد نے تھپڑوں اور گھونسوں کا بھی خوب استعمال کیا اور اِس 'جہنمی عورت' کے دوزخی ہونے پر مکمل فتویٰ لگا دیا۔ جس عورت سے اس کا شوہر راضی نہیں وہ جنت میں داخل نہیں ہو سکتی۔ نسیم صفائی دینے کے لیے بولنے کی کوشش کرتی تو نیا فتویٰ لگ جاتا، خاموش رہتی تو الگ۔ غلام محمد کی طویل تقریر اور مار پیٹ کے ختم ہونے تک اس پر اپنے ماں باپ کے ساتھ ساتھ تمام بہن بھائیوں سے ملنے پر پابندی لگ چکی تھی۔ بقول غلام محمد ایک بیوی پر سب سے زیادہ حق اس کے شوہر کا اور شوہر پر اس کی ماں کا ہی ہوتا ہے۔

نسیم کے لیے اِس پہلی خوش خبری کا ایک ایک دن نئے عذاب کی طرح تھا۔ بیٹا پیدا کرنے کی یاد دہانی ہمہ وقت کروائی جا رہی تھی اور بیٹی ہونے کی صورت میں نتائج کی ذمہ دار نسیم ہوتی۔

نسیم کا قرآن پاک پڑھانے کا سلسلہ جاری تھا۔ یہ دس بارہ سال کی بچیاں نسیم کے ہر ہر دکھ کو سمجھنے لگی تھیں۔ ان کی ہر ممکن کوشش ہوتی کہ وہ اپنی استانی جی کی کوئی مدد کر سکیں۔ بچیاں صبح سویرے اس کے گھر کی صفائی کر دیتیں۔ برتن دھو کر آٹا گوندھ دیتیں بلکہ ناشتا بھی بنا دیتیں۔ شام والی بچیاں کپڑے دھو کر ڈال دیتیں کھانے کا انتظام کروا دیتیں۔ شام کے وقت کوئی نہ کوئی بچی اچھی چیز یا مزے کا سالن آنکھ بچا کر نسیم کے کمرے میں رکھ جاتی اور دعاؤں کے رشتے نے تو ان

سب کو ایک دوسرے سے جوڑ ہی رکھا تھا۔

اِن نو ماہ میں روز صبح شام سب نے نسیم کے لیے اولادِ نرینہ کی دعا کی۔ اس لیے نہیں کہ ان کی نظر میں بیٹے کی ہی اہمیت تھی، بلکہ اس لیے تاکہ نسیم پر آنے والی متوقع مصیبتوں کو ٹالا جا سکے۔ نسیم نے آدھی راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر بیٹا مانگا تھا۔ پورا محلّہ اس کے لیے دعا گو تھا۔ یہ سردیوں کی ایک سرد اور دھند میں لپٹی صبح تھی جب مقامی اسپتال میں نسیم نے ایک بچی کو جنم دیا۔ پھوپھی امّاں اور غلام محمد تو بچی کی ولادت کا سنتے ہی واپس گھر آ گئے۔ پھوپھی امّاں نے مہربانی یہ کی کہ نسیم کی ماں کو فون کر دیا۔ اسپتال کا بل ادا کر کے نسیم کی ماں اُسے اپنے گھر لے گئی۔ چالیس روز نسیم وہیں رہی۔ ننھی بچی بالکل اپنی ماں جیسی تھی۔ پھولوں کی سی کھلی کھلی۔ سفید روئی کے گالوں جیسی اور ماں جیسی بھوری کانچ سی آنکھیں۔ نسیم نے اس کا نام عائشہ صدیقہ رکھا۔ اس کے محلے کی عورتیں اور اس کی شاگرد بچیاں بچی کو دیکھنے نسیم کی ماں کے گھر آئیں اور اپنی استطاعت سے بڑھ کر بچی کو تحائف اور رقوم دیں۔

سوا مہینے بعد پھوپھی امّاں پوتی کو لینے بھائی کے گھر آئیں۔ بھائی کے سامنے نسیم کی ہزار برائیاں اور سب سے بڑا قصور بیٹی پیدا کرنے کو معاف کرتے ہوئے ساتھ لے جانے کی خوش خبری سنا کر گویا ان پر احسان جتانے لگیں۔ کہنے کو تو نسیم کی ماں کو بھی لاکھ گلے تھے مگر بھائی اپنی بیٹی کا گھر بچانے کے لیے خاموش رہا۔ گلابی کمبل میں لپٹی اِس پیاری سی بچی کو لیے نسیم واپس سسرال آ گئی۔ اس کے حساب میں ایک اور گناہ لکھ لیا گیا تھا اور میکے والوں سے ملنے یا بات کرنے پر پھر سے پابندی لگا دی گئی تھی۔

غلام محمد ہمیشہ اپنی بہنوں کے بچوں کے خوب چونچلے اُٹھایا کرتا مگر ننھی عائشہ کو دیکھنا بھی اس کی اَنا کے خلاف ٹھہرا۔ نسیم کا اتنے دن میکے رہنا وہ جرم تھا جس کی معافی ممکن نہ تھی اور سب سے بڑا احسان نسیم کو بچی سمیت گھر واپس آنے کی اجازت دینا۔ اپنے تئیں غلام محمد نے بہت اعلیٰ ظرفی دکھائی تھی۔ اس کی دکان اِن دو سالوں میں ڈیپارٹمنٹل سٹور بن چکی تھی۔ شادی کے بعد سے اس کی آمدن میں نمایاں اضافہ ہوا تھا۔

نسیم کو خرچ کے نام پر الگ سے ایک پیسا بھی دینے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی تھی۔ بچی کی پیدائش پر بھی سارا خرچ نسیم کے والدین نے اٹھایا تھا۔ نسیم کی واپسی پر اس کی ایک شاگردہ نے اپنے گھر سے روز دودھ لا کر دینا شروع کر دیا۔ دوسری شاگردہ کی ماں دیسی گھی تو تیسری پنجیری بنا کر لے آئی۔ بچی کو سنبھالنے کے لیے یہ بچیاں ہمہ وقت تیار رہتیں۔ کوئی نہ کوئی عورت عائشہ کے لیے فراک سی کر لے آتی۔ گھر میں قرآن کی تعلیم پھر سے جاری ہو گئی۔ نسیم اس میں خوب مصروف رہتی۔ غلام محمد کے گھر آنے کے اوقات میں خاموشی ہو جاتی۔ عائشہ کو بھی سلا دیا جاتا ورنہ اس کی آواز سن کر غلام محمد ناراض ہوتا۔

باپ نے عائشہ کو پہلی بار گود میں اٹھایا جب گرمیاں آ چکی تھیں۔ چھ سات ماہ کی گول مٹول سرخ سفید بچی گھٹنوں گھٹنوں چلتی خود ہی باپ کے پاس آ گئی۔ نسیم کسی کام میں مصروف تھی۔ اتنی معصوم مسکراہٹ پر باپ نے بیٹی کو گود میں اٹھا ہی لیا پھر نسیم کو آواز دی اور ماؤں کے اولاد کی طرف سے ایسے غافل رویے پر بہت سی وعیدیں سنائیں۔ آخری جملہ وہی تھا کہ جس عورت سے اس کا خاوند راضی نہیں وہ جہنمی ہے۔ عائشہ کو گود میں لے کر پشیمان اور شرمندہ نسیم اندر کمرے میں چلی گئی۔

اگلے سال پھر وہی آزمائش آن پڑی۔ نسیم پھر امید سے تھی اور اِس مرتبہ غلام محمد نے بیٹی ہونے کی صورت میں طلاق کی دھمکی بھی دے دی تھی۔ نسیم کی حالت روز بروز خراب ہوتی جا رہی تھی۔ طلاق کی تلوار غلام محمد روز اس کے سر پر لٹکاتا۔ نسیم کا مرجھایا ہوا زرد چہرہ اُسے نفسیاتی تسکین دیتا۔

نسیم کے جہیز اور بری کے کپڑے پہن پہن کر اب بالکل گھس چکے تھے۔ پھوپھی امّاں نے کئی مرتبہ گرمیوں اور سردیوں میں اپنے اور بیٹے کے بہت سے کپڑے خریدے اور سلوائے مگر نسیم دونوں میں سے کسی کی ذمہ داری نہیں تھی۔

اِس مرتبہ اس کے ہاں دوسرے بچے کی پیدائش گرمیوں میں متوقع تھی۔ یہ پرانے اور خستہ حال کپڑے اس کے پھیلے ہوئے وجود کو ڈھانپنے میں ناکام تھے۔ شام کو جب غلام محمد گھر آیا تو نسیم بیٹی کو چارپائی پر بٹھا کر کھانا کھلا رہی تھی۔ اس کے دوپٹے کے شگاف اس کے بال ڈھانپنے سے قاصر تھے قمیص کو تین جگہ سے سیا گیا تھا مگر پھر بھی اس کا جسم کہیں کہیں سے نظر آ رہا تھا۔

غلام محمد کی نگاہ نسیم کے بے رونق اور تھکے ہوئے زرد چہرے پر پڑی اور ساتھ ہی اُس نے نسیم پر تھپڑوں اور گھونسوں سے حملہ کر دیا۔ ''لعنت ہے ان عورتوں پر جو کپڑے پہن کر بھی ننگی رہتی ہیں۔ یہ تم قرآن پڑھاتی ہو؟ اور خود ایسے عریانی اور فحاشی پھیلا رہی ہو۔'' نسیم خوفزدہ ہو کر مار کھاتی رہی۔ عائشہ سہم کر زور زور سے چیخنے لگی۔ سیانی پھوپھی امّاں ایسے موقعوں پر کمرے سے باہر نہیں نکلتی تھیں کہ یہ میاں بیوی کا آپس کا مسئلہ ہے۔ نسیم بے دم ہو کر چارپائی پر ڈھے گئی۔ اس کے کپڑے مزید پھٹ گئے۔

''جاؤ جا کر ڈھنگ کے کپڑے پہنو۔'' غلام محمد غصّے سے چلایا۔

''کون سے کپڑے؟ میرے تو سارے کپڑے ایسے ہی پھٹے ہوئے ہیں۔ عورتوں کے جسم ڈھانپنے کے لیے کپڑے خریدنے بھی تو پڑتے ہیں۔'' نسیم کانپتے ہوئے سہم کر بولی۔

''شوہروں کے آگے زبان چلانے والی عورتیں جہنمی ہوتی ہیں''۔ غلام محمد غرایا

غصّے سے نسیم کو دیکھتا وہ کمرے میں آ گیا۔ نسیم کا بکس کھولا جو واقعی سارا ہی پھٹے پرانے کپڑوں سے بھرا تھا۔ ''چار سال میں اِس منحوس عورت نے ایک بھی کپڑا سلامت نہ چھوڑا۔ پورے دس جوڑے بنائے تھے میری ماں نے۔'' غلام محمد کا کمال یہی تھا کہ وہ ہر بات میں قصور بیوی ہی کا نکال لیتا۔

''اللہ بھی اپنے پیارے بندوں کا ہی امتحان لیتا ہے۔ یا شاید میں واقعی جہنمی ہوں۔ میں نے کتنا تڑپ تڑپ کر بیٹا مانگا، کتنی ہی منتیں مانگیں۔ کتنا قرآن پڑھا، پڑھایا۔ دعائیں کیں مگر اللہ سائیں نے مجھے پھر بیٹی دے دی۔'' نسیم لیڈی ڈاکٹر کو اپنی ماں کا فون نمبر دیتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو دی کیونکہ اِس مرتبہ پھوپھی امّاں اور غلام محمد اُسے تنہا اسپتال میں چھوڑ کر واپس جا چکے تھے۔ یہ تو اس کی شاگردہ کی ماں تھی جو عائشہ کو لیے لیبر روم کے باہر موجود بینچ پر بیٹھی رہی اور جس کے پاس نئی بچی کے لیے کپڑے بھی تھے۔

اِس مرتبہ پھر نسیم پر فردِ جرم لگا دی گئی تھی... اس کا قصور دوسری مرتبہ بیٹی کی پیدائش تھا۔ ننھی فاطمہ زہرا بہت ہی حسین بچی تھی۔ بالکل صابر اور پرسکون۔ اِس بار نسیم پورے تین ماہ اپنی ماں کے گھر رہی۔ پھوپھی امّاں اور غلام محمد نے ایک مرتبہ بھی آنے کی زحمت نہ کی۔

ان دنوں غلام محمد کو کاروبار میں بہت منافع ہوا۔ اس نے اپنے سٹور کو سیلف سروس مال بنا لیا۔ اس کے ملازمین کی تعداد بھی بڑھ گئی اور اس کی کھٹارا موٹر سائیکل کی جگہ ایک کار بھی خرید لی گئی۔

تین ماہ بعد پھوپھی اماں پھر نسیم اور اپنے بھائی پر احسان کرتی اسے لینے آ گئی تھیں۔ مجبوری تھی کہ اس بڑھاپے میں گھر کے کام کاج اور غلام محمد کے نخرے اب اُٹھائے نہ جاتے تھے۔ سارا گھرانا ہی نسیم کا محتاج تھا مگر اس حقیقت کا ادراک کبھی نسیم کو نہ ہونے دیا گیا۔

''پھوپھی امّاں! غلام محمد نے تو مجھے بچی ہونے کی صورت میں طلاق دینے کا کہا تھا۔ میری بچی کے بعد میری تو طلاق ہو گئی ہے ناں''۔ نسیم نے دل کی بات کہہ دی۔

''ارے بیٹا یہ تو سارے مرد ایسے ہی کرتے ہیں۔ بھلا دھمکیوں سے طلاق تھوڑی ہو جاتی ہے۔ وہ تو بس تجھے غصّے میں دھمکاتا تھا۔'' پھوپھی امّاں بڑی محبت سے بولیں۔

''ابّاجی! اب آپ کسی عالم سے فتویٰ لیں۔'' نسیم نے باپ کو بیچ میں ڈالا''۔ ابّاجی اور غلام محمد ایک مفتی صاحب کے پاس گئے اور پھر طلاق نہ ہونے کے فیصلے کے ساتھ واپس آئے۔ خاندان بھر میں اِس معاملے کا چرچا تھا۔ نسیم کو پھوپھی امّاں دونوں بچیوں کے ساتھ واپس لے آئیں۔

ڈھائی سالہ عائشہ صدیقہ اور تین ماہ کی فاطمہ زہرا۔ غلام محمد نے دونوں کو ہی دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ کاروبار میں زبردست ترقی کا کچھ بھی اثر گھر کے ماحول یا رویوں پر نہ پڑا تھا۔ صرف پھوپھی امّاں کے بازو میں دو کڑے، کانوں میں بالیاں اور مہنگے کپڑوں کا اضافہ ضرور ہوا۔ اِس کے علاوہ گھر کی ہر چیز ویسی کی ویسی تھی جس میں سب سے اہم چیز نسیم کی اپنی اہمیت اور حیثیت۔

قرآن کی تدریس کا سلسلہ پھر شروع ہو چکا تھا۔ اب عائشہ بھی دوسری بچیوں کے ساتھ دوپٹا اوڑھ کر بیٹھنے لگی تھی۔ زندگی دھکے کھانے کے بعد پھر سے رواں ہو رہی تھی۔

نسیم کی زندگی میں تیسرا امتحان اگلے برس ہی آن پہنچا۔ نسیم نے اِس بار خود کو اپنے ربّ کے حضور گڑگڑانے والی بنا لیا۔ وہ خاموشی سے غلام محمد کی باتیں سنتی، مار کھاتی پر ایک حرف زبان پر نہ لاتی۔ غلام محمد کو اس کی خاموشی پر بھی آگ لگ جاتی۔ اس کے صبر کو وہ ڈھٹائی کا نام دیتا۔

''شوہروں کی ناشکری کرنے کی وجہ سے عورتوں کی اکثریت جہنم میں ہو گی''۔ اگر عورت کو اللہ نے عقل دی ہوتی تو وہ بھلا کیوں اس کی گواہی کو آدھا کر دیتا... عورت کم عقل ہے۔ ناشکری، زبان دراز، جہنمی...'' جتنا وقت وہ گھر میں رہتا، یہی جملے دہراتا رہتا۔

باپ کو دیکھ کر بچیاں کونوں میں چھپ جاتیں۔ نسیم خاموشی سے اپنے کاموں میں لگ جاتی۔ بچیوں کی مسکراہٹ، شوخیاں اور معصومیت سب ہی گم ہو جاتا۔ نسیم کے لیے یہ نو ماہ پہاڑ جیسی آزمائش کے تھے۔

تیسری مرتبہ اللہ کے کرم سے نسیم نے جڑواں بیٹوں کو جنم دیا۔ غلام محمد بہت خوش تھا۔ پھوپھی امّاں نے مٹھائی محلّے بھر میں تقسیم کروائی۔ نسیم کو اسپتال سے گھر لائیں۔ بیٹوں کی خوب آؤ بھگت ہو رہی تھی۔ نندیں بھی بھاگی بھاگی آئیں۔

یہ نسیم کی خام خیالی تھی کہ بیٹوں کے بعد اس کی آزمائش کچھ کم ہو جائے گی اور اب غلام محمد اپنی اولاد پر کچھ خرچ کیا کرے گا، مگر ہوا یہ کہ بیٹیوں اور بیٹوں کے لیے رویّوں کا فرق ایک نئے پہاڑ کی صورت کھڑا ہو گیا۔ عائشہ اور فاطمہ دونوں بہت حسین ہونے کے ساتھ ساتھ ذہین بھی تھیں مگر غلام محمد انھیں تعلیم دلانے کے حق میں نہ تھا۔ نسیم نے بڑی مشکل سے باپ سے اجازت لے کر انھیں سرکاری اسکول میں داخل کروایا۔ چند ہی برس بعد عمر اور علی کے لیے مہنگے انگریزی میڈیم اسکول کا انتخاب ہوا۔ کاروبار میں بے تحاشا اضافے کے باوجود نسیم کو گھر کے خرچ اور بچیوں کی تعلیم کے لیے بہت ہی کم پیسے دیے جاتے۔

''فضول خرچ عورتیں جہنمی ہوتی ہیں''۔ قرآن پڑھانے والی لیکن اس پر عمل نہ کرنے والی عورتیں بھی دوزخ میں ہی جائیں گی۔'' جانے عورتوں کے جہنم میں جانے کی اتنی بے شمار احادیث غلام محمد کو کس نے سنائی تھیں۔ شوہر کے آگے بولنے والی، بات کرنے والی، اپنی بات کی وضاحت دینے والی، سب عورتیں ناشکری ہو جاتیں اور پھر سیدھی جہنم میں پہنچ جاتیں۔

عائشہ اور فاطمہ نے سرکاری اسکول سے امتیازی نمبروں سے میٹرک کر لیا۔ وہ گھریلو کاموں میں بھی بہت طاق تھیں۔ ان کی خوبصورتی، معصومیت اور سگھڑ پن نے انھیں ہر جگہ

نمایاں کر رکھا تھا۔ نسیم انھیں اعلیٰ تعلیم دلوانا چاہتی تھی۔

اب اس کے پاس قرآن پڑھنے آنے والی بچیوں کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی تھی۔ مائیں اپنی بچیوں کو استانی جی سے قرآن پڑھنے بہت شوق سے بھیجتیں۔ عائشہ اور فاطمہ بھی ماں کی طرح خوبصورت قرآت سیکھ چکی تھیں سو اکثر وہ دونوں بھی بچیوں کو سبق دے دیا کرتیں۔ علی اور عمر بھی ماں ہی کی طرح بہت سہمے ہوئے خوفزدہ بچے تھے۔ باپ کی ماں کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں کا اثر بچوں پر بہت گہرا تھا۔ اچھا اسکول بھی انھیں اعتماد دینے سے قاصر رہا تھا اور روز جیب خرچ کے طور پر ملنے والی رقم بھی ان کے دلوں میں باپ کی محبت یا لگاؤ پیدا کرنے میں ناکام رہی تھی۔

فجر اور عصر کے بعد پرندوں کی چہچہاہٹوں کی مانند بچیوں کی قرآن پڑھنے کی آوازیں نسیم کے صحن کو رونق بخش دیتیں۔ کبھی کوئی بچی گھٹنوں تک آتے فراک پر بڑا سا دوپٹا اوڑھے نورانی قاعدہ پکڑے آن پہنچتی تو کوئی توتلے انداز میں الفاظ دُہرا رہی ہوتی۔ کچھ بچیاں ہفتوں ہفتوں بس ہلنے اور سر ہلانے کی مشق کرتی رہتیں۔ اب اس کی شاگردوں کی دوسری نسل بھی اس کے پاس آنے لگی تھی۔ محلّے بھر میں استانی جی کی شرافت اور قرآن سے محبت کی مثالیں دی جاتیں۔ محلّے کی ہر ماں اپنی بچیوں یا بیٹوں کے لیے مشورہ کرنے، دعائیں کروانے نسیم کے پاس آتیں۔ پھوپھی امّاں کی چارپائی اب بھی داخلی دروازے کے سامنے ہوتی، بس اب عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کی تیز نگاہیں کچھ کمزور ہوتی جا رہی تھیں مگر ان کی نگرانی اب بھی بہت کڑی تھی۔

عائشہ کے میٹرک کرنے کے بعد نسیم پر ایک اور کڑا امتحان آن پڑا۔ بچی پڑھائی میں بہت اچھی تھی اور اسے پڑھنے کا شوق بھی بہت تھا مگر غلام محمد اس حق میں نہ تھا۔ اُوپر سے تینوں نندوں نے اپنے اپنے بیٹوں کے لیے سوال کر رکھا تھا۔ غلام محمد کے بھانجے اسکول کی شکل بھی نہ دیکھے ہوئے تھے۔ ایک مستری، دوسرا ویلڈر اور تیسرا بس مرغے لڑاتا یا پیسوں پر شرطیں لگاتا۔ باپ سعودی عرب سے محنت کر کے پیسے بھیجتا اور بیٹا اپنے شوق پورے کرتا۔

پھوپھی امّاں کے لیے تینوں نواسے برابر تھے اور ''بہترین'' بھی مگر پوتی فی الحال ایک ہی تھی۔ سو فیصلہ کرنا کٹھن تھا۔ نسیم کو یوں لگتا جیسے وہ اپنے ساتھ کم عمری میں ہونے والی زیادتیوں کا اپنی بیٹی کے لیے دروازہ کھول رہی ہے۔ اللہ سے مانگنے گڑگڑانے کا سلسلہ پھر بہت طویل ہوتا جا رہا تھا۔ اللہ تو مسبب الاسباب ہے، مقلب القلوب ہے، مفتح الابواب ہے۔ میری فریاد سن لے۔ صبح شام دعائے استخارہ پڑھتی کہ ''اے اللہ اگر اِس معاملے میں بھلائی ہے تو ٹھیک اور اگر برائی ہے تو اسے مجھ سے دور کر دے۔''

گرمیوں کی طویل دوپہر کے بعد عائشہ نے عصر کے وقت صحن میں چھڑکاؤ کر کے چارپائیاں بچھا دیں۔ بچیاں اپنا سبق یاد کر رہی تھیں۔ ساتھ والے پڑوسی محمد بخش صاحب کی بیگم اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ چلی آئیں۔ یہ دونوں نسیم کی پہلی شاگرد تھیں۔ اندر کمرے میں بیٹھ کر پانی پیتے دونوں بچیاں حیران تھیں کہ سولہ سترہ برسوں میں استانی جی خود اور ان کا گھر بالکل ویسے کے ویسے تھے جبکہ غلام محمد کی کریانے کی دکان اب علاقے کے بہترین شاپنگ مال میں تبدیل ہو چکی تھی۔

استانی جی آج ہم آپ سے عائشہ کے لیے اپنے بھائی کا رشتہ مانگنے آئے ہیں۔ بڑی بیٹی نے ماں سے پہلے اپنے آنے کا مقصد بتا دیا۔ آرمی میں کیپٹن ڈاکٹر وحید سے بھلا استانی جی کیسے ناواقف ہو سکتی تھیں۔ کتنے سال انھوں نے اپنی پڑوسن کے کہنے پر اس کا نام لے لے کر کامیابی کے لیے دعائیں مانگی تھیں۔ اب وہ پڑوسن اپنے سب سے لائق بیٹے کے لیے نسیم کے سامنے جھولی پھیلائے بیٹھی تھیں۔

''بے شک میرے رب تو ہی میرا مولیٰ ہے، میرا مالک ہے۔ تو سنتا ہے۔ تو در کھولتا ہے، آسانیاں کر دیتا ہے''

بے اختیار نسیم کی آنکھوں سے تشکر کے موتی بہنے لگے۔

اب یہ رشتہ غلام محمد کے سامنے رکھا گیا۔ مگر بھانجوں کا پلڑا بھاری تھا۔ نسیم نے زندگی میں پہلی بار غلام محمد سے بحث کی۔ آخر پھوپھی امّاں اور غلام محمد نے نسیم کو اپنے بل بوتے پر بیٹی کی شادی کرنے کی اجازت دیتے ہوئے ہر خرچ سے لاتعلقی ظاہر کر دی۔ غلام محمد نے نسیم کو اِس من مانی کے لیے ایک دھیلا بھی دینے سے انکار کر دیا۔

محمد بخش کے گھر والوں نے جہیز کے نام پر کچھ بھی لینے سے منع کر دیا تھا پھر بھی ایک ماں اپنی بیٹی کو خالی ہاتھ کیسے رخصت کر دیتی۔ اور کچھ نہیں تو کھانے پینے اور بارات کے کھانے پینے کا انتظام تو کرنا ہی تھا۔ نسیم کے پاس جمع پونجی کے نام پر کچھ بھی نہ تھا۔ پھوپھی امّاں کے کوسنے اور بددعائیں الگ جاری تھیں۔ مگر نسیم نے اپنے ربّ پر بھروسہ کرتے ہوئے رشتے کے لیے ہاں کر دی۔ اب اس کا ساتھ دینے کے لیے سارا محلّہ کھڑا تھا۔ اس کا باپ، بھائی سب موجود تھے۔ شادی کی تاریخ فوراً طے کر دی گئی اور اگلے مہینے ہی کیپٹن صاحب کو بارات لانے کی تاریخ دے دی گئی۔ پورا مہینہ نسیم نے جان کنی کی سی حالت میں گزارا۔ شادی کے لیے واقعی کچھ ہاتھ پلّے نہ تھا۔ عائشہ کی بارات سے ایک روز پہلے غلام محمد حسبِ معمول اپنے اسٹور پر جا چکا تھا۔ نسیم کی تینوں نندیں اپنے بچوں کے ساتھ تماشا دیکھنے آ پہنچیں۔ عائشہ سسرال کی طرف سے آئے پیلے جوڑے میں خوف سے بیٹھی ہول رہی تھی۔ ماں کی یہ پہلی بغاوت نہ صرف اس کے بلکہ باقی تینوں بزدل بہن بھائیوں کے لیے بھی ایک خوفناک مہم کی مانند تھی۔

شام ہوتے ہوتے محلّے سے نسیم کی تمام شاگردیں سجی سنوریں آنا شروع ہوگئیں۔ صحن میں شامیانہ لگ چکا تھا۔ دیگیں محلّے کے میاں جی اپنی زیرِ نگرانی پکوا رہے تھے۔ شادی کا تمام انتظام اہلِ محلہ سنبھال چکے تھے۔ گھر کا ایک کمرہ خالی کر دیا گیا تھا جس میں عائشہ کے جہیز کی چیزیں اکٹھی کر کے رکھی جانی تھیں۔ گھنٹے بھر میں بہترین چمکتا ہوا فرنیچر، فریج، ٹی وی، پنکھا، کراکری، پیٹی، بستر سب جمع ہو چکے تھے۔ سب خواتین نے باقاعدہ منصوبہ بندی سے چیزیں باہم تقسیم کی تھیں۔ بھلا اٹھارہ برس سے بلامعاوضہ قرآن پڑھانے والی استانی جی کو کیسے تنہا چھوڑا جا سکتا تھا؟ کپڑے اور زیور بھی اس کمرے میں پیک شدہ پہنچ چکے تھے۔ سب چیزیں پھوپھی امّاں اور ان کی بیٹیوں کی تسلی کے لیے یہاں اکٹھی کی گئی تھیں اور رات کو کیپٹن صاحب کے ہاں پہنچا دی گئیں۔

اگلے روز بارات کا انتظام اس سے بھی زیادہ شاندار تھا۔ غلام محمد مجبوراً دنیا دکھاوے کو بارات کے استقبال کے لیے آن پہنچا تھا۔ اس کے دونوں بیٹے بڑی سنجیدگی اور ذمہ داری سے مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے، یوں کہ جیسے وہ نہ بھی آتا تو کوئی کام رکنے والا نہ تھا۔ شادی میں شریک ہر ایک مرد نے غلام محمد کو مبارکباد کے ساتھ سلامی کا لفافہ دیا۔ جن میں پیسوں کی مالیت ہزاروں میں تھی۔ نکاح میں حق مہر خاصا بھاری باندھا گیا جو فوری طور پر دلہا نے ادا کر دیا۔ بڑی عزت احترام سے عائشہ رخصت ہو کر اپنے سسرال گئی۔ ممنونیت سے اس کا سارا سسرال بچھا چلا جا رہا تھا۔

نسیم کے لیے نیا جوڑا جانے کون لایا تھا مگر اس خوبصورت سوٹ میں وہ جنت کی حور کی مانند سیپ میں بند موتی لگ رہی تھی۔ بے شک میرا مولیٰ سنتا ہے۔ بے شک شکر کے الفاظ اور اشکوں کے موتی مسلسل اس کی زبان اور آنکھوں سے رواں تھے۔ اللہ اس کا سب سے بڑا سہارا، اس کا مددگار تھا۔

اگلے روز ولیمہ بہت شاندار تھا۔ غلام محمد، اس کی ماں اور بہنیں سارے انتظامات، عائشہ کا لباس اور زیورات حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ کیپٹن وحید اور اس کے رشتے داروں نے انھیں کسی بات پر شرمندہ نہ کیا تھا جیسے اپنی شادی سے لے کر آج تک غلام محمد اپنے ماموں کو کرتا آیا تھا۔ عائشہ کی پڑھائی دوبارہ سے شروع کروا دی گئی تھی۔ نسیم اپنی بیٹی کی خوش گوار ازدواجی زندگی دیکھ کر بہت خوش تھی۔

غلام محمد کی اپنے گھر سے بے نیازی اب مزید بڑھتی جا رہی تھی۔ اب وہ نسیم کو بات بے بات زیادہ ملّانی ہونے کے طعنے دیتا اب وہ جہنمی عورت 'منافق' بھی بن چکی تھی جس نے خود پر مظلومیت کا پردہ ڈال کر سارے محلّے کو بے وقوف بنایا تھا۔ قرآن کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کیا تھا اور قرآن پڑھانے کا معاوضہ بیٹی کے جہیز کی صورت میں وصول کیا تھا۔

عائشہ کی شادی کے دو سال بعد نسیم نے اسی طرح فاطمہ کا بھی بہت اچھی جگہ رشتہ کیا۔ محلّے کے لوگ پھر نسیم کے لیے ڈھال بن گئے۔ دنوں بیٹیوں کو اپنے گھروں میں آباد دیکھ کر نسیم اپنے دکھ بھول ہی گئی۔ وہ اب بھی بہت دلجمعی سے قرآن پڑھاتی۔ اس کی تلاوت سننے بہت سی خواتین آتیں اور پھر وہ سب دعاؤں کی لڑیوں میں جڑ جاتیں۔

عمر اور علی نے بھی پڑھائی کے میدان میں کامیابی حاصل کی۔ غلام محمد ان دونوں کے میٹرک کے بعد انھیں اپنے کاروبار میں شامل کرنا چاہتا تھا مگر بیٹوں اور باپ کے درمیان بہت فاصلہ تھا۔ وہ عموماً باپ اور دادی کی ماں سے زیادتیوں پر غصّے میں آجاتے مگر ماں نے ہمیشہ انھیں خاموش رہنے اور باپ کا احترام کرنے کا درس دیا تھا۔

ایف ایس سی کے رزلٹ سے پہلے ہی دونوں بیٹوں کی سلیکشن فوج میں ہو گئی اور دونوں لمبے تربیتی کورس کے لیے کاکول چلے گئے۔ غلام محمد نے اس فیصلے پر بھی نسیم سے بہت جھگڑا کیا۔ اب وہ منافق سے جھوٹی، مکار اور دھوکے باز کی مسند پر فائز ہو چکی تھی، جس نے بچوں کو باپ سے متنفر کر دیا تھا۔ نسیم سب باتیں، گالیاں، دھمکیاں سن لیتی مگر جہنم کی وعیدیں جو پچھلے بیس برس سے تسلسل اور تواتر سے دی جا رہی تھیں اس کے حوصلے کو توڑ کر رکھ دیتیں۔ وہ عورت جس سے اس کا شوہر راضی نہیں وہ جہنمی ہے۔ یہ غلام محمد کا تکیہ کلام بن چکا تھا۔

پھوپھی امّاں اب ضعیفی کے اُس مرحلے میں داخل ہو چکی تھیں جہاں انھیں نسیم کی مکمل مدد ہر وقت درکار ہوتی۔ نسیم انھیں بہت محبت اور ذمہ داری سے سنبھالتی۔ بچوں کے اپنے گھروں کو جانے کے بعد اب دونوں ساس بہو ایک دوسرے کے لیے سہارا بھی تھیں مگر پھوپھی امّاں اب بھی شام کو غلام محمد سے اس کی بیوی کا گلہ کرنا نہ بھولتیں۔ روز اس کی کوئی نہ کوئی کوتاہی ان کی زبان پر ہوتی۔ اب منافق، جہنمی اور دھوکے باز کے بعد نسیم سست، کاہل اور احسان فراموش بھی ہو گئی تھی۔ ساس کی خدمت میں کوتاہی پر کوئی وعید غلام محمد کو تلاش کے باوجود نہ ملی تھی سو اب اس کی گالیوں کا رخ اس کی ذات کی طرف ہو چکا تھا۔

استانی جی کی شاگرد اب ہر عمر کی تھیں۔ چھوٹی پانچ چھ برس کی بچیوں سے لے کر بڑی عمر کی خواتین تک۔ قرآن کی تعلیم نسیم کی زندگی کا وہ مقصد اور کام تھا جو اسے مصروف بھی رکھتا اور اسے سکون بھی دیتا۔

اب نسیم کے بیٹے بھی کمانے لگے تھے۔ وہ چھٹیوں میں ماں کے لیے کسی نہ کسی سہولت کا انتظام کر جاتے۔ برسوں بعد اِس گھر کی مرمت ہوئی۔ سفیدیاں کروائی گئیں، غسل خانہ دوبارہ سے بنایا گیا، پانی کی موٹر اور ٹینکی لگوائی گئی۔ اگلے برس بیٹوں نے ماں کے لیے نئے بیڈ اور صوفے خریدے۔ نئے برتن اور گھر کے لیے نئی چیزیں جن کی خواہش کبھی نسیم

کے دل میں ہوتی تھی۔ عائشہ اور فاطمہ ہر بار ماں کے لیے کپڑے سلوا کر لے آتیں۔ نرم اور آرام دہ جوتے، چپل۔ نسیم نے اس گھر سے نکلنا عرصۂ دراز سے چھوڑ دیا تھا۔ جب کبھی اس نے کسی غمی خوشی میں جانے کی اجازت مانگی، تو غلام محمد نے اسے 'گھر میں ٹک کر رہا کرو' کہہ کر انکار کر دیا تھا۔

دنیا کے رنگ، نئی چیزیں، نئے لوگ استانی جی کے لیے افسانوں کی طرح تھے۔ غلام محمد کا سٹور ہر نئے فیشن کی چیز سے بھرا ہوتا۔ کریانہ، کراکری، ڈیکوریشن، جیولری، جوتے، پرس، الیکٹرانکس، موبائل مگر نسیم کو کبھی گھر سے نکلنے کی اجازت نہ ملی۔ جب اس نے پہلی بار اپنی عائشہ کے ہاتھ میں موبائل فون دیکھ کر پوچھا تھا کہ یہ کیا ہے، تب بیٹی کو ماں پر بہت پیار آیا۔ وہ خوب ہنسی اور پھر اُسے موبائل پر دنیا کی بہت سی تصویریں دکھائیں۔ پہاڑوں، دریاؤں کا ذکر تو نسیم نے سنا تھا مگر اصل میں یہ کیسے دکھتے ہوں گے اس دن موبائل پر دیکھا۔

عیدالفطر کی آمد آمد تھی۔ نسیم اس بار اپنے بچوں کی منتظر تھی۔ وہ روز پھوپھی امّاں کے سامنے عائشہ اور فاطمہ کو عید پر بلانے کا ذکر کرتی۔ علی اور عمر کو بھی چھٹیوں پر گھر آنے کی تاکید کی گئی تھی۔ اِس بار اس نے عید کے دن غلام محمد کو بھی بچوں کے ساتھ رہنے کا کہا تھا۔ تم جیسی ناشکری عورتیں ہی مردوں کو خراب کرتی ہیں۔ بھلا کاروبار میں بھی ایسی عیاشیاں کی جا سکتی ہیں؟ عید کے دن چھٹی، یعنی عین کام کا، آمدنی کا دن اور اِن مولوانی صاحبہ کے کہنے پر چھٹی کر لوں۔ جانتی ہو علاقے کی عورتیں، بچیاں اور عزت دار لوگ بہت اعتماد سے ہمارے سٹور پر آتے ہیں۔ اب اس اہم دن پر چھٹی کر لوں۔ میں گھر رہ کر کیا کروں گا؟ عجیب دوزخ بنا رکھا ہے اس گھر کو تم نے۔ جب شوہر کو اس کی بیوی سے گھر کا سکون نہ ملے، وہ گھر دوزخ ہوتا ہے۔ غلام محمد صاحب پھر ڈانٹتے، ناراض ہوتے سٹور پر چلے گئے۔ اب بڑھاپا آن پہنچا تھا مگر ان کا غرور، غصّہ اور بدمزاجی کا عالم وہی تھا۔

روزوں میں نسیم کی صحت میں نمایاں فرق پڑا۔ جس کا سارا الزام پھوپھی امّاں اور غلام محمد اس کی سستی اور کام چوری کو دیتے رہے۔ گرمیوں کے طویل روزے اور پھوپھی امّاں کی مسلسل بیماری، ان کا ہر کام کے لیے بہو کو آواز دینا۔ گھر میں کوئی بھی دوسرا کسی کام اور مدد کے لیے موجود نہ تھا۔ رمضان کے آخر تک نسیم کی کمزوری بہت بڑھ گئی تھی۔ کام کے دوران آنے والے چکر اب آرام کے اوقات میں بھی آنے لگے۔ دل کی گھبراہٹ بھی بڑھنے لگی۔

چاندرات کو علی اور عمر دونوں چھٹی پر گھر پہنچے۔ عائشہ اور فاطمہ بھی اپنے سسرال سے سیدھی ماں کو ملنے آن پہنچیں۔ ماں کی صحت خاصی تشویشناک تھی۔ گھر کا سارا کام بچوں نے سنبھال لیا۔ دونوں بیٹے بھی ماں کے ساتھ لگ گئے۔ عید کے دن بچوں کو دیکھ کر نسیم میں طاقت آ گئی۔ بیٹے، بیٹیاں، داماد، نواسے سب گھر میں جمع تھے۔ عید کی نماز پڑھ کر نسیم کے والد اور بھائی بھتیجے بھی عید ملنے آ گئے۔ بیٹوں نے ماں کو نئے نوٹوں کی گڈی دی تھی تاکہ وہ سب کو عیدی دے سکیں۔ نسیم نے سب کو عیدی دی۔

پھر ایک سلسلہ اس کی شاگردوں کی آمد کا تھا۔ جو سب کھانے پینے کے نت نئے پکوان لیے چلی آ رہی تھیں۔ عید کی صبح خوب پُر رونق تھی۔ آج تو غلام محمد کو بھی نسیم کی صحت کی خرابی کا احساس ہوا۔ اس کا سفید گلابی چہرہ بالکل زردی مائل تھا۔ آواز میں کھنک مفقود تھی مگر اس کے لیے اتنی فکرمند اولاد دیکھ کر وہ پھر چڑ گیا۔ ''ڈرامے باز عورت... سب کی توجہ حاصل کرنے کے لیے ڈرامہ کر رہی ہے۔'' نسیم کے سامنے یہ فقرہ کہتا ہوا وہ اپنے سٹور چل دیا۔

ظہر کی نماز کے بعد نسیم کو بڑا زوردار چکر آیا۔ جاء نماز سے

وہ بمشکل اُٹھ کر اپنے بستر تک آئی۔ ابھی دعا مانگنا رہتا تھا۔

خالہ جان آپ ٹھیک نہیں ہیں۔ ڈاکٹر وحید کو سب سے پہلے اندازہ ہوا۔ انھوں نے نسیم کی نبض چیک کرنے کی کوشش کی۔ عمر اور علی ماں کو دیکھ کر لپکے۔ سب اس کے پاس تھے مگر اس کی روح اپنے ربّ کی طرف لوٹ چکی تھی۔ پرندہ اپنا گھونسلا چھوڑ چکا تھا۔ چہرے پر خوبصورت مسکراہٹ تھی۔ لبوں پر کلمہ مکمل ہو چکا تھا۔ آنکھیں بے نور ہو چکی تھیں، ”اے نفس مطمئنہ چل اپنے رب کی طرف، وہ تجھ سے راضی اور تو اس سے راضی“۔

کیسا نفس مطمئنہ تھا کہ اپنے چاروں جگر گوشوں کے درمیان دنیا سے رخصت ہوا۔ جس کے ذمے کسی کا کوئی قرض، احسان، بوجھ کچھ بھی نہ تھا۔ بس اطمینان ہی اطمینان۔

استانی جی کے انتقال کی خبر منٹوں میں محلے بھر میں پھیل گئی۔ پورا محلّہ یوں اس گھر میں اُمنڈ آیا جیسے یہ ہر گھر کے اپنے عزیز کی فوتیدگی ہے۔ سارے انتظامات اہل محلّہ نے سنبھال لیے۔ غلام محمد کو گھنٹے بھر بعد یہ خبر ملی۔ استانی جی کو رات بھر رکھنے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ تمام اولادیں، رشتے دار سب ہی تو عید کی وجہ سے موجود تھے۔ عصر کے بعد عائشہ اور فاطمہ نے خود اپنی ماں کو نہلا دھلا کر تیار کیا۔ آج اُس کی شان ہی نرالی تھی۔ خوبصورت چہرہ اور پرسکون مسکراہٹ اور ٹھیک اُسی وقت جب اس کا صحن برسوں سے تلاوت سے مہک رہا ہوتا تھا، اسے رخصت کر دیا گیا۔ اسے کندھا دینے کے لیے اس کے جوان بیٹے، بھائی، بھتیجے، داماد سب موجود تھے۔

غلام محمد کو نسیم کا آخری دیدار کرنے کا موقع قبرستان میں ملا۔ جب اُسے قبر میں لٹایا جا چکا تھا۔ بیٹوں نے باپ کو آگے کیا، وہ اُسے دیکھنے کو جھکا۔ نسیم بالکل تازگی سے مسکراتی ہوئی نئے سفید کفن میں لپٹی تھی۔ وہ گلابی ہونٹ جس کی تازگی سے وہ عمر بھر چڑتا آیا تھا آج بہت ہی خوبصورتی سے مسکرا رہے تھے۔ وہ یقیناً نفس مطمئنہ تھی۔ غلام محمد کے دل نے گواہی دی، اس کی آنکھوں سے دو آنسو نکلے اور سیدھے قبر میں جا گرے۔

استانی جی کا جنازہ بہت بڑا تھا۔ ان کی شاگردیں صدمے سے اس قدر نڈھال تھیں کہ سگی بیٹیوں اور باقی بچیوں میں فرق کرنا مشکل تھا۔

اگلے روز صبح سویرے پھر ان کا صحن تلاوت کی مسحور کن آوازوں سے گونج رہا تھا۔ آج وہ خوبصورت تلاوت کرنے والی استانی جی نہیں بلکہ ان کی وہ ہزاروں شاگردیں تھیں جنہوں نے قرآن پاک پڑھنا، اس پر عمل کرنا اور ربّ سے مانگنا اُنھی سے سیکھا تھا۔ ہر ہر بچی صدقہ جاریہ تھی۔ یہ وہ ہزاروں گواہیاں تھیں جو غلام محمد کل سے مسلسل سن رہا تھا۔ استانی جی کے ایمان اور تقویٰ کی گواہیاں۔ اُس ”جہنمی“ عورت کے جنتی ہونے کے حق میں بے شمار گواہیاں۔

عید کے تیسرے روز عائشہ، فاطمہ، اپنے گھروں کو جبکہ عمر اور علی اپنے کاموں پر روانہ ہو گئے۔ کیسی بے ضرر ماں تھی کہ بچوں کو چھٹی لینے کا تردّد بھی نہ کرنا پڑا۔ خاموشی سے ساری زندگی گزاری اور اس سے بھی زیادہ خاموشی سے چلی گئی۔

پھوپھی امّاں تنہا اپنی چارپائی پر لیٹی دن رات نسیم کو یاد کر رہی ہیں اور غلام محمد اس خالی در و دیوار کو دیکھتے ہوئے سوچے چلا جا رہا ہے کہ بھلا اس معمولی سی عورت کے جانے کے بعد اس گھر کا سکون، رحمت اور برکت کہاں کھو گئی ہے۔ جانے یہ پہلے دوزخ تھا یا اب۔ لیکن یہاں اس قدر وحشت پہلے تو کبھی نہ تھی۔ وہ ”جہنمی“ عورت جنّت اپنے ساتھ لے گئی تھی۔

یہی وہ آبگینے ہیں جو گھر بھر کی زینت ہیں
یہی آنکھوں کی ٹھنڈک ہیں
یہی فرحت بھی راحت بھی
انھی سے رونقِ محفل انھی سے حرمتِ محمل
یہی جنت کے زینے ہیں ◆◆◆

APPROVED BY
GDA
36 Monthly Installments

سالانہ خریداری فارم

نام.. فون نمبر..

پتا.. ای میل..

میں ماہ.......... 20ء سے اُردو ڈائجسٹ کا سالانہ خریدار بننا چاہتا ہوں۔ مجھے اُردو ڈائجسٹ ارسال کر دیجیے۔

1۔ بذریعہ وی پی میں سالانہ قیمت پوسٹ مین کو ادا کر دوں گا۔ یا

2۔ میں مطلوبہ رقم.................. روپے کا بینک ڈرافٹ / منی آرڈر ارسال کر رہا ہوں۔ یا

3۔ میں نے.................. روپے اُردو ڈائجسٹ کے اکاؤنٹ نمبر A/C #: 6010052701400011
IBAN#-PK34BPUN6010052701400011 بینک آف پنجاب سمن آباد میں آن لائن جمع کروا دیے ہیں

4۔ خریداری کے لیے ہمیں ای میل کریں subscription@urdudigest.pk۔ یا

5۔ سالانہ خریداری کے لیے اس نمبر پر رابطہ کریں 0333-4713631۔

تاریخ.................... دستخط....................

اُردو ڈائجسٹ۔ سرکولیشن منیجر۔ 325,G-III جوہر ٹاؤن لاہور، پاکستان
فون نمبر: +92-42-35290734-8,+92-42-35290707

250 YDS 10 MARLA	1680000	336000	17000	33000	336000
500 YDS KANAL	3200000	640000	30000	70000	640000
1000 YDS 2 KANAL	5950000	1190000	60000	117500	1190000

Authorized Dealer
CREC
City Real Estate Company

Corporate Office:
Office# 5, 3rd Floor Plot# 48-C
Lane# 13, Phase 6 Bukhari
Commercial DHA Karachi
Tel: 021-35250283-84
Cell: 0302-5559502
0322-4444326

Gwadar Office
Razzak Plaza
Airport Road Gwadar.
Cell: 0322-4444326
0302-5559502

Dubai Office
Shop# 3, Rivera Lake
View Apartment
Building# CBD 34 INT
City Dubai UAE
Tel: 00971-44542760